قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

اپریل 2026 قیمت ₹25

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

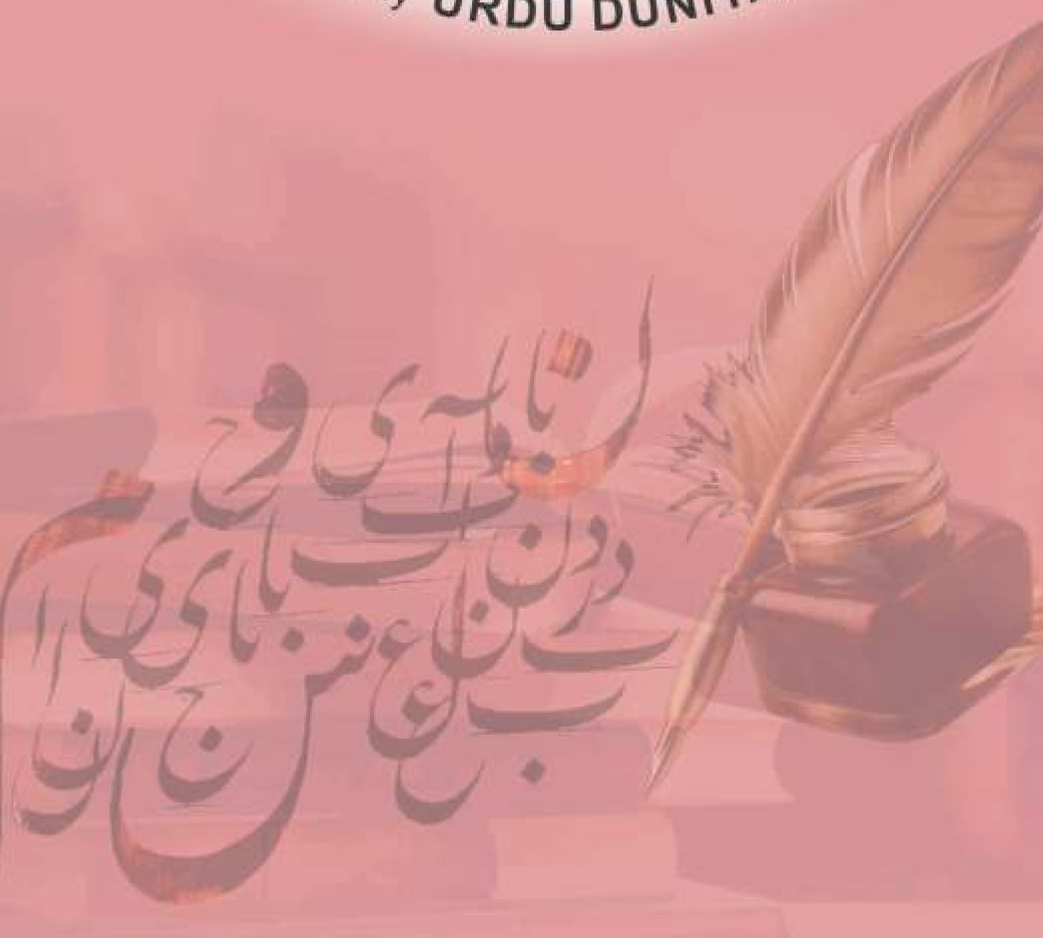

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس وٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

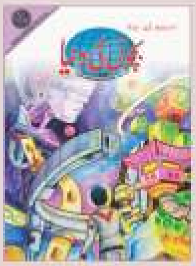

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

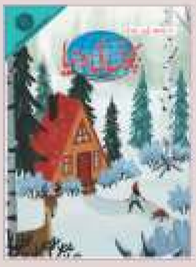

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 15 روپے   سالانہ: 145 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرتعاون سالانہ 145 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 ،A/C: IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

مشمولات

ماہنامہ
اُردو دُنیا
نئی دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:28، شمارہ:4، اپریل 2026

مدیر : ڈاکٹر شمس اقبال
مدیر منتظم: ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی
نائب مدیر : نہاں
معاون مدیر: ڈاکٹر فیضان الحق
معاونین : ڈاکٹر عبدالرشید، محمد فرقان عالم

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع : سالاسار امیجنگ سسٹمس

B-19، سیکٹر 88، نوئیڈا۔ 201305 (یوپی)

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد امتیاز حسن
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/25 روپے، سالانہ -/240 روپے

صفحات: Total Pages:100

- قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 011-35151992 | شعبہ ادارت: 011-35152009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

ای میل

editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد- 500002
فون: 040-24415194

اداریہ

- ہماری بات — مدیر — 4

خطوط

- آپ کی بات — قارئین — 5

زبان و تعلیم

- اردو زبان کا فروغ اور مصنوعی ذہانت — اختر آزاد — 7

کثیر لسانی ہندوستان

- اردو اور کنڑا کا لسانی و ثقافتی ارتباط — حلیمہ فردوس — 9
- ہندوستان میں فارسی ثقافت.... — حفصہ بیگم — 12

اقلیم سخن

- میر تقی میر کی غزل گوئی: ایک بازدید — نظام الدین احمد — 15

- نظیر اکبرآبادی کی شاعری میں متصوفانہ رجحان — نعیمہ جعفری پاشا — 18
- ظریف الطبع شاعر: طیش مارہروی — کامران مارہروی — 23
- رضا نقوی واہی: اب جا رہا ہوں... — عبدالحی — 28
- ساحر لدھیانوی کی غزل گوئی — قسیم اختر — 31
- کبیر اجمل کا شعری اظہار — فہمینہ علی — 34

خراج عقیدت

- جمال اویسی: پاسدار شعر و سخن — مشتاق احمد — 38
- جیلانی بانو: بحیثیت افسانہ نگار — فیضان الحق — 41

شخصیات

- گوپی چند نارنگ: رجحان ساز ناقد — عارف این — 47

- توفیق احمد چشتی امروہوی کی علم دوستی — سید مسعود حسن — 50
- قاسم خورشید: حیات اور ادبی کارنامے — توقیر عالم — 53

صحافت

- ملک کی تعمیر و ترقی میں اردو صحافت... — صابر رضا رہبر — 57
- ہندوستان میں اردو صحافت — محمد کیف حبیب اللہ — 60

لغت نویسی

- شریف احمد قریشی کی فرہنگ نویسی — شہپر شریف — 63

تھیٹر اور ڈراما

- پارسی تھیٹر کا ڈراما نگار: الف خاں حباب — قرۃ العین — 69

ماحولیات

- ہندوستان کی نو آبادیاتی تاریخ میں ماحولیاتی استحصال — جمیلہ خاتون — 73

جہان موسیقی

- گمنام فلمی نغمہ نگار — خلیق الزماں نصرت — 75

کتابوں کی دنیا

- تعارف و تبصرہ — ادارہ — 78

جہان آگہی

- خبرنامہ — 85

ہماری بات

معزز قارئین!

ادب کی خوبصورتی اور جاذبیت کی بے شمار وجوہات ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ادب اپنے ماحول اور گرد و پیش کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس طرح ادب محض کسی ادیب، تخلیق کار یا شاعر کے جذبات واحساسات اور مشاہدات و تجربات کا اظہار نہیں بلکہ اپنے عہد، معاشرہ اور ماحولیات کا بھی نمائندہ ہوتا ہے۔ گذشتہ چند برسوں سے ماہرین نے ادب اور ماحولیات کے متعلق باضابطہ طور پر غور و فکر کرنا شروع کیا ہے۔ حالاں کہ ادب اور ماحولیات کا رشتہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ انسان کا وجود اور زمین پر اس کی رہائش۔ کسی بھی زبان میں ادب کی نشو و نما اپنے گرد و پیش سے کٹ کر نہیں ہو سکتی۔ یہی معاملہ اردو ادب کا بھی ہے۔

اردو ادب کی تشکیل میں فطرت اور مظاہر کائنات کو اس اعتبار سے مرکزی حیثیت حاصل ہے کہ اس کے استعارات، تشبیہات، تلمیحات اور دیگر اشارے و کنایے بیشتر زمینی اور فطرتی ہیں۔ اردو ادب میں گل و بلبل، آفتاب و ماہتاب، گلی کوچہ، گلچیں و باغباں، طلوع و غروب، سحر و نسیم جیسے الفاظ کا مختلف پیرایوں میں بکثرت استعمال محض حسن بیان ہی نہیں اردو ادب کے ماحولیات سے گہرے رشتے کی ترجمانی کرتا ہے۔ اردو کے ممتاز شعرا مثلاً امیر خسرو، قلی قطب شاہ، ولی دکنی، سراج اورنگ آبادی، میر تقی میر، مرزا محمد رفیع سودا، خواجہ میر درد، شیخ ابراہیم ذوق، مرزا غالب اور داغ دہلوی سے لے کر علامہ اقبال، سرور جہان آبادی، جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، برج نرائن چکبست اور فراق گورکھپوری جیسے تمام شعرا کا لفظیاتی نظام ماحولیات سے متعلق الفاظ پر قائم ہے۔ اردو شاعری کا تقریباً نصف حصہ انھیں الفاظ کے پیرایے میں معنوی ابعاد کو روشن کرتا ہے۔ سراج اورنگ آبادی کی مشہور زمانہ غزل کا یہ شعر:

چلی سمت غیب سیں کیا ہوا کہ چمن ظہور کا جل گیا　　مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہو سو ہری رہی

لفظیات کی سطح پر فطرت کی عمدہ ترجمانی کرتا ہے۔ ہوا، چمن، شاخ، نہال کے علاوہ جلنا اور ہرا ہونا جیسے الفاظ ماحولیات سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں شعر کے دیگر مفاہیم کے ساتھ شاعر کے ذہن میں پوشیدہ اس تصور کی بھی نمائندگی ہوتی ہے کہ چمن کی خوبصورتی اشجار و نباتات کے سرسبز و شاداب رہنے میں ہے اور اس زینت کی افزائش کے لیے صاف ستھری ہوا کی بھی ضرورت ہے، جو چمن کو خوشبو سے بھر سکے۔ ماحولیات کے تناظر میں اگر اس شعر کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے مطابق خوشگوار معاشرے کے لیے ہرے بھرے درخت اور پودوں کا ہونا ضروری ہے۔ دوسرے یہ کہ صرف پودوں کا ہونا ضروری نہیں بلکہ ہوا کا صاف ہونا بھی ضروری ہے۔ ہم ماحولیاتی نقطہ نظر سے موجودہ معاشرتی بحران پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہوائی، آبی اور فضائی آلودگی کا سب سے زیادہ شکوہ کیا جاتا ہے۔ مذکورہ بالا شعر ماحولیات کے تینوں نکات کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔

یہ محض ایک معمولی سی مثال ہے۔ اردو ادب کے شعری سرمایے کے ساتھ افسانہ، ناول، ڈراما اور دیگر تحریروں میں بھی ماحولیاتی مسائل کی بھرپور نمائندگی کی گئی ہے اور اس کے تحفظ کے لیے ضروری اقدامات کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اس اعتبار سے اردو ادب نہ صرف معاملے کی سنگینی کو ظاہر کرتا ہے بلکہ اس کے حل کے لیے بھی تجاویز پیش کرتا ہے۔ اردو کے ادبا و شعرا گلوبل وارمنگ، جنگلوں کی کٹائی اور صنعتی کارخانوں سے پہنچنے والے نقصانات کو بیان کر رہے ہیں اور ناقدین نئے ماحولیاتی نظام کے تحت اس کا مطالعہ بھی کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں جدید تنقیدی اصطلاح ماحولیاتی تنقید (Eco-criticism) بھی وضع کی گئی ہے جو ادب کو ماحولیات کے تناظر میں دیکھنے اور پرکھنے پر زور دیتی ہے۔ تنقید کا یہ شعبہ انسان اور کائنات کو ایک دوسرے کی ضرورت کے طور پر پیش کرتا ہے اور انسانوں کی طرح دیگر جانداروں کے حقوق کی پاسداری کو ضروری تصور کرتا ہے۔ ملک کو تمام قسم کی آلودگیوں سے پاک کرنے کے لیے India Green, India Clean کے تحت جاری حکومت ہند کی مہم بھی قابل تعریف ہے۔ قومی اردو کونسل اپنے رسائل و جرائد کے ذریعہ اس قسم کے موضوعات کو عوام تک پہنچانے اور بیداری لانے کے لیے کوشاں ہے۔ اس شمارے میں بھی ماحولیات سے متعلق مضمون کو جگہ دی گئی ہے۔

شمس اقبال

آپ کی بات

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'آپ کی بات' کے تحت قارئین کے تاثرات شائع کرنے کا مقصد رسالے کے مشمولات کے تئیں قارئین کی آرا سے واقفیت حاصل کرنا ہے۔ رسالے کے قلم کاروں اور قارئین سے گذارش ہے کہ مشمولات کے حوالے سے اپنے تاثرات ارسال کرنے کی زحمت کریں اور نئے موضوعات، مسائل، علاقوں اور ادبی وعلمی شخصیات سے بھی مطلع فرمائیں۔ خطوط کی شکل میں موصول ہونے والے آپ کے یہ تاثرات ہمارے لیے بے حد اہم ہیں کیوں کہ ہمیں ان سے رسالے کو بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

ماہنامہ اردو دنیا کا تازہ شمارہ (مارچ 2026) نظر سے گزرا۔ معلوماتی مضامین اور اہم خبروں پر مشتمل یہ رسالہ قابل تعریف ہے۔ رسالے کے مدیر نے اپنے اداریے میں ٹیکنالوجی، ڈیجیٹل پلیٹ فارمز اور اردو کے حوالے سے جو بحث کی ہے وہ بے حد اہم ہے۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 اور ہندوستانی علاقائی زبانوں کے تعلق سے جو مضمون شائع کیا گیا ہے، اس سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ ڈیجیٹل انڈیا اور اردو ادب، شخصیات، نیا آسمان نئے ستارے، کتابوں کی دنیا اور جہان آگہی کی ذیلی سرخیوں کے ساتھ مختلف قلم کاروں کے مضامین نظر سے گزرے، جو یقینی طور پر قابل مطالعہ ہیں۔ ادب اطفال کے حوالے سے بھی اس رسالے میں خاص توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ تعلیم میں مصنوعی ذہانت کا استعمال، تعلیم اور ٹیکنالوجی، ڈیجیٹل انقلاب کے دور میں اردو، معاصر اردو غزل کی شعریات اور راقم الحروف کا مقالہ ''مثنویات میر میں مشترکہ ہندوستانی تہذیب'' کو بھی اس رسالے میں شامل کیا گیا ہے۔ میں اس کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں۔ حسین الحق کی ناول نگاری، داغ دہلوی کی شاعری میں عاشق ومعشوق کا کردار، شخصیات کے ضمن میں ٹیگور کی افسانہ نگاری، شہزادی کلثوم کی شاعری، راجہ نرسنگھ راج عالی کی غزلیہ شاعری اور شاطر گورکھپوری کی یاد میں: مضامین نظر سے گزرے۔ یہ تمام مضامین لائق مطالعہ ہیں۔ تعارف وتبصرہ کے ضمن میں 'وکست بھارت کا وژن' مرتب ڈاکٹر شمس اقبال، 'ماحولیاتی ادبی تنقید' مرتب ارتضی کریم، 'اردو فکشن تفہیم و تجزیہ' مصنف ابراہیم افسر، 'اردو فکشن تنقیدات وتفہیمات ایک جائزہ' مصنف شہاب ظفر اعظمی مرتب ڈاکٹر محمد عارف حسین، 'مثنوی درمنظوم' مصنف غلام جیلانی رفعت، 'عصمت چغتائی کا افسانوی فن' مصنف ڈاکٹر محمد دانش غنی، 'کشف شموئل' مرتب ڈاکٹر منصور خوشتر اور 'برگ نوا' شاعر سلیم ساغر جیسی اہم کتابوں پر تبصرے بھی معلوماتی ہیں۔ رسالے میں شامل تمام مشمولات قابل مطالعہ ہیں۔ قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں کے حوالے سے متعدد خبریں بھی اس رسالے میں شامل کی گئی ہیں؛ جو یقینی طور پر اردو زبان وادب کے فروغ کے حوالے سے اہمیت کی حامل ہیں۔ اس کے علاوہ 'وفیات' کے ذیل میں متعدد شخصیتوں کے انتقال کی خبر بھی شامل کی گئی ہے۔ ان میں پروفیسر محمد ذاکر، صحافی رفیق احمد، صحافی مارک ٹلی، شاعر طاہر فراز، رئیس انصاری اور میدان صحافت کے ہمارے سینئر ساتھی جناب اسد رضا کے انتقال کی خبر بھی اس میں شامل کی گئی ہے۔ اسد رضا صاحب اچھے صحافی، کالم نگار، طنزومزاح نگار اور ایک اچھے انسان تھے۔ ان کے انتقال کی خبر پڑھ کر شدید صدمہ پہنچا۔ ان کے علاوہ کرشن کمار طور اور جتندر بلو کے انتقال کی بھی خبر اس رسالے میں شامل کی گئی ہے۔ ظاہر ہے ان شخصیات کا ہمارے درمیان سے چلا جانا یقینی طور پر اردو زبان وادب کا ایک بڑا خسارہ ہے۔ میں اس اہم رسالے کی اشاعت کے لیے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر اور رسالے کے مدیر ڈاکٹر شمس اقبال اور ان کی پوری ٹیم کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

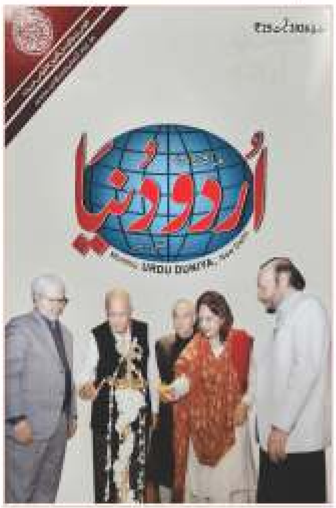

ڈاکٹر افضل مصباحی، اسسٹنٹ پروفیسر آف اردو، ایم ایم وی، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی، اترپردیش، انڈیا

اردو دنیا اردو زبان وادب کا ایک معیاری رسالہ ہے جو نہ صرف ادبی روایت کی پاسداری کرتا ہے بلکہ عصری تقاضوں کو بھی اپنے صفحات میں جگہ دے کر اردو زبان و ادب کی ترویج وترقی میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ اردو دنیا مارچ 2026 کے شمارے میں قومی تعلیمی پالیسی پر شامل مضامین قابل توجہ ہیں۔ ثوبان سعید، نوشاد حسین اور ایاز احمد کے مضامین اس موضوع کے مختلف فکری اور عملی پہلوؤں کو نہایت سنجیدہ اور بصیرت

افروز انداز میں سامنے لاتے ہیں۔ ان تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مضمون نگاروں نے ہندوستانی تعلیمی نظام کے بدلتے ہوئے ڈھانچے اور اس کے اثرات کو گہرائی کے ساتھ سمجھنے اور پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر مومن سمیہ، محمد جمشید عالم، گلاب سنگھ اور عبدالرزاق کے مضامین میں موجودہ عہد میں مصنوعی ذہانت، جدید ٹیکنالوجی اور اردو ادب میں ابھرتے ہوئے ڈیجیٹل رجحانات کے مثبت اور منفی اثرات کا متوازن جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ان تحریروں میں یہ احساس نمایاں ہے کہ ٹیکنالوجی کے تیز رفتار دور میں اردو ادب کے امکانات اور چیلنجز دونوں کو سنجیدگی سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

کلدیپ راج آنند نے ادبِ اطفال پر سوشل میڈیا کے اثرات کو نہایت دلچسپ اور تجزیاتی انداز میں بیان کیا ہے، جب کہ لیاقت علی نے معاصر غزل کی شعریات کے مختلف پہلوؤں کو واضح کر کے اس صنف کی موجودہ جہتوں کو اجاگر کیا ہے۔ افضل مصباحی کا مضمون بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جس میں انھوں نے میر کی مثنویات کے تناظر میں مشترکہ ہندوستانی تہذیب کی جھلک کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

رسالے میں شخصیات کے حوالے سے بھی اہم اور معلوماتی مضامین شامل ہیں۔ سراج انور میراں نے رابندر ناتھ ٹیگور کی افسانہ نگاری کے بعض اہم پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے، جب کہ منظور احمد گنائی نے شہزادی کلثوم کی شاعری کا تعارف پیش کیا ہے۔ پنکج کمار نے راجا نرسنگھ راج عالی کی غزلیہ شاعری کا جائزہ لیا ہے اور ارشاد احمد نے شاطر گورکھپوری کی یاد میں ایک مؤثر اور معلوماتی تحریر پیش کی ہے۔ ان مضامین میں ان شخصیات کے ادبی کارناموں کو نہایت دلنشیں انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

''نیا آسماں اور نئے ستارے'' کے عنوان کے تحت زبیدہ تسیم نے حسین الحق کی ناول نگاری کا جائزہ لیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ان کے تین اہم ناول— بولو مت چپ رہو، فُرات اور اماوس میں خواب— کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے فکری اور فنی پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔ اسی طرح طریق العابدین نے داغ دہلوی کی شاعری میں عاشق و معشوق کے کردار کے موضوع پر اچھا مضمون پیش کیا ہے، جو قاری کو داغ کی شاعری کے الگ پہلوؤں سے روشناس کراتا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اردو دنیا کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے صفحات میں نئے اور سینئر دونوں طرح کے قلم کاروں کو اظہار کا موقع فراہم کیا جاتا ہے۔ اس کے موضوعات نہ صرف ادبی روایت سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں بلکہ عصرِ حاضر کے تعلیمی اور فکری مسائل کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔ رسالے کی زبان سادہ، شگفتہ اور دلکش ہے جو عام قارئین کے لیے بھی قابلِ فہم ہے۔ امید ہے کہ یہ رسالہ آئندہ بھی اسی طرح اردو زبان و ادب کی خدمت کرتا رہے گا اور نئی فکری جہتوں کو فروغ دیتا رہے گا۔

☜ **ڈاکٹر پنکج کمار**، اسسٹنٹ پروفیسر (گیسٹ) کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی

☜ اردو دنیا مارچ 2026 کا دیدہ زیب شمارہ موصول ہوا۔ مومن سمیہ کا مضمون تعلیم میں مصنوعی ذہانت کا استعمال، اور محمد جمشید عالم کا مضمون تعلیم اور ٹیکنالوجی دونوں ہی اپنی جگہ بہتر مضمون ہیں۔ ڈیجیٹل انقلاب اور اردو۔ گلاب سنگھ، اردو ادب میں ڈیجیٹل ثقافت کی تشکیل از عبدالرزاق، اور ادب اطفال میں سوشل میڈیا کے اثرات کلدیپ راج آنند مذکورہ سبھی مضمون نگاروں کی فکر ایک ہی محور پر مرتکز ہے۔

میرا خیال ہے سب سے اہم یہ ہے کہ ہمیں اساتذہ، ٹیکنالوجسٹ، والدین، اور تعلیمی پالیسی سازوں کے درمیان مسلسل مکالمے کی ضرورت ہے، تاکہ یہ یقینی بنایا جا سکے کہ تعلیم میں مصنوعی ذہانت (اے آئی) کا انضمام ٹیکنالوجی کمپنیوں کے تجارتی مفادات کے بجائے بچوں کے بہتر مستقبل اور ان کے مفادات کی خاطر ہو۔ یہ گفتگو اس بات کے شواہد پر مبنی ہونی چاہیے کہ بچے اصل میں کیسے سیکھتے اور نشوونما پاتے ہیں، نہ کہ صرف جدید ترین ٹیکنالوجی و اختراعات کی صلاحیتوں پر منحصر ہو۔ مقصد زیادہ موثر سیکھنے کی مشینیں بنانا نہیں، بلکہ سوچنے والے، تخلیقی اور ہمدرد انسان کے ساتھ ان میں فلاح کا جذبہ پروان چڑھانا ہے۔ مصنوعی ذہانت (اے آئی) اس کوشش میں ایک طاقتور حلیف ثابت ہو سکتی ہے، لیکن یہ تبھی ممکن ہو سکتا ہے، جب ہم اس کے انضمام کو دانائی، احتیاط اور ہر بچے کی مکمل نشوونما کے لیے غیر متزلزل عزم کے ساتھ اپنائیں۔

ثوبان سعید کا مضمون قومی تعلیمی پالیسی 2020 اور ہندوستانی علاقائی زبانیں، ایاز احمد کا مضمون قومی تعلیمی پالیسی اور مادری زبان بھی آئندہ کے ترقی یافتہ ہندوستان کی حصہ داری میں نئی جنریشن کو مواقع فراہم کرنے کے مجاز میں ہیں۔ پڑھ لکھ کر ہی کوئی قوم ترقی کر سکتی ہے اور پھر یقیناً ملک ترقی یافتہ ہوگا۔ معاصر اردو غزل کی شعریات لیاقت علی کا شاندار مضمون ہے، بالخصوص دوسرے صفحے کے پہلے کالم کا تیسرا پیراگراف ''شعریات محض فنی بحث نہیں بلکہ ایک ایسا نظام ہے جو ہمیں متن کے بطن میں داخل ہونے، اس کی تہوں کو سمجھنے اور اس کے جمالیاتی فکری نظام کو دریافت کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے''۔ بہترین ہے۔ مجموعی طور پر اردو دنیا مارچ 2026 کا شمارہ قابلِ استفادہ ہے۔

☜ **ڈاکٹر حبیب سیفی**، جوش رانی، نئی دہلی

☜ اردو دنیا فروری 2026 کا تمام تحقیقی و تنقیدی مشمولات کے ساتھ نظر نواز ہوا، ماہنامہ اردو دنیا ایک علمی و ادبی رسالہ ہے۔ اس میں اردو کے نامور ادیبوں اور ماہرین تعلیم کے مضامین شامل ہوتے ہیں۔ اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے کونسل کی جدوجہد شکریہ کی مستحق ہے۔ موجودہ شمارے کے سبھی مشمولات ادبی و علمی تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ خوشونت سنگھ کے تعلق سے چار مضامین میں ان کی زندگی اور خدمات کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔ مضمون'' زبان کی تدریس میں پہیلیوں کی اہمیت امیر خسرو کے حوالے سے'' بہت دلچسپ لگا۔ ''نظم جدید میں عورت کا تصور'' میں خوب کہا ہے: اگر عورتوں کی تعلیم اور تربیت درست ہو تو پوری قوم کا اخلاق و کردار بہتر ہو سکتا ہے۔ مجیب احمد خان کا مضمون ''جوگندر پال کی افسانہ نگاری'' معلوماتی ہے۔ ان کے افسانوں میں کردار سازی کا فن دکھائی دیتا ہے۔ کردار جیتے جاگتے انسان لگتے ہیں۔ ناہید نظامی کا مضمون ''سید تقی احمد ارشاد کی شاد شناسی'' سے معلوم ہوا کہ سید تقی احمد نے مرثیے اور غزلیں بھی لکھیں ترجمے کیے اور تنقیدی مضامین بھی قلم بند کیے۔ مزمل سرکھوت کا مضمون ''اردو لغت نویسی'' تاریخی نوعیت کا ہے۔ محمد دانش غنی نے اختر راہی کے فن کو اندھیرے سے نکال کر اجالے میں لایا۔ کتابوں کی دنیا کے ذریعے نئی نئی کتابوں سے واقفیت ہوتی ہے۔ ''خبر نامہ'' ہندستان کی ادبی سرگرمیوں کا عمدہ حوالہ ہے۔

☜ ایم راگھو راو، جوسا ڈتھ سول لائن، چھندوارا، مدھیہ پردیش

اختر آزاد

اردو زبان کا فروغ اور مصنوعی ذہانت

اردو زبان ہماری تہذیبی وراثت کی امین ہے۔ اس کے اندر جو شعری لطافت، فکری شگفتگی، نثری شائستگی اور فکری وسعت ہے اس نے مجموعی طور پر ہماری اپنی علمی اور ادبی صلاحیت کو جلا بخشی ہے اور اردو کو نئے جہان معنی سے روشناس کرایا ہے۔ آج دنیا بہت تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے۔ میں نے اپنی زندگی کے ساٹھ سالہ سفر میں دنیا کو بدلتے ہوئے دیکھا ہے لیکن ادھر قریب دس پندرہ برسوں میں ڈیجیٹل ورلڈ، سائبر اسپیس اور انٹرنیٹ کی دنیا میں جو تکنیکی ترقی ہوئی ہے اس نے انسانی زندگی کے تمام شعبہ جات میں ایک انقلاب سا برپا کر دیا ہے۔ آج اسی انقلاب کا دوسرا نام مصنوعی ذہانت (Artificial Intelligence) ہے۔ جسے اردو میں مصنوعی ذہانت کہتے ہیں۔

مصنوعی ذہانت کا سب سے زیادہ فائدہ انگریزی زبان اٹھا رہی ہے۔ اس لیے اس میں تجربے بھی زیادہ ہو رہے ہیں۔ جس زبان میں زیادہ تجربے ہوں گے وہ زبان اپنی شناخت کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہے گی...... ایسے میں ہم اردو سے محبت کرنے والے چاہتے ہیں کہ اردو بھی دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے شانہ بہ شانہ چلے۔ لیکن اس کے لیے ہم اردو سے محبت کرنے والوں، اردو میں ریسرچ کرنے والوں اور اردو پڑھنے پڑھانے والوں کو نئے دور کے تقاضوں اور اس کی نئی نئی تکنیک سے ہم آہنگ ہونا ہوگا۔ کیوں کہ جدید ترقی یافتہ دور میں جدید تقاضوں سے روشناس ہونا اور مصنوعی ذہانت سے لیس ہونا آج اردو والوں کے لیے ناگزیر ہو کر رہ گیا ہے۔

مصنوعی ذہانت ہے کیا؟ دراصل یہ کمپیوٹر سائنس کی ایک شاخ ہے جس میں سافٹ ویئر کو کچھ اس طرح سے تیار کیا جاتا ہے کہ کمانڈ دیتے ہی مشین فوری طور پر ردعمل کرتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح سے انسانی دماغ سوچنے، سمجھنے، سیکھنے اور غلط صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

آج مصنوعی ذہانت کا استعمال دنیا کے تمام شعبۂ جات میں ہو رہا ہے۔ آہستہ آہستہ ہماری روز مرہ کی زندگی میں لہو کی طرح گھلتی جا رہا ہے۔ ہماری پرائیویسی میں بھی اس کا دخل ہونے لگا ہے۔ بہت سارے فوٹوز بنا کر وہ پیش کر دیتی ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ پھر موبائل آن کرتے وقت فنگر پرنٹس، ڈیوٹی جوائن کرتے وقت فیس ڈیٹیکٹر، جی پی ایس سسٹم، ڈرون یہ سب تو چند مثالیں ہیں۔

AI کی مدد سے تعلیم و تحقیق، مواصلات اور تخلیق کے میدان میں بھی لوگوں نے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ یہاں میں اردو زبان کے فروغ میں مصنوعی ذہانت کے امکانات و خدشات کو اردو نواز دوستوں کے روبرو رکھنا چاہوں گا۔

ہم سب آج کمپیوٹر سے زیادہ موبائل سے جڑے ہوئے ہیں۔ موبائل میں بھی بہت سارے فیچرز اور ایپ ایسے ہیں جس کے ذریعہ ہم اے۔ آئی (AI) کا براہ راست استعمال کر سکتے ہیں۔ جن میں جی پی ٹی چیٹ، پرپلیکسیٹی Perplexity، soft، Gemini، grok، co-pilot وغیرہ اہم ہیں۔ یہاں سے ہم اپنی ضروریات اور شوق کی بہت ساری چیزیں حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ سرچ انجن نہ ہوتے ہوئے بھی انٹرنیٹ پر جو لنکس موجود ہیں اس کو سامنے رکھ دیتی ہے۔ بہت سارے مواد فراہم کر دیتی ہے۔ یعنی انفارمیشن کی ایک ایسی دنیا آپ کے سامنے سکنڈ بھر میں لا دیتی ہے، جسے حاصل کرنے کے لئے پہلے کتابوں کے پنّے الٹنے پڑتے تھے، لائبریری میں گھنٹوں سر کھپانا پڑتا تھا، پھر بھی ضروری نہیں کہ آپ اس صفحہ تک پہنچ ہی جائیں جسے آپ تلاش کرنا چاہتے ہیں۔

میں کمپیوٹر یا مصنوعی ذہانت کا کوئی بڑا جانکار نہیں ہوں۔ لیکن اس کے باوجود میں نے خود کو امتحان گاہ میں لا کھڑا کیا ہے۔ بہت سارے لوگ مجھ سے بہتر کمپیوٹر جانتے ہوں گے اور اے آئی (AI) کا استعمال بھی اپنی روز مرہ کی زندگی میں کرتے ہوں گے۔ لیکن ان باتوں سے قطع نظر قریب ۳۵ ربرس سے کمپیوٹر میرے تخلیقی سفر کا حصہ رہا ہے۔ ان برسوں میں، میں نے خاص طور پر اردو ان پیج سے دوستی کی ہے۔ یہاں میں اردو ان پیج، جمیل نوری نستعلیق، نوری نستعلیق۔ اردو کنورٹر، اردو ٹرانسلیٹر، اردو او سی آر کے متعلق کچھ ویسی باتیں بھی کروں گا جس کا تعلق مصنوعی ذہانت سے ہے۔

لیکن اس پر گفتگو سے پہلے چیٹ بوٹس کے متعلق کچھ باتیں۔

یہ کمپیوٹر کا ایسا پروگرام ہے جو انسان کے ساتھ مکالمہ کرتا ہے۔ سوال کا جواب دیتا ہے۔ بہت ساری جانکاریاں فراہم کرتا ہے۔ ہدایت دینے کے ساتھ ساتھ کئی اہم کام کو بحسن و خوبی انجام تک پہنچاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہاں Alexa اور Siri کا نام لیا جا سکتا ہے۔

بینکنگ چیٹ بوٹس، تعلیمی چیٹ بوٹس، طبی چیٹ بوٹس بھی ہماری زندگی کو آسان بناتے ہیں۔

بات زبان شناس سافٹ ویئر کی جسے انگریزی میں Natural language processing software کہتے ہیں۔ یہ وہ ٹکنالوجی ہے جو انسانی زبان کو پہچاننے، سمجھنے، ترجمہ کرنے اور تجزیہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کے تحت کچھ ایپس کا استعمال ہم کرتے ہیں۔

جیسے Spell Checker یہ سافٹ ویئر غلط املا اور ہجے کی درستگی کرتا ہے۔ Grammer Checker یہ سافٹ ویئر جملوں کی ساخت کو درست کرتا ہے۔ Machine Translation یہ سافٹ ویئر ایک زبان سے دوسری زبان میں مشینی ترجمہ کرنے میں مہارت رکھتا ہے۔ زیادہ تر لوگ گوگل ٹرانسلیٹر کا استعمال کرتے ہیں۔ Speech Recognition یہ ایک ایسا سافٹ ویئر ہے جو آواز کو متن میں بدلنے کا کام بحسن و خوبی کرتا ہے۔ Text to Speech یہ سافٹ ویئر متن کو آواز میں بدل دیتا ہے۔

زبان کے تعلق سے جن سافٹ ویئر کا ابھی میں نے ذکر کیا ہے ان کے ذریعہ لسانی تحقیق میں مدد ملتی ہے۔ محقق کے لیے یہ سارے سافٹ ویئر کارآمد ہیں۔ اردو لغت، قواعد، محاورات کو تلاش کرنے، تجزیہ کرنے اور مضمون میں کس فنکاری سے اس کا استعمال کرنا ہے وہ اس میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن ہمارے کچھ تخلیق کار نظم و نثر میں اے آئی (AI) کا کھلے عام استعمال کر رہے ہیں۔ ویسی تخلیقات سے آج نیٹ کی دنیا بھری پڑی ہے۔ نئے تخلیق کار دس بیس ردیف قافیہ دے کر بڑی آسانی سے انٹرنیٹ شاعر بن رہے ہیں۔ ایسا کچھ افسانہ نگار، مضمون نگار، مقالہ نگار بھی کر رہے ہیں جو مناسب نہیں ہے۔ ایسا کرنے سے تخلیقی ذہانت، مصنوعی ذہانت کے آگے ہمیشہ کے لیے سر بہ سجود ہو جائے گی۔ تخلیقی سوتے سوکھ جائیں گے اور ہم صرف مشین ہو کر رہ جائیں گے۔

Urdu Digitalisation یہ پرانی کتابوں، دستاویزات اور مخطوطات وغیرہ کو خود اسکین کرتا ہے اور اسے او سی آر Optical Character Recognition کے ذریعہ پڑھنے کے قابل بناتا ہے۔ اس ڈیجیٹل متن کو ہم ترمیم کر سکتے ہیں۔ یعنی ایڈٹ کر کے کہیں بھی پیسٹ کر سکتے ہیں۔ اردو میں تصویری متن، پی ڈی ایف وغیرہ کو اسکین کر کے اس اسکین شدہ تصویر کو ۳۰۰ پکسل میں تبدیل کر کے آن لائن Urdu nastaliq OCR میں اپ لوڈ کر کے اسے اردو یونیکوڈ میں بدل سکتے ہیں۔ اسے ان پیج میں پیسٹ نہیں کیا جا سکتا۔ اسے صرف ورڈ فائل میں پیسٹ کر سکتے ہیں۔ اس اردو یونی کوڈ کو آپ چاہیں تو جمیل نوری نستعلیق میں بدل سکتے ہیں۔ یہ دونوں دراصل ایک ہی ہیں۔ لیکن جمیل نوری نستعلیق دیکھنے میں نوری نستعلیق فونٹ جیسا دکھائی دیتا ہے۔ اگر ہم اردو یونی کوڈ کو نوری نستعلیق میں بدل کر ان پیج میں بدلنا چاہیں تو اس کے لیے Urdu Unicode to Noori Nastaliq Converter کا استعمال کرنا ہوگا۔ اور پھر کہیں جا کر آپ اس نوری نستعلیق فونٹ کو ان پیج میں پیسٹ کر سکتے ہیں اور یہاں اپنی مرضی سے کٹ پیسٹ بھی کر سکتے ہیں۔

اردو سیکھنے والوں کے لیے بہت سارے پروگرام جن میں اردو ورچوئل لیکچرز اور رای لرنگ پروگرام اور اردو کی ڈیجیٹل لائبریریاں اے آئی کی مدد سے آپ سرچ کر سکتے ہیں۔ این سی پی یو ایل نے بھی بہت سارے پروگرام چلا رکھے ہیں۔ جن سے ہم فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں آرٹیفیشیل انٹیلیجنس انسانی زندگی کے لیے بے حد کارآمد ہے۔ لیکن جہاں تک زبان کی بات ہے تو ڈھیروں امکانات کے ساتھ یہ خدشات بھی ہیں کہ کہیں جو آسانیاں مصنوعی ذہانت فراہم کر رہی ہے اس کے جال میں ہم پھنس تو نہیں رہے ہیں۔ کیوں کہ جب کوئی چیز آسانی سے ملنے لگتی ہے تو ہم انسانوں کی فطرت میں تساہل پسندی سما جاتی ہے۔ محنت سے ہم بھاگنے لگتے ہیں۔ پھر ایسا ہونا ممکنات میں شامل ہے کہ ہم کلاسوں سے، کتابوں سے، لائبریریوں سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مصنوعی ذہانت کے ذریعہ جب پکے پکائے مواد کو انٹرنیٹ کے دسترخوان پر پروس کر طالب علموں اور ریسرچ اسکالرز کے سامنے رکھ دیا جائے گا تو پھر غیر معیاری ریسرچ پیپر کی وجہ سے تعلیمی اداروں، ٹیچروں اور پروفیسروں کا امیج دھندلکے میں گم ہو جائے گا۔ پھر ریسرچ پیپر بھی ایک جیسے لکھے جانے لگیں گے۔ سب کے سب AI کی پیداوار ہوں گے۔ اور AI وہی سامنے لا کر رکھے گا جو نیٹ پر موجود ہے۔ یا پھر اسے اپنی زبان میں لکھے گا بھی تو وہ انسانی ذہن سے بالاتر نہیں ہوسکتا، کیوں کہ مشین انسان کی پیداوار ہے اور انسانی تخلیل کی پرواز مشین کی پرواز سے بہت آگے ہے۔

ہم سب مصنوعی ذہانت کا اتنا ہی استعمال کریں جتنی جانکاری کے لیے چاہیے۔ کاپی، کٹ پیسٹ کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ورنہ کچھ ایسے ایسے سافٹ ویئر ہیں جو Plagiarism کو پکڑتا ہے۔ جن میں qutex ،turnitin ،plagiarism checker X، Grammarly Plagiarism,plagscan, checker اہم ہیں جو دوسری زبانوں کے ساتھ اردو کی چوری بھی ڈیٹیکٹ کرتا ہے۔ اس سافٹ ویئر میں ریسرچ پیپر کو اپ لوڈ کر دینے کے بعد یہ بتا دیتا ہے کہ اس مضمون میں کہاں کہاں سے اور کتنی فیصد چوری کی ہے۔ زیادہ سے زیادہ اے آئی کی مدد سے آپ سات آٹھ فیصد تک استفادہ کر سکتے ہیں۔ ہو بہو نقل سے پرہیز کریں۔ مسلسل سات آٹھ الفاظ اگر آپ کے ایک جملہ میں مل جاتے ہیں تو سافٹ ویئر اسے پکڑ لیتا ہے اور اسے سرقہ یا توارد کے زمرے میں ڈال دیتا ہے۔ اس سے آپ کو نقصان بھی ہوسکتا ہے۔ جس رسالے کو آپ نے اشاعت کے لئے بھیجا ہے اگر وہ مضمون کو ایسے سافٹ ویئر کی مدد سے چیک کرتا ہے تو آپ کا مضمون کبھی شائع نہیں ہوگا اور اگر شائع ہو گیا اور کسی کی نظر پڑ گئی تو عزت تو جائے گی ہی، اس پر کیس بھی ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں میرا یہ مشورہ ہے کہ پوری دنیا استفادہ کر رہی ہے آپ بھی کریں لیکن plagiarism کے جو اصول ہیں اس کا خیال رکھیں اور خود پر آنچ آنے نہ دیں۔

آنے والے دنوں میں مصنوعی ذہانت کا استعمال اور بڑھے گا اور ہمیں بھی اس کے بڑھتے قدم کے ساتھ قدم ملا کر چلنا ہوگا نہیں تو اردو والے جدید طریقہ تعلیم اور ریسرچ کے میدان میں دوسروں سے پیچھے رہ جائیں گے۔

■

Dr. Akhtar Azad
Assistant Professor,Dept of urdu,TNB
College, Bhagalpur-812007 (Bihar)
Mob.:9572683122
Email: dr.akhtarazad@gmail.com

اردو اور کنڑا کا لسانی و ثقافتی ارتباط

حلیمہ فردوس

عالمی سطح پر ہمارے ملک کی شناخت کثیر لسانی اور کثیر ثقافتی مزاج کے طور پر قائم ہے۔ یہاں سینکڑوں بولیاں اور زبانیں رائج ہیں۔ کسی مستشرق نے ''ہندوستان کو بولیوں کا عجائب گھر'' قرار دیا ہے۔ اس عجائب گھر کی شان قدیم و جدید زبانوں کے رنگ و بو سے برقرار ہے۔ ہم پر اپنے ملک کی ہر زبان کا احترام لازم ہے کیونکہ زبان ذریعہ اظہار ہی نہیں تہذیب اور ثقافت کا آئینہ بھی ہوتی ہے۔ اردو ہندستان میں پیدا ہوئی، صوفیوں کی گود میں پرورش پائی۔ بازاروں، میلوں، ٹھیلوں کی سیر کرتی رہی۔ آخرکار دربار میں اس کی رسائی ہوئی۔ وہاں جلوے لٹاتی رہی وہ وقت بھی آیا جب انگریز حکمران اس کا ہاتھ تھامنے پر مجبور ہو گئے۔ ان غاصبوں کی نیت بھانپ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ان حاکموں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ''انقلاب زندہ باد'' کا نعرہ لگایا بہت سے جانبازوں کو سولی پر چڑھایا گیا، آخرکار ہتھکڑیاں ٹوٹیں اور انگریزوں کو الٹے پاؤں لوٹنا پڑا۔ آج صدیوں کا سفر طے کر کے سارے عالم میں یہ خوشبو کی طرح پھیل گئی ہے۔

اردو وہ نوخیز ہند آریائی زبان ہے جس نے عربی اور فارسی کے علاوہ ہندوستانی کلاسیکی زبانوں کے سرمائے کو اپنی زنبیل میں محفوظ کیا اور اپنے لسانی ورثے سے ان زبانوں کے ذخیرے میں اضافہ کیا۔ اردو کا تعلق جہاں اپنے قبیلے کی زبان پنجابی، سندھی، گجراتی اور مراٹھی سے ہے وہیں تیلگو، کنڑا اور تامل جیسی دراوڑی زبانوں سے بھی اس کا رشتہ استوار رہا ہے۔ اس میں قوس قزحی رنگوں کے ہلکے اور گہرے سارے شیڈس ملتے ہیں۔

اردو اور کنڑا کے لسانی رشتے کی حقیقت جاننے کے لیے دکنی زبان کے وجود اور مزاج کو سمجھنا ہوگا۔ خطہ دکن میں دکنی کو ایک بولی نہیں بلکہ باضابطہ زبان کی حیثیت حاصل تھی۔ علاء الدین خلجی کی دکن آمد ہو یا تغلق کا جنوبی قدم، جنوبی ہند میں اس نئی زبان کے پھلنے پھولنے کا ذریعہ بنے۔ ان حکمرانوں سے قبل عرب تاجروں اور صوفیائے کرام کے میل جول سے اجنبی زبان کے نقش ابھر چکے تھے۔ دکنی یعنی ابتدائی اردو کے نثری اور شعری ادب میں نہ صرف دیگر کلاسیکی زبانوں کے تراجم ملتے ہیں بلکہ اس ادبی سرمایہ کے ذریعے دینی و دنیاوی موضوعات کے علاوہ سلاطین کی فتوحات اور درباری قوانین اور تہذیب و ثقافت سے آگہی ہوتی ہے۔ آج بھی بیشتر ہندوستانی زبانوں میں اردو زبان کی قانونی اور انتظامی اصطلاحات مستعمل ہیں۔

اردو اور کنڑا کے لسانی رشتے کی حقیقت جاننے کے لیے دکنی زبان کے وجود اور مزاج کو سمجھنا ہوگا۔ خطہ دکن میں دکنی کو ایک بولی نہیں بلکہ باضابطہ زبان کی حیثیت حاصل تھی۔ علاء الدین خلجی کی دکن آمد ہو یا تغلق کا جنوبی قدم، جنوبی ہند میں اس نئی زبان کے پھلنے پھولنے کا ذریعہ بنے۔

کنڑا زبان کی دو ہزار سالہ قدیم تاریخ ہے۔ اس کا شمار ہندوستان کی کلاسیکی زبانوں میں ہوتا ہے۔ آزادی کے بعد لسانی بنیادوں پر کی گئی ریاستوں کی تشکیل سے ریاست میسور میں سابق ریاست حیدرآباد اور ممبئی کے بعض اضلاع شامل کیے گئے۔ کنڑا اس ریاست کی صوبائی زبان قرار دی گئی۔ پچھلی مردم شماری رپورٹ کے مطابق ریاست کرناٹک میں کنڑا زبان استعمال کرنے والوں کی تعداد 43.7 ملین ہے جبکہ اردو بولنے والی آبادی 6.6 ملین ہے اور اسے لسانی درجہ بندی میں دوسرا مقام حاصل ہے۔ ریاست میسور میں ابتدا ہی سے قدیم کنڑا زبان رائج تھی۔ صدیوں کے طویل سفر کے بعد کنڑا زبان میں تبدیلی کا آنا فطری امر تھا۔ بعد ازاں قدیم کنڑا تاریخ کا حصہ بن گئی اور جدید کنڑا کا سفر جاری رہا۔ ریاست میسور میں راجا وڈیار کے دور حکومت میں کنڑا زبان کی حیرت انگیز ترقی ہوئی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دکن میں پانچ نئی سلطنتوں کے وجود میں آنے سے دکنی زبان کو فروغ حاصل ہوا۔ بیجاپور میں دکنی اور کنڑا دونوں زبانوں کو عادل شاہی سلاطین کی سرپرستی حاصل رہی۔ اس حکومت کے زوال کے بعد اہل

بیجاپور نے دور دراز شہروں جیسے چن پٹن، سرا اور ارکاٹ کا رخ کیا۔ نواب حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے قلیل مدت میں دکنی زبان کی ترقی و ترویج میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کے بعد وڈیار خاندان کی سرپرستی حاصل رہی۔ غرض اردو میں شامل عربی، فارسی اور ہندی الفاظ کنڑا زبان کا حصہ بن گئے اور اہل کنڑا نے اسے بخوشی قبول کیا۔

عموماً اردو اور ہندوستانی زبانوں کے اشتراک کے ذکر پر قانونی اور انتظامی اصطلاحات کا حوالہ دیا جاتا ہے مگر اردو اور کنڑا کے رابطے کے دیگر حوالے بھی ہیں۔ جن کا ذکر آگے آئے گا۔ ہند آریائی زبان پنجابی میں مقدمہ، جاگیر، پیشی، سرکار، وکیل، عرضی، فرمان، حوالات، حُکم جیسے الفاظ شامل ہیں۔ جبکہ دراوڑی زبان کنڑا میں لسانی قاعدے کے مطابق یہ الفاظ من وعن یا تبدیل شدہ شکل میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان اسما کے آخر میں مصوتے ''اُ'' کا اضافہ لازمی ہے۔ جیسے عدالتُو، وَکیلُو، گلامُو، دَربارُو، جاگیرُو، جامِیئُو وغیرہ۔

کنڑا میں اردو کے مستعمل عربی، فارسی اور ہندی الفاظ کی نوعیت کچھ اس طرح ہے۔

1 خالص دخیل الفاظ (تَتسم) موجودہ دور میں سرکاری احکامات میں اردو کے بے شمار الفاظ مروج ہیں۔
تتبھو کی شکلیں:

2 الفاظ کے آخر میں مصوتوں کا استعمال (ا۔و۔ی۔ے) کے علاوہ حروف کی مشدد ادائیگی۔

3 دراوڑی زبانوں میں ذ، ز، ض، خ، ف، ق کی مفقود آوازوں کی جگہ متبادل صوتی حروف کا استعمال۔

4 الفاظ میں مطلوبہ حروف کے بجائے متبادل صوت کا استعمال۔

5 لاحقوں اور سابقوں کے جوڑ سے صفت یا فاعل بنانا۔

مثالیں ملاحظہ ہوں:

1 خالص دخیل الفاظ: ماموُلی (معمولی) رُجو (رُجوع) جاری (جاری) سرکاری (سرکاری) جما (جمع) دَفا (دفع) نوکر (نوکر) دوات (دوات) تبلا (طبلہ)

2 مصوتوں کی مدد سے بنائے گئے الفاظ:

ا (رواجا بمعنی رواج) (دِنا۔ دن) (ویاپارا۔ بیوپار) (بیجا۔ بیج)

ی (راتری۔ رات) (جاستی۔ زیادہ) (رعایتی۔ رعایت) (تربیتی۔ تربیت)

ے (کھجانے۔ خزانہ) (چرچے۔ چرچا) (گنٹے۔ گھنٹہ) (تماشے۔ تماشا) (رستے۔ راستہ) (صُلحے۔ صلح)

اُو (جوابُو۔ جواب) (نصیبُو۔ نصیب) (سوالُو۔ سوال) (سفارشُو۔ سفارش)

مشدد (ثابتُو۔ ثابت) (سرحَدُّو۔ سرحد) (ردُّو۔ رد) (اَمانتُو۔ امانت)

3 ہم آواز حروف ذ، ز، ض کو ج اور خ، غ، ق کو گ یا کھ سے ادا کرنے کا طریقۂ کار۔
(ماجی۔ ماضی) (کاگدا۔ کاغذ) (کائم۔ قائم) (بے جارُو۔ بیزار) (تاجا۔ تازہ)

4 الفاظ میں مطلوبہ حروف کے بجائے متبادل صوت کا استعمال۔
(کُرچی۔کرسی) (رشیدی۔ رسید) (جمے واری۔ ذمہ داری) (تاکیتُ۔ تاکید)
مذکورہ بالا مثالوں سے الفاظ کی صوتی تبدیلی کا علم ہوتا ہے۔

5 کنڑا زبان میں فارسی لاحقوں کے جوڑ سے فاعل اور صفات بنانے کا چلن عام ہے۔
فارسی لاحقے ''دار'' بشکل ''دارا'' اور 'گار' بشکل 'گارا' مروج ہیں۔ جیسے (ہکُو دارا۔ حق دار) (جمین دارا۔ زمین دار) (صُلحے گارا۔ صلاح کار) (ہاسیا گارا۔ مسخرہ) وغیرہ۔

بعض تراکیب میں کنڑا اور اردو الفاظ کا مضبوط جوڑ ملتا ہے۔ جیسے ماجی + منتریا بمعنی سابق وزیر۔ شکشنا + الاکھے بمعنی محکمۂ تعلیمات۔ جاتی + پترا، ذات کا تصدیق نامہ وغیرہ۔ البتہ کنڑا زبان میں سابقوں کا استعمال نہ کے برابر ہے۔ عربی کلمۂ نفی ''لا'' اور فارسی کلمۂ نفی ''بے'' کے جوڑ سے بننے والی مخصوص تراکیب روزمرّہ میں کثرت سے استعمال ہوتی ہیں۔ نا+پتے بمعنی لا پتہ۔ نا+لائیکو، نالائق۔ بے + جوابداری بمعنی غیر ذمہ دار۔ بے+وارثی (لاوارث) وغیرہ۔

قدیم میسور علاقے میں دونوں زبانوں میں یہ لفظ بطور تحقیر زبان زد خاص وعام ہے۔ باتونی یا چُلبلی لڑکی کے لیے بجاری بمعنی بازاری، چالاک اور شریر لڑکے کے لیے کِلاڑی (کھلاڑی) لفظ عام طور پر دوران گفتگو ادا کیے جاتے ہیں جو اپنے سیاق وسباق میں مخصوص معنی دیتے ہیں۔ لفظ جکاتی، زکوٰۃ سے مشتق ہے جو قدیم زمانے میں محصول کے معنی میں برتا جاتا تھا۔ رَجا۔ رضا یہ لفظ آج بھی سرکاری سطح پر تعطیل کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

ان کے علاوہ آرام، زبردست، سَکت جیسے الفاظ بے دریغ بولے جاتے ہیں۔ کنڑیگا خیریت دریافت کرنے کے لیے ایک جملے کے بجائے صرف ایک لفظ ''آرام'' سے اپنا مدعا ادا کرتے ہیں۔ بس اس لفظ کے آخری حرف ''م'' کو م+ ا = ما، میں تبدیل کر کے ''آراما'' کا استفہامیہ لہجہ ''کیا خیریت ہے؟'' کا متبادل بن جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اشتہارات میں بھی اس لفظ کا چلن ہے۔ ٹوتھ پیسٹ کے اشتہار کے لیے اس سے موزوں لفظ شاید کنڑا میں نہیں ہے۔ یہ چند جملے دیکھیں:

سینسوڈائن (Sensodyne) اُپیوگیسی تکشنا آرام پڈیِرِی۔ (سینسوڈائن استعمال کریں فوراً آرام پائیں۔)
بُمرا سَکَت بُولنگ مَاڈِیدارے۔ (بُمرا نے خوب بولنگ کی۔)

کنڑا فرہنگ میں بے شمار اردو الفاظ کے علاوہ ہم معنی کہاوتیں بھی شامل ہیں۔ جیسے

1 مَنَسُّو ویدے رے مَارگا۔
جہاں چاہ وہاں راہ۔

2 تماتائی نُما وتے ہُلی ہُولیتے۔
کتا بھی اپنی گلی میں شیر ہوتا ہے۔

3 مَدْ وِے ماڈِی نُوڑی۔ مَنے گِی نُوڈی۔
شادی کرکے دیکھو۔ گھر تعمیر کرکے دیکھو۔

4 اَڑلی دیڈ رے اَمَنّو بالُو کو ڈُو دِلاّ۔
روئے بغیر ماں بھی دودھ نہیں دیتی۔

پیش کردہ جائزے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ اردو نے کنڑا زبان پر جس قدر گہرا اثر ڈالا ہے اس کے مقابلے میں اردو پر کنڑا کے اثرات واجبی سے ہیں۔ کنڑا زبان کا اثر خصوصاً دکنی روزمرہ پر نظر آتا ہے۔ ہر دس کوس پر پانی اور بانی بدل جاتی ہے۔ زبانوں میں بھی تبدیلی لازمی ہے۔ اردو زبان جب ملک کے مختلف علاقوں میں پھیلتی گئی تب اُس پر مقامی اثرات کا رنگ چڑھنے لگا، اہل اردو کے آداب گفتگو ہی نہیں ان کے رکھ رکھاؤ اور کھان پان کے انداز بدلتے رہے۔ شمالی ہند کے اہل زبان کا فقرہ ''جی ہاں'' جنوبی ہند میں ''جی ہو'' ''وَجِیے'' اور ''ہو'' کی شکل اختیار کر گیا۔ اس پس منظر میں بلا تامل یہ کہا جاسکتا ہے کہ جنوبی ہند کی ریاست کرناٹک میں کنڑا زبان نے روزمرہ کی زندگی کو جس قدر متاثر کیا لسانی اور ادبی سطح پر اس کا اثر آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہے۔ زبانوں میں ارتباط کا عمل کبھی ماحول کے تقاضے کے تحت شعوری طور پر تو کبھی باہمی میل جول کے تحت غیر شعوری طور پر رونما ہوتا ہے۔ عادل شاہی حکومت اور سلطنت خداداد کی سرپرستی میں دکنی زبان کی ادبی حیثیت باقی تو تھی مگر ان ادبی تحریروں میں کنڑ کے بجائے سنسکرت اور برج بھاشا کا ہی غلبہ رہا۔ دو چار صدیوں بعد دکنی زبان، اردو کے روپ میں جلوہ گر ہونے کے باوجود ریاست کے کئی علاقوں میں کنڑا آمیز اردو زبان عوام میں رائج رہی۔ البتہ لب ولہجہ پر سرحدی اور علاقائی اثرات کا نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ قدیم میسور کے کئی علاقوں، ممبئی، کرناٹک اور حیدرآباد کے اطراف میں اہل اردو کا نہ صرف لب ولہجہ بلکہ الفاظ کا استعمال بھی کافی مختلف ہے۔ جیسے اشیائے خوردنی اور اشیائے صَرف کے لیے مختلف کنڑا الفاظ مروج ہیں۔

قدیم ریاست میسور کے علاقے کے مروجہ الفاظ:

اشیائے خوردنی: گنجی (کھاری سیال شئے) وَنْجُو (حلوے کی پوری) چِوچو بھات (نمکین اور شیریں سوجی کی ڈش) چِترَ نا (لیمو کا بھات) پنڈو (ٹماٹر) ہَن نِیرُو (ناریل پانی)

اشیائے صرف: مُوٹے (تھیلا) کپاٹو (الماری)

دو چار صدیوں بعد دکنی زبان، اردو کے روپ میں جلوہ گر ہونے کے باوجود ریاست کے کئی علاقوں میں کنڑا آمیز اردو زبان عوام میں رائج رہی۔ البتہ لب و لہجہ پر سرحدی اور علاقائی اثرات کا نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ قدیم میسور کے کئی علاقوں، ممبئی، کرناٹک اور حیدرآباد کے اطراف میں اہل اردو کا نہ صرف لب ولہجہ بلکہ الفاظ کا استعمال بھی کافی مختلف ہے۔ جیسے اشیائے خوردنی اور اشیائے صَرف کے لیے مختلف کنڑا الفاظ مروج ہیں۔

جھلڑی (چھانی) وَلٹرا (بچوں کو دودھ پلانے کا پیالا)۔

روزمرہ الفاظ: شِکّے بمعنی گرمی، کنتری بمعنی مکار، پُڑی بمعنی سفوف، سُومبیری بمعنی کاہل، چیٹّی (چٹھی)۔ یجمان بمعنی مالک، یجمانی (مالکن)

حیدرآباد کرناٹک اور ممبئی کرناٹک علاقوں میں مروجہ الفاظ:

اشیائے خوردنی: انبیل (کھاری سیال شئے) جُوالا رُوٹی (جوار کی روٹی) وَنجُو (حلوے کی پوری) چگرو بمعنی چگر (املی کے انکور سے بنائی جانے والی سبزی) مُنگارُو جُوالا (موسم باراں کی جواری) شینگا (مونگ پھلی) ہُلڑا (جواری کا بھنا ہوا بھٹا) چیرو ونڈی (مستعمل چیر ونڈی بمعنی چیبنا)

اشیائے صرف: ہلوی (دودھ پلانے کا پیالا)، گُمّی (جس میں اناج ذخیرہ کیا جاتا ہے) تھلوی (برتن) چھنی (چھانی) پلی (پیروں میں پہننے والی چاندی کی انگوٹھی) لاڑی (ازار بند)

روزمرہ: مہاڑی بمعنی اوپری منزل، چَوڑی بمعنی چاوڑی، کچہری، باوڑی، مستعمل بَولی، بمعنی کنواں، کھانا ولی مستعمل کھانا واڑی بمعنی ڈھابہ، گدّل بمعنی شور شرابہ، لنچا بمعنی رشوت، بنڈی بمعنی بیل گاڑی، بڈّی بمعنی سود، پٹا بمعنی سندِ جائیداد، ساؤ کارا، ساؤ کارا بمعنی ساہوکار مالک، ساؤ کارتی مالکن۔

اکیسویں صدی تک آتے آتے شہروں اور قصبوں کے طور طریقوں میں بہت کم فرق باقی رہ گیا ہے۔ دیگر ریاستوں کی طرح ریاستِ کرناٹک میں بھی علاقائی تہذیبی رنگ قائم ہے۔ آج بھی قصبات کے کنڑا ماحول میں ادا کیا جانے والا فقرہ ''ہوگو بَرتینی'' بمعنی ''جا کر آتا ہوں'' اہل اردو بھی استعمال کرتے ہیں۔

پان لکھنوی اور حیدرآبادی تہذیب کی شان ہے۔ قدیم میسور علاقوں میں مہمانوں کی خدمت میں پان کی گلوریاں پیش نہیں کی جاتیں بلکہ یہاں کی مقامی تہذیب کی پیروی میں چھوٹی سی کشتی میں پان، چھالیہ اور چونے کی ڈبی رکھی جاتی ہے۔ آج پاندان، خاص دان، اُگال دان خود عجائب گھروں کا سامان بن گئے ہیں۔ ایک مشہور جملہ ہے ''نام میں کیا رکھا ہے'' نام ہی نہیں سر نیم (Sir Name) یعنی خاندانی نام بھی علاقے کی شناخت ہوتے ہیں۔ نام بہت اہم ہوتے ہیں۔ ممبئی کرناٹک اور حیدرآباد کرناٹک میں حسب و نسب، پیشے یا علاقے سے منسوب عجیب وغریب اڈے ناما بمعنی اڑے ناموں کا رواج عام ہے۔ جیسے میلے مَنے، بمعنی اوپر گھر والے۔ دوڈّ مَنے بمعنی بڑے گھر والے۔ رنگارے بمعنی رنگ ریز، پٹوے گر بمعنی ریشم کا کام کرنے والے، تامٹ گر، تامٹ بمعنی تانبے کے برتن بنانے والے یا ٹھٹھیرا، بھنڈاری بمعنی خزانچی کے علاوہ ہرپن ہلی، پٹن کٹی، شیر ہٹی، کلادگی وغیرہ علاقوں سے منسوب نام ہیں۔ کیا شمال وجنوب، کیا مشرق ومغرب ہمارے ملک میں بولی جانے والی بیشتر ہندستانی زبانوں نے ایک دوسرے کا اثر قبول کیا ہے۔ ان ہندوستانی زبانوں کی چندری دلکش رنگوں سے بنی ہوئی ہے۔ ان کی بہار، رنگت سے نہیں، ان کے مضبوط تانے بانے سے قائم ہے۔ کسی دھاگے کو اُدھیڑنا آسان نہیں ہے اس عمل سے یہ چندری بے نور ہو جائے گی۔

■

Dr. Haleema Firdaus
414-A1 Ganga Block,
National Games Village
Koramangla, Bangalore-47
Mob.:9448787013
E-mail: haleema.firdous@gmail.com

حفصہ بیگم

ہندوستان میں فارسی ثقافت کی ترویج واشاعت میں صوفیانہ روایت کا کردار

اسلامی روایات وتعلیمات سے جنم لینے والی اصطلاحات میں سے ایک تصوف بھی ہے۔ یہ ایک اعتدال پسند، اصلاحی اور روحانی تحریک ہے جو محض مذہبی ریاضت تک محدود نہیں بلکہ ایک ہمہ جہت تہذیب واخلاق کا نمونہ بھی ہے۔ اس کی فکری بنیادیں ایران اور وسطی ایشیا میں استوار ہوئیں۔ گیارہویں صدی تک اس کی جڑیں برصغیر کی فکری اور سماجی اساس میں رچ بس گئیں۔ صوفیا کرام نے اسے اپنے مخصوص روحانی مزاج اور اخلاقی بصیرت کے ذریعے دولت کی نمود ونمائش، مذہبی شدت پسندی اور اخلاقی زوال کے برخلاف ایک خاموش مگر ہمہ گیر مزاحمت، انسانی وقار، باطنی پاکیزگی اور اخلاقی اعتدال کا مرکز بنایا۔

صوفی روایت کی اصل قوت اس کی فکری وسعت اور روحانی جامعیت میں مضمر تھی۔ ان کی تعلیمات اور شاعری نے نہ صرف روحانیت بلکہ ادب، جمالیات اور ثقافتی اظہار کے مختلف سانچوں کو نئی معنویت عطا کی۔ محبت، رحمت اور شفقت عامہ کو انھوں نے اپنی فکر کا بنیادی ستون قرار دیا اور اسے انھوں نے مذہبی وتہذیبی سرحدوں سے ماورا ہوکر انسان دوستی اور ہمہ گیر رواداری کے ایسے تصورات کو فروغ دینے کا آلہ کار بنایا جس نے برصغیر کے اجتماعی شعور کی تشکیل میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ صوفیا نے ہند آریائی فلسفے اور اسلامی روحانیت کے درمیان حائل فکری فاصلے کو نہ صرف پاٹنے کا کام کیا بلکہ اسے ایک تخلیقی مکالمے میں تبدیل کر دیا۔ انھوں نے ہندو اور بدھ مت کی بعض فکری جہات کو اپنے روحانی بیانیے میں جذب کیا اور مختلف مذہبی وفلسفیانہ روایتوں کے مابین مشترک انسانی اقدار کو دریافت کرنے کی سنجیدہ کوشش کی۔ اس فکری ہم آہنگی سے جہاں مذہبی مکالمے کو وسعت ملی وہیں برصغیر میں ایک ایسے مخلوط تہذیبی شعور کا جنم ہوا جو اختلاف کے باوجود بقائے باہم پر یقین رکھتا ہے۔

برصغیر میں پروان چڑھنے والی قومی یکجہتی، سماجی ہم آہنگی اور تہذیبی امتزاج کو اس وقت تک مکمل طور پر نہیں سمجھا جا سکتا جب تک کہ یہاں کی صوفی روایت کے فکری واخلاقی اثرات کا ادراک نہ کیا جائے۔ جہاں سیاسی حکمرانوں نے اقتدار کے دوام اور ریاستی استحکام کے لیے مختلف راستے اختیار کیے، وہیں صوفیا کرام نے سماج کے باطن کو بدلنے کا بیڑا اٹھایا۔ ان کا راستہ محبت، رواداری اور اخلاقی تطہیر کا راستہ تھا— ایسا راستہ جس نے مختلف مذہبی اور ثقافتی نظاموں کے درمیان ایک بامعنی ربط قائم کیا اور برصغیر کی تہذیبی شناخت کو ایک ہمہ گیر انسانی آہنگ عطا کیا۔

صوفی شعرا اور ادبا کی فارسی تخلیقات نے برصغیر کے ادبی افق پر نہایت گہرے اور دیرپا اثرات مرتب کیے۔ انھوں نے اپنے باطنی واردات، روحانی مشاہدات اور فلسفیانہ افکار کو علامتوں، استعارات اور لطیف تشبیہات کے پیکر میں ڈھال کر اس طرح پیش کیا، اس سے صوفی ادب کو نہ صرف فکری گہرائی بلکہ جمالیاتی رفعت بھی حاصل ہوئی۔ ہند–ایرانی تہذیب کے ارتقا اور صوفی موسیقی کی روایت کی تشکیل میں ان روحانی اہل قلم اور اہل دل کا کردار بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے موسیقی کو محض تفریح نہیں بلکہ روحانی وابستگی اور معبود حقیقی سے قرب کے ایک موثر وسیلے کے طور پر متعارف کرایا، اور یہی وجہ ہے کہ صوفیانہ نغمگی اور شعری آہنگ ہندوستانی ثقافت کے مستقل اور زندہ اجزا میں شمار ہونے لگے۔

صوفیا کرام نے سماجی انصاف، خیرات اور انسان دوستی کو اپنی عملی زندگی کا مرکزی اصول بنایا۔ انھوں نے محروم، مفلس اور مظلوم طبقات کی سرپرستی کی اور ضرورت مندوں کی اعانت کے لیے یتیم خانے، شفاخانے اور پناہ گاہیں قائم کر کے ایک فلاحی روایت کی بنیاد ڈالی۔ ان کی تعلیمات، تخلیقی اظہار اور انسانی خدمت کے پیغام نے معاشرے پر ایسے دیرپا نقوش چھوڑے جن کے نتیجے میں روحانیت، ادبی شائستگی، موسیقی، فن تعمیر اور رفاہ عامہ کی ایک ہم آہنگ اور بامعنی روایت وجود میں آئی، جو پورے ہندوستان کے تہذیبی تانے بانے کو مضبوط اور مربوط کرتی ہے۔

صوفی علما، جنھیں اولیا اور درویش کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے، نے اسلام کے پیغام کو عام کرنے اور روحانی مراکز قائم کرنے کے ساتھ ساتھ مقامی رسوم، فکری روایتوں اور زبانوں کو بھی اپنی دعوت اور عملی زندگی میں جذب کیا۔ انھوں نے ہندو اور بدھ مت کے بعض تصورات، یوگا، موسیقی اور شاعری کے عناصر کو اپنے فکری نظام میں اس طرح ضم کیا کہ اسلامی تصوف اور ہندوستانی روحانیت کا ایک نادر اور بامعنی امتزاج سامنے آیا۔ یہی تہذیبی ہم آمیزی آگے چل کر ہند–اسلامی ثقافت کی تشکیل وترقی کا ایک بنیادی محرک ثابت ہوئی۔ صوفی سنتوں اور ان کے متبعین نے خانقاہوں اور مزارات کی ایسی ہمہ جہت روایت قائم کی جو محض عبادت گاہیں نہیں بلکہ روحانی تربیت، اجتماعی بہبود، علمی مکالمے اور سماجی خدمت کے موثر مراکز کی حیثیت اختیار کر گئیں۔ صوفیا کی خانقاہیں بالخصوص بزرگوں کے مزارات اس کا مرکز ومحور بنے، جہاں روحانی برکت، اخلاقی رہنمائی اور باطنی تسکین کے متلاشی افراد جوق در جوق حاضر ہوتے۔ یہ مقامات رفتہ رفتہ خطے کی تہذیبی شناخت اور فن تعمیر کے نمایاں ستونوں میں تبدیل ہو گئے۔

قرون وسطی کے ہندوستان میں صوفیا نے موسیقی اور شاعری کو محض جمالیاتی اظہار کے بجائے روحانی

جذب وحال اور وابستگی معبود کے ایک طاقتور وسیلے کے طور پر بروئے کار لایا۔ قوالی جیسے صوفیانہ گیتوں کے ذریعے قلب و روح کی تطہیر اور وجدانی کیفیت کی آبیاری ہوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ صوفی معاشرے نے سماجی خدمت کی ایک مضبوط روایت قائم کی — جس کے تحت لنگر اور دھرم شالاؤں کے ذریعے غریبوں، مسافروں اور ضرورت مندوں کو غذا، پناہ اور امداد فراہم کی جاتی تھی، پھر بعد میں تصوف عبادت سے بڑھ کر خدمت خلق کی عملی صورت اختیار کرتا چلا گیا۔

ہندوستان کی سرزمین کا یہ اختصاص رہا ہے کہ اس نے ایسے بے شمار اولیائے کرام کو جنم دیا جنھوں نے پیاسے دلوں اور مضطرب روحوں کو سکونِ جاوداں عطا کیا — اور جن کے فضائل و کرامات کو سمیٹنا ریت کو مٹھی میں بند کرنے کے مترادف ہے — ہم یہاں صرف چند ایسے اور نمایاں صوفی شخصیات کی جانب اشارہ کریں گے جنھوں نے فارسی زبان اور تہذیب کے فروغ میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اس سلسلے میں سب سے درخشاں نام پیرانِ پیر حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ کا ہے، جن کی شہرہ آفاق تصنیف کشف المحجوب کو تصوف کی دنیا میں ایک مرجع کی حیثیت حاصل ہے۔ ان کی روحانی وجاہت اور صوفیانہ مرجعیت نے فارسی کی تہذیبی شناخت پر گہرا اور دیرپا اثر مرتب کیا، اور ان کی تحریروں نے صوفی تعلیمات اور تصوف کے دقیق تصورات کی بدولت ہندوستان اور باہر بھی ایک وسیع فکری حلقے کو متاثر کیا۔

کشف المحجوب کو ہندوستان میں تصوف پر لکھی جانے والی پہلی باقاعدہ تصنیف کا اعزاز حاصل ہے بلاشبہ یہ فارسی زبان میں روحانیت اور صوفی فکر کی قدیم ترین اور سب سے اثر انگیز کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس میں صوفی عقائد کی گوناگوں جہات، روحانی سلوک کے مدارج اور باطنی ارتقا کے مراحل کو نہایت جامع انداز میں بیان کیا گیا ہے، اس نے صوفی ادب کی تشکیل اور تصوف کے فکری ڈھانچے کو ایک مضبوط بنیاد فراہم کی بلکہ اس کے ذریعے فارسی زبان کو روحانی اور ادبی اظہار کا ایک وقیع وسیلہ میسر آیا۔ اسی طرح اس کے بعد داتا گنج بخش کی تعلیمات نے فارسی داں معاشروں میں تصوف کے اصولوں کو راسخ کرنے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ اس کتاب سے صوفی اداروں کی فکری آبیاری ہوئی اور اس سے فارسی بولنے والی دنیا میں صوفی روایت کے فروغ اور استحکام کا ایک سنگِ میل بھی ثابت ہوئی۔

خواجہ معین الدین چشتی — جنھیں عقیدتاً خواجہ غریب نواز کہا جاتا ہے — فارسی صوفی روایت کی وہ درخشاں ہستی ہیں جنھوں نے برصغیر میں فارسی ادب و تہذیب کو نئی معنویت عطا کی۔ ان کی روحانی قیادت، چشتی سلسلے کی فکری بنیاد اور اخلاقی بصیرت نے فارسی ادبی روایت، تہذیبی اقدار اور روحانی طرزِ حیات پر گہرے اور دیرپا نقوش ثبت کیے۔ فارسی ادب و ثقافت کے دائرے میں ان کی خدمات غیر معمولی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی فارسی شاعری، ثقافتی ہم آمیزی پر اصرار، فارسی زبان کی سرپرستی اور صوفی مراکز کا قیام ہند-فارسی تہذیبی امتزاج کی تشکیل میں فیصلہ کن ثابت ہوا۔ ان کی تعلیمات آج بھی روحانی متلاشیوں کے لیے رہنمائی کا سرچشمہ ہیں اور ہندوستان کے ثقافتی ورثے کی وسعت و تنوع میں مسلسل اضافہ کر رہی ہیں۔ ان سے منسوب یا ان کی روایت میں محفوظ چند معروف تصانیف میں دیوانِ معین الدین چشتی، انیس الارواح، گنج اسرار، دلیل العارفین، رسالہ وجودیہ اور کلمات خواجہ معین الدین چشتی شامل ہیں۔

اسی طرح قطب الدین بختیار کاکی قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان میں فارسی صوفیانہ ادب کے ایک نہایت وقیع نمائندہ کے طور پر جلوہ گر ہوتے ہیں۔ وہ نہ صرف ایک بلند پایہ صوفی تھے بلکہ فارسی شاعری کے بھی صاحب اسلوب تخلیق کار بھی تھے۔ ان کی تعلیمات، روحانی اثرات اور اہل علم کی سرپرستی نے فارسی ادب و ثقافت اور صوفی فکر کے ارتقا پر گہرے نقوش چھوڑے۔ انھوں نے فارسی زبان میں ایسی نظمیں تخلیق کیں جن میں ان کے باطنی تجربات، عشقِ الٰہی اور روحانی ادراک پوری شدت کے ساتھ منعکس ہوتا ہے۔ اسلوب کی سادگی، جذبات کی گہرائی، محبت ربانی اور وجدانی کیفیات ان کی شاعری کی امتیازی خصوصیات ہیں، اور یہی عناصر ہندستان میں فارسی صوفیانہ شاعری کی نشوونما میں ان کے اثر کو مستحکم کرتے ہیں۔ ان سے منسوب دو اہم تصانیف — دیوان اور فوائد السالکین — تصوف کے فکری اور عملی مباحث میں ان کے مقام کو مزید واضح کرتی ہیں۔

بابا فرید، جنھیں فرید الدین گنج شکر کے نام سے شہرت حاصل ہوئی، تصوف اور شاعری کی اس درخشاں روایت کے نمائندہ تھے۔ انھوں نے اپنی تعلیمات کی بدولت برصغیر کے روحانی اور ادبی افق کو نئی جہتیں عطا کیں۔ وہ پنجابی اور صوفی شاعری کی تشکیل و ارتقا میں سب سے زیادہ موثر اور ہمہ گیر شخصیات میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی ادبی میراث بنیادی طور پر صوفیانہ نظموں پر مشتمل ہے۔ باطنی مشاہدات، روحانی تعلیمات اور وجدانی بصیرت نہایت ہی گہرائی سے ان کی شاعری میں منعکس ہوتی ہے۔ ان کے متعدد اقوال سکھوں کی مقدس کتاب گرو گرنتھ صاحب میں شامل ہیں، جو ان کی فکر کی ہمہ گیر قبولیت اور بین المذاہب معنویت کا واضح ثبوت ہیں۔ بابا فرید کی شاعری اپنی سادگی، روحانی گہرائی اور انسانی دل سے براہِ راست مکالمے کی صلاحیت کے باعث ممتاز مقام رکھتی ہے، اور اس نے مذہبی و ثقافتی سرحدوں سے ماورا ہو کر ہندوستان کے روحانی و ادبی ورثے پر ایک مستقل اور گہرا نقش ثبت کیا ہے۔ فوائد السالکین، گنج اسرار، جوگی نامہ، تحفۃ الرسالہ (یا نصائح الملوک)، رسالہ وجودیہ، اسرار الاولیا، راحت القلوب، رسالہ عرفانی (یا گفتار عرفانی) اور سراج الوجودان کی اہم تصانیف ہیں — یہ ان کے فکری و روحانی مقام کی وسعت کو نمایاں کرتی ہیں، جب کہ پنجابی اور اردو میں ان سے منسوب اشعار اس روایت کو مزید تقویت بخشتے ہیں۔

اسی طرح حضرت نظام الدین اولیا — جنھیں عقیدتاً محبوب الٰہی کہا جاتا ہے — قرونِ وسطیٰ کے ہندستان میں فارسی صوفیانہ ادب اور تہذیب کے ایک مرکزی ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی تعلیمات، شعری تخلیقات اور روحانی اثرات نے فارسی ادب و ثقافت اور صوفی فکر کی تشکیل میں نہایت گہرے اور دیرپا اثرات مرتب کیے۔ انھوں نے غزلوں، نظموں اور دیگر شعری اصناف میں اپنے باطنی تجربات، عشقِ الٰہی اور روحانی بصیرت کو جس شدت اور لطافت کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ انھیں ہندوستانی فارسی صوفی ادب کا ایک ناگزیر حوالہ بنا دیا۔ ان کی شاعری جذبات کی گہرائی، روحانی تڑپ اور آفاقی محبت کے عناصر سے مملو ہے، اور اسی لیے وہ برصغیر کی صوفیانہ روایت میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔

حضرت نظام الدین اولیا نے اپنے کارناموں کی

بدولت فارسی اور ہندوستانی تہذیب کے مابین ایک تخلیقی اور بامعنی پل کا کام کیا۔ انھوں نے فارسی تصوف کے اصولوں کو مقامی ثقافتی روایتوں کے ساتھ ہم آہنگ کر کے سماجی رواداری اور بین الثقافتی مفاہمت کو فروغ دیا۔ ان کی مذہبی مجالس اور تعلیمی نشستیں فارسی زبان میں منعقد ہوتی تھیں، جن سے ہندوستان میں فارسی زبان وادب کے تحفظ اور اشاعت میں نمایاں مدد ملی۔ ان کی روحانی محافل میں موسیقی کو بھی ایک خاص مقام حاصل تھا۔ اس سے بھی فارسی اور ہندوستانی موسیقی کے عناصر باہم مدغم ہو کر ایک منفرد ہند۔فارسی موسیقی روایت کا جنم ہوا۔ اس روایت کا روحانی اثر لسانی اور ثقافتی سرحدوں سے کہیں آگے تک پھیل گیا، اوران کی تعلیمات وخدمات نے مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو یکساں طور پر اپنی جانب متوجہ کیا۔ ان سے منسوب اہم تصانیف میں سیر الاولیا، فوائدالفواد، فصل الفواد اور راحت المحبین، ان کی فکری اور روحانی میراث کو محفوظ رکھنے کا مستند ذریعہ ہیں۔

امیر خسرو اپنے عہد کے ان درخشاں فارسی شعرا میں سے ایک ہیں جن کی تخلیقی وسعت اور فنی مہارت نے فارسی ادب کو نئی رفعتیں عطا کیں۔ انھوں نے غزل، مثنوی اور نظم جیسی مختلف اصناف میں ایسی تخلیقات پیش کیں جو نہ صرف ان کے غیر معمولی لسانی ذوق اور فکری بالیدگی کی آئینہ دار ہیں بلکہ فارسی شاعری کے فنی امکانات کو بھی نئی جہات عطا کرتی ہیں۔ ان کی شاعری میں محبت، روحانیت، تصوف اور عہد حاضر کے سماجی تناظر کی بازگشت پوری معنویت کے ساتھ سنائی دیتی ہے۔ امیر خسرو کی ادبی کاوشوں نے فارسی ادب کے ارتقا میں فیصلہ کن کردار ادا کیا، اور ان کا منفرد اسلوب اور زبان کے تخلیقی استعمال نے بعد کے شعرا وادبا کے لیے ایک زندہ روایت قائم کی جو آج تک تخلیقی تحریک کا سرچشمہ ہے۔

ادب کے ساتھ ساتھ امیر خسرو موسیقی کے بھی بلند پایہ ماہر تھے۔ انھوں نے فارسی اور ہندوستانی موسیقی کے عناصر کو ایک ہم آہنگ اور تخلیقی وحدت میں سمو کر ہندوستانی راگوں کو فارسی شعری سانچوں میں ڈھالا۔ صوفیانہ مذہبی موسیقی کی صنف قوالی کی تشکیل کا سہرا انھی کے سر جاتا ہے۔ وہ شاعری، راگ اور صوفیانہ مضامین ملا کر روحانی تجربے کا جمالیاتی تصور پیش کرتے ہیں۔ زبان کے میدان میں بھی امیر خسرو ایک جدت پسند معلم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے فارسی الفاظ و محاورات کی توسیع وارتقا میں بنیادی کردار ادا کیا۔ نئے نئے الفاظ، اصطلاحات اور استعارات متعارف کرا کر انھوں نے فارسی اظہار کی سرحدوں کو وسعت دی اور آنے والی نسلوں کے شعرا وادبا کے لیے لسانی امکانات کے نئے در وا کیے۔ ان کی تصانیف کی فہرست ان کی ہمہ جہت تخلیقی قوت کی شاہد ہے۔ ان کے معروف فارسی کارناموں میں تحفۃ الصغر، وسط الحیات، غرۃ الکمال، بقیہ نقیہ، نہایت الکمال، ہشت بہشت، قران السعدین، مطلع الانوار، مفتاح الفتوح، مثنوی دولت رانی۔ خضر خان، نہ سپہر، تغلق نامہ، خمسہ، اعجاز خسروی، خزائن الفتوح، افضل الفوائد، خالق باری، لیلیٰ مجنوں، آئینہ سکندری اور شیریں خسرو شامل ہیں۔ ان کی ایسی تخلیقات جنھوں نے فارسی ادب، ہند۔فارسی تہذیب اور صوفیانہ روایت کو ایک ہمہ گیر اور پائیدار فکری ورثہ عطا کیا۔

خواجہ بندہ نواز گیسو دراز فارسی زبان وادب کے ان ممتاز صوفی شعرا میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے جنوبی ہند میں اسلام اور فارسی تہذیب کی جڑیں نہایت گہرائی سے پیوست کیں۔ انھوں نے غزل، رباعی اور نثر کے ساتھ ساتھ شعری وادبی اصناف کے ہر دائرے میں ایسی گراں قدر تخلیقات پیش کیں جن میں روحانی واردات، عشقِ الٰہی اور وحدتِ وجود کی بازگشت پوری شدت سے سنائی دیتی ہے۔ ہندستان میں فارسی زبان کے تحفظ اور فروغ میں ان کا کردار بنیادی نوعیت رکھتا ہے۔ ان کی مجالس، تدریسی نشستیں اور روحانی اجتماعات فارسی ہی میں منعقد ہوتے تھے، جس کے باعث اس زبان کو برصغیر میں ایک مستحکم علمی اور روحانی مقام حاصل ہوا۔ انھوں نے فارسی اور ہندوستانی ثقافتی روایتوں کے مابین ایک بامعنی مکالمہ قائم کیا، اور مقامی رسوم وروایات کو صوفیانہ فکر کے ساتھ ہم آہنگ کر کے ایک منفرد ہند۔فارسی تہذیبی شناخت کی تشکیل میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ ان کی شاعری میں روحانی پیاس، جذبات کی گہرائی، عشقِ ربانی اور بین المذاہب ہم آہنگی جیسے موضوعات جس شدت اور لطافت سے جلوہ گر ہوتے ہیں، وہ ہندوستان میں فارسی صوفیانہ شاعری کی ترقی میں ان کے اثر کو نمایاں کرتے ہیں۔ ان سے منسوب اہم تصانیف میں حواشی کشاف، شرح مشارق، شرح فقہ الاکبر، شرح آداب المریدین، شرح تعارف، رسالہ سیرت النبی، ترجمہ مشارق، شرح فصوص الحکم، ترجمہ رسالہ قشیریہ، جوامع الکلم اور قصیدہ امالی شامل ہیں۔

اسی طرح شہزادہ دارا شکوہ سترہویں صدی کے مغل عہد کا وہ نادر المثال عالم اور صوفی مزاج شہزادہ تھے جن کی فکری شخصیت فنون لطیفہ، روحانیت اور بین الثقافتی مکالمے کا حسین امتزاج تھی۔ تصوف اور ہندو فلسفے میں اس کی غیر معمولی دلچسپی نے اسے اپنے عہد کا ایک منفرد مفکر بنا دیا۔ ان کی تصانیف اور فکری کاوشیں مشترکہ تہذیب اور گنگا۔جمنی ثقافت کی روشن علامت ہیں۔ وہ مذہبی اور تہذیبی سرحدوں سے بالاتر ہو کر انسانیت کی وحدت کا علم بردار تھے اور علم وعرفان کے ایک بحر بے کراں کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے نمایاں صوفیانہ وفلسفیانہ کاوشوں میں سفینۃ الاولیا، سکینۃ الاولیا، رسالہ حق نما، مجمع البحرین اور سر اکبر شامل ہیں۔ یہ ان کی ایسی تصانیف ہیں جنھوں نے اسلامی تصوف اور ہندو فلسفے کے درمیان ایک فکری پل قائم کیا۔

یہ امر نہایت افسوس ناک ہے کہ دارا شکوہ کی زندگی ایک الم ناک انجام سے دوچار ہوئی۔ ان کے اپنے بھائی اورنگزیب سے شکست کے بعد 1659 میں اسے قتل کر دیا گیا۔ تاہم اس کی ناگہانی موت کے باوجود اس کا علمی اور روحانی ورثہ آج بھی زندہ ہے اور ان کی فکری گہرائی اور عرفانی بصیرت اب بھی اہل علم و دل کی تحسین کا مرکز بنی ہوئی ہے۔

غرض یہ کہ اگرچہ حکمرانوں نے بسا اوقات مذہبی احکام کی تعبیر اپنے سیاسی مقاصد کے تحت کی، مگر صوفیا کرام نے اسلام کے اس روشن اور انسان دوست چہرے کو نمایاں کیا جو محبت، رحمت اور اخلاقی وقار پر مبنی ہے۔ انھوں نے تمام مذاہب اور عقائد کا احترام کیا اور انسان کو محض اس کی شناخت کے بجائے خالق کائنات کا بندہ سمجھا۔ ان کے نزدیک اصل اصول یہ تھا کہ خالق سے محبت کا حقیقی اظہار اس کی مخلوق سے محبت میں ہے — کیونکہ خود خالق بھی اپنی مخلوق سے محبت کرتا ہے۔ اسی فکری زاویے نے سماج میں رواداری، ہم آہنگی اور انسان دوستی کو فروغ دیا اور ساتھ ہی فارسی تہذیب اور ثقافتی روایت کو بھی ایک نئی وسعت واستحکام عطا کیا۔

■

Dr. Hafsa Begum
Assistant professor
Deptt. of PG Studies & Research in Urdu
Kuvempu university shivamoggam, Karnataka
Mob.:7022501540
E-mail: hafsabaig2708@gmail.com

نظام الدین احمد

میر تقی میر کی غزل گوئی

ایک بازدید

اردو

غزل کی کائنات میں میر تقی میر کی حیثیت اس آفتاب کی سی ہے، جس کی روشنی نے نہ صرف اپنے عہد کو منور کیا بلکہ آنے والی صدیوں کے چراغوں کو بھی لو بخشی۔ جب ہم ان کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں، تو فن کی وہ رفعت اور فکر کی وہ گہرائی ہمیں اپنی گرفت میں لے لیتی ہے جس کی نظیر پوری اردو شاعری میں مفقود ہے۔ میر محض ایک شاعر نہیں بلکہ ایک ایسی آواز ہیں جنھوں نے اپنے ذاتی صدموں کو انسانیت کا مشترکہ ورثہ بنا دیا۔ انھوں نے اپنے دور کے اجڑتے ہوئے سماجی ڈھانچے اور بکھرتی ہوئی تہذیبی اقدار کو اپنی آنکھوں سے خون بن کر ٹپکتے دیکھا۔ میر کے یہاں انسانی وجود کے ابدی سوالات اور ذات کے مخفی گوشے کچھ اس طرح نمایاں ہوتے ہیں کہ قاری کو اپنا ہی عکس ان کے لفظوں میں جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ان کی شخصیت اور ان کا فن ایک ایسی اکائی ہیں جنھیں جدا کرنا گویا روح کو جسم سے الگ کرنے کے مترادف ہے۔ میر کی غزلوں کی سب سے بڑی خصوصیت اعجازِ سادگی ہے۔ انھوں نے زندگی کے کٹھن ترین حقائق اور نفسیاتی گتھیوں کو اس روانی اور صداقت سے بیان کیا ہے کہ ہر قاری ان سے ایک انوکھا قلبی لگاؤ محسوس کرتا ہے۔ چھوٹی بحروں میں معانی کی کائنات سمیٹنے کا جو ہنر میر کو نصیب ہوا، وہ کسی اور کے حصے میں نہ آسکا۔ ان کا کلام تکلف کی مصنوعی سجاوٹ سے پاک ہے، مگر اس کی سادگی میں وہ پرکاری ہے جو براہِ راست روح کے تاروں کو چھیڑ دیتی ہے۔

میر محض ایک نام نہیں، بلکہ اردو غزل کی اس تہذیبی روایت کا نام ہے جس نے اپنی ذات کے کرب کو کائنات کا دکھ بنا دیا۔ وہ ایک ایسی ہمالیائی شخصیت تھے جن کے قلم نے نہ صرف اپنے عہد کے اجڑتے ہوئے سماج اور بکھرتی ہوئی اقدار کا نوحہ لکھا، بلکہ انسانی وجود کے ان ابدی اسرار کو بھی چھیڑا جو روح کو تڑپا دینے کی قوت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری محض لفظوں کا جڑاو نہیں، بلکہ ایک رقت آمیز داستان ہے؛ ایک ایسی داستان جو صدیوں کا سفر طے کرنے کے بعد بھی آج کے انسان کے دل کی دھڑکن معلوم ہوتی ہے۔ میر کی ذات اور ان کا فن ایک دوسرے میں اس طرح رچے بسے ہیں جیسے پھول میں خوشبو اور آنکھ میں روشنی۔ ان کے اشعار ان کی زندگی کا آئینہ ہیں اور ان کی زندگی ان کے اشعار کی تفسیر ہے۔ میر کے فن کا جادو ان کی سحر انگیز سادگی میں چھپا ہے۔ انھوں نے زندگی کے گنجلک فلسفوں کو 'سہلِ ممتنع' کے ایسے پیرائے میں بیان کیا ہے کہ بات سیدھی دل میں اتر جاتی ہے۔ چھوٹی بحروں میں معانی کا جہانِ نو آباد کرنا میر ہی کا خاصہ ہے۔ ان کا کلام بناوٹی سجاوٹ اور لفاظی کے بوجھ سے آزاد ہے اس میں وہ بے پناہ خلوص اور جذبۂ صداقت ہے جو قاری کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیتی ہے۔

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

اس شعر میں محبوب کی آنکھوں کی جادوئی کشش کو چند لفظوں میں سمیٹ دیا گیا ہے، لیکن اس کی گہرائی قاری کو ایک عالم خیال میں لے جاتی ہے۔

اسی طرح، ان کا ایک اور شعر ملاحظہ کریں:

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

یہ شعر سادگی کا شاہکار ہے، جو ایک نازک احساس کو گلاب کی پنکھڑی سے تشبیہ دے کر قاری کے دل میں اتر جاتا ہے۔ میر کی شاعری کی یہ خوبی کہ وہ معنی کھلنے سے پہلے اثر چھوڑتی ہے، انھیں ایک منفرد مقام عطا کرتی ہے۔

میر کا شعری اعجاز یہ ہے کہ ان کے یہاں لفظ صرف معانی کا لباس نہیں بنتے، بلکہ ایک کیفیت بن کر قاری کے وجود میں سرایت کر جاتے ہیں۔ ان کی شاعری کی یہ بوقلمونی دیدنی ہے کہ معنی کی پرتیں کھلنے سے پہلے ہی ان کے لہجے کا سوزِ دل کی دھڑکنوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ ان کے اشعار قاری کو پہلے اپنی سحر انگیز لے میں جکڑتے ہیں اور پھر ان کی فکر کی گہرائی انسانی شعور کو بصیرت کے نئے چراغ عطا کرتی ہے۔ وہ ایک ایسی جادوئی فضا تخلیق کرتے ہیں جہاں سادگی خود حسن بن کر جلوہ گر ہوتی ہے۔

میر کی زندگی مسلسل غموں، مصیبتوں اور سخت حالات سے بھری ہوئی تھی۔ انھوں نے دہلی کی تباہی اور بربادی کا مشاہدہ کیا جب نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے خونی حملوں نے ایک بستی کو نہیں، بلکہ ایک پوری تہذیب کو خاک میں ملا دیا تھا۔ صدیوں پر محیط علمی و ادبی اقدار دم توڑ رہی تھی اور معاشرت کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ ان ہولناک حالات نے میر کی حساس طبیعت پر وہ گہرے زخم لگائے جو عمر بھر ان کے کلام سے خون بن کر ٹپکتے رہے۔ ان کی شاعری محض دہلی کا مرثیہ نہیں، بلکہ ان تمام تلخ حقائق کی فلسفیانہ دستاویز ہے جنھوں نے انسانی وقار کو مجروح کیا۔ میر کی عظمت یہ ہے کہ وہ ان آلام کے سامنے محض ماتم کناں نہیں رہے، بلکہ انھوں نے اپنے شخصی اور اجتماعی درد کو فن کے اس سانچے میں ڈھالا کہ وہ آفاقی سچائی بن گیا۔ انھوں نے ثابت کیا کہ سچا فنکار وہی ہے جو اپنے آنسوؤں سے کائنات کے زخم دھو ڈالے۔

میر تقی میر کی غزلوں میں انفرادی حزن اور اجتماعی شعور کا ایک ایسا حیرت انگیز امتزاج ملتا ہے جہاں ذات کا دکھ اور عہد کا المیہ باہم شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے محض اپنے زخموں کی نمائش نہیں کی، بلکہ گرد و پیش کے آشوب کو اپنی روح میں جذب کرتے

ہوئے اسے فن کے لطیف قالب میں ڈھال کر انسانیت کو ایک آفاقی ورثے کے طور پر لوٹایا ہے۔ ان کے یہاں 'غم' محض ایک کیفیت نہیں، بلکہ ایک ایسی بھٹی ہے جس میں تپ کر انسانی شعور کندن بن جاتا ہے۔ اسی فکری پختگی کی ایک تابندہ مثال ان کا یہ لافانی شعر ہے:

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

یہ شعر بظاہر زندگی کی بے ثباتی اور جہانِ فانی کی رنگینیوں کے مٹ جانے کا نوحہ محسوس ہوتا ہے، مگر اس کے باطن میں ایک طاقتور رجائیت (Optimism) پوشیدہ ہے۔ میر نے یہاں محض فنا کا ذکر نہیں کیا ہے، بلکہ انسان کو اس کی 'عظمتِ کردار' کا احساس دلایا ہے۔ اور یہ پیغام دیا ہے کہ زندگی کی مختصر مہلت میں غم اور خوشی تو آنی جانی کیفیات ہیں، اصل کمال یہ ہے کہ انسان اپنے عمل اور نقوشِ پا سے زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہو کر امر ہو جائے۔ میر کا غم ہمیں قنوطیت یا مایوسی کے اندھیروں میں نہیں دھکیلتا، بلکہ وہ ہمیں حوادثِ زمانہ سے نبرد آزما ہونے اور زندگی کے ریگزاروں میں معنی تلاش کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ انھوں نے غموں سے ہار ماننے کے بجائے انھیں اپنی پہچان اور بقا کا وسیلہ بنانے کا ہنر سکھایا ہے۔

میر تقی میر کی شاعری کو محض عشق و محبت کے روایتی قصوں یا محض جذباتی کیفیات تک محدود سمجھنا ان کے فن کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ درحقیقت، ان کا کلام حکمت و دانائی کے ان انمول موتیوں سے لبریز ہے جو انسانی زندگی کے ہر پہلو کو محیط ہیں۔ انھوں نے غزل کے پردے میں اخلاقیات کا وہ درس دیا ہے جو کسی بھی دور کے انسان کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہو سکتا ہے۔ میر کے یہاں انسانیت، مساوات اور عدل و انصاف کی باتیں محض الفاظ کا گورکھ دھندا نہیں، بلکہ ان کے نظریہ حیات کا اساسی ستون ہیں۔ ان کا فکری کینوس ہر قسم کے تعصب، نفرت اور گروہی تقسیم سے پاک ہے۔ انھوں نے انسان کو رنگ، نسل اور عقیدے کی عینک سے نہیں دیکھا، بلکہ اسے کائنات کی ایک عالمگیر اور معتبر قدر کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ ان کے نزدیک عظمتِ انسانیت سب سے مقدم ہے۔ ان کی شاعری میں موجود حکیمانہ نکات ہمیں یہ سکھاتے ہیں کہ زندگی کے تلخ ترین حالات میں بھی اپنے اخلاقی وقار کو کیسے برقرار رکھا جائے۔ وہ ایک ایسے صوفی منش شاعر ہیں جن کے یہاں 'انسان' اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود کائنات کا مرکز و محور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میر کا کلام صرف ایک عہد کی آواز نہیں، بلکہ رہتی دنیا تک انسانی ضمیر کی پکار بن گیا ہے بطور مثال چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

جو ہے سو میر اس کو میرا خدا کہے ہے
کیا خاص نسبت اس سے ہر فرد کو جدا ہے

جائے ہے جی نجات کے غم میں
ایسی جنت گئی جہنم میں

ہم مذہبوں میں صرف کرم سے ہے گفتگو
مذکور و ذکر یاں نہیں صوم و صلوٰۃ کا

یہ بھی طرفہ ماجرا ہے کہ اسی کو چاہتا ہوں
مجھے چاہیے ہے جس سے بہت احتراز کرنا

وصل و ہجراں سے جو دو منزل ہیں راہِ عشق کی
دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا

کل پانوں ایک کاسہ سر پر جو آ گیا
یکسر وہ استخواں شکستوں سے چور تھا

کہنے لگا دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسو کا سر پر غرور تھا

میر کے یہ اشعار مذہبی اور نسلی تقسیم کو مسترد کرتے ہیں اور انسانیت کے اتحاد کی پُرزور وکالت کرتے ہیں۔

میر تقی میر کی شاعری میں ایک ایسی پُروقار سنجیدگی اور فکری ندرت پائی جاتی ہے جو قاری کو محض لفظوں کے سحر میں نہیں الجھاتی، بلکہ اسے اپنے وجود کی داخلی اقلیم کی سیر کراتی ہے۔ وہ محض سطحی جذبات کو انگیخت کرنے پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ ان کا کلام ایک ایسے آئینے کی مانند ہے جس میں قاری کو اپنی روح کے مخفی گوشے صاف دکھائی دینے لگتے ہیں۔ ان کے اشعار پڑھنا گویا اپنی ذات سے مکالمہ کرنا ہے۔ میر قاری کو ایک ایسے مقام پر لے آتے ہیں جہاں وہ زندگی کے شور سے کٹ کر اپنی ہستی کے معنی تلاش کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ان کی غزلوں کی دھیمی آنچ قاری کے شعور کو پگھلاتی ہے اور اسے دعوت دیتی ہے کہ وہ کائنات کے وسیع تناظر میں اپنے وجود کی حقیقت اور مقصدِ حیات پر غور کرے۔ یہی وہ ندرتِ خیال ہے جو میر کو ایک عام شاعر کے درجے سے بلند کر کے ایک عظیم مربی اور فلسفی کے منصب پر فائز کرتی ہے۔ ان کا یہ شعر اس کی خوبصورت مثال ہے:

ہم مذہبوں میں صرف کرم سے ہے گفتگو
مذکور و ذکر یاں نہیں صوم و صلوٰۃ کا

یہ شعر مذہبی رسمیات سے ہٹ کر انسانی کردار اور نیکی کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔

میر تقی میر کی غزلوں کا کینوس صرف انسانی حسن اور جذباتی وابستگیوں تک محدود نہیں، بلکہ ان کے یہاں عشقِ مجازی کی دہلیز سے گذر کر عشقِ حقیقی کی تجلیات تک پہنچنے کا ایک پُرنور راستہ ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں تصوف محض ایک روایتی موضوع نہیں، بلکہ ایک ایسی زندہ جاوید روح ہے جو ان کے لفظ لفظ میں سانس لیتی ہے۔ میر کا تصوف قناعت، بے نیازی، صبر اور دردمندی کے انوار سے مزین ہے، جو قاری کو مادی دنیا سے بلند کر کے روحانی بالیدگی عطا کرتا ہے۔ ان کے صوفیانہ اشعار انسانی وجود کی حقیقت اور کائنات کے سربستہ رازوں سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ میر کے نزدیک 'عشق' کوئی عارضی جذبہ نہیں، بلکہ وہ اسے محرکِ کائنات اور کل کائنات کی روح قرار دیتے ہیں۔ وہ کائنات کے ذرے ذرے میں اسی ایک نورِ ازلی کا مشاہدہ کرتے ہیں اور انسان کو خودداری و فقر کا وہ درس دیتے ہیں جو اسے زمانے کی محتاجی سے آزاد کر دیتا ہے۔ میر کی درویشی ان کے فن کا وہ جوہر ہے جس نے ان کی غزل کو تقدس اور آفاقیت کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز کر دیا۔ ذیل کے یہ اشعار ملاحظہ کریں:

عشق ہے باطن اس کا ظاہر کا، ظاہر باطن عشق ہے سب
اودھر عشق ہے عالم بالا، ایدھر کو دنیا ہے عشق

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا

ارض و سما میں عشق ہے ساری چاروں اور پھرا ہے عشق
ہم ہیں جنابِ عشق کے بندے نزدیک اپنے خدا ہے عشق

آدم کی خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ
آئینہ تھا یہ، ولے قابلِ دیدار نہ تھا

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو
سارے عالم میں پھر رہا ہے عشق

کون مقصد کو عشق میں پہونچا
آرزو عشق مدعا ہے عشق

یہ اشعار عشق کو محض ایک جذبہ نہیں، بلکہ ایک ایسی قاہرانہ اور ہمہ گیر قوت کے طور پر پیش کرتے ہیں جو کائنات کے رگ و پے میں خون کی طرح دوڑ رہی ہے۔ میر کے نزدیک عشق ہی وہ اصلی روح ہے جس کے دم سے بزمِ کائنات قائم ہے اور جو ہر مظہرِ فطرت

میں جلوہ گر ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ میر کا تصوف محض خانقاہی گوشہ نشینی یا دنیا سے فرار کا نام نہیں، بلکہ یہ تو زندگی کے تپتے ہوئے حقائق اور عملی مسائل کے درمیان راستہ بنانے کا ہنر ہے۔ ان کا صوفیانہ شعور قاری کو تنہائی کے خول سے نکال کر پوری انسانیت کے دکھ درد سے ہم آہنگ کر دیتا ہے۔ وہ دردمندی کے اس مقام پر فائز ہیں جہاں پہنچ کر شاعر اپنی ذات کی قید سے آزاد ہو کر کربِ انسانیت کا ترجمان بن جاتا ہے۔

میر تقی میر کا صوفیانہ نظامِ فکر روایتی ترکِ دنیا یا محض خانقاہی گوشہ نشینی کی تبلیغ نہیں کرتا، بلکہ ان کے ہاں تصوف ایک زندہ اور متحرک حقیقت بن کر سامنے آتا ہے۔ ان کی شاعری دنیا سے کنارہ کشی کے بجائے زندگی کے سنگین عملی مسائل، پیچیدہ نفسیاتی گہرائیوں اور تلخ سماجی حقائق سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ دیتی ہے۔ میر کا کمال یہ ہے کہ وہ صوفیانہ فکر کی گتھیاں سلجھانے کے لیے کسی مشکل فلسفے کا سہارا نہیں لیتے، بلکہ اسے ایسی سحر انگیز اور عام فہم زبان کا پیرایہ دیتے ہیں کہ تصوف کا جوہر قاری کے دل میں گھر کر لیتا ہے۔ ان کے کلام میں وہ دردمندی ہے جو انسان کو اپنی ذات کے حصار سے نکال کر پوری انسانیت کے دکھ درد کا شریک بنا دیتی ہے۔

میر تقی میر کی شاعری کا ایک درخشاں پہلو ان کی زبان کا وہ بے پناہ تنوع اور لچک ہے جو اردو ادب میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے اردو زبان کے ہر رنگ اور ہر آہنگ کو کچھ اس فنکاری سے برتا کہ عام بول چال کی سادگی اور فلسفیانہ افکار کی گہرائی ایک ہی قالب میں ڈھل گئے۔ میر وہ پہلے فنکار ہیں جنھوں نے زبان کے مخفی امکانات کو اجاگر کیا اور اسے ایک ایسی آفاقی وسعت عطا کی جو ان سے پہلے اردو شاعری میں ناپید تھی۔ ان کی زبان محض الفاظ کا مجموعہ نہیں، بلکہ اس میں ایک ایسی جادوئی مقناطیسیت ہے جو قاری کے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ میر نے بازار کی عام فہم زبان اور روزمرہ کے محاوروں کو اپنے تخلیقی شعور کی بھٹی میں تپا کر کندن بنا دیا۔ انھوں نے سادہ لفظوں کو ایک ایسی غیر معمولی قوت بخشی کہ وہ نہ صرف ہر طبقے کے قاری تک رسائی حاصل کرتے ہیں، بلکہ روح کی گہرائیوں میں اتر کر ایک نیا جہانِ معانی آباد کر دیتے ہیں۔ ان کا لسانی شعور ہی وہ بنیاد ہے جس پر آج کی جدید اردو غزل کی عمارت کھڑی ہے۔

بے خودی کہاں لے گئی ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا

یہ شعر عام بول چال کے لفظوں میں ایک گہرے جذباتی تجربے کو بیان کرتا ہے، لیکن اس کی سادگی اسے ہر قاری کے لیے قابلِ فہم بناتی ہے۔ میر نے زبان کے تمام رنگوں کو برت کر اردو شاعری کے امکانات کو وسعت دی۔

میر تقی میر کی شاعری کی معراج اس کی وہ آفاقیت ہے جو اسے زمان و مکاں کی قیود سے آزاد کر کے ہر دور کے انسان کے لیے 'دل کی آواز' بنا دیتی ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں انسانی جبلتوں، بدلتے ہوئے سماجی تناظر اور گہرے فلسفیانہ افکار کو اس فنکاری سے یکجا کیا ہے کہ وہ ہر عہد اور ہر خطے کے قاری کے لیے فکر و شعور کے نئے دریچے کھولتے ہیں۔ میر کا کلام محض ایک فرد کے نجی تجربات کی بازگشت نہیں، بلکہ یہ پوری انسانیت کے اجتماعی کرب اور وجدانی مسرت کا اظہار ہے۔ ان کے اشعار کی تاثیر اور چمک آج دو صدیوں بعد بھی اسی طرح برقرار ہے جیسے ان کے اپنے عہدِ پُر آشوب میں تھی۔ وقت کی گرد ان کے لفظوں کی خوشبو کو کم نہ کر سکی، بلکہ جوں جوں انسانی تہذیب شعور کی نئی منزلیں طے کر رہی ہے، میر کے اشعار کے معانی میں مزید وسعت اور گہرائی پیدا ہو رہی ہے۔ وہ ایک ایسے صاحبِ بصیرت فنکار تھے جنھیں اپنی بقا اور فن کی ہمہ گیری کا کامل ادراک تھا، اسی لیے انھوں نے دعویٰ کیا تھا:

جانے کا نہیں شور سخن کا میرے ہرگز
تا حشر جہاں میں میرا دیوان رہے گا

میر کی یہ پیش گوئی آج ایک سچائی بن کر اردو ادب کے افق پر چمک رہی ہے۔ ان کا کلام آج بھی انسانی روح کو تڑپانے اور ذہنوں کو جلا بخشنے کی وہی قوت رکھتا ہے جو حشر تک قائم رہے گی۔

میر تقی میر کے اشعار نہ صرف دل کے تاروں کو چھیڑتے ہیں، بلکہ انسانی شعور کو بصیرت کی نئی راہوں سے بھی آشنا کرتے ہیں۔ وہ قاری کو محض نجی دکھوں اور مسرتوں سے ہم آہنگ نہیں کرتے، بلکہ اسے زندگی کے ان گہرے فلسفیانہ سوالات کے روبرو لا کھڑا کرتے ہیں جہاں غزل ایک مکمل ضابطہ حیات بن جاتی ہے۔ میر کا مطالعہ ہمیں ایک ایسی کائنات سے روشناس کراتا ہے جہاں شخصی اور اجتماعی کرب، مادی حقائق اور روحانی تجلیات اور عارضی و ابدی کیفیات باہم شیر و شکر ہو جاتی ہیں۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں انسانی اقدار، محبت، دردمندی اور بلند ظرفی کے ان تمام رنگوں کو سمو دیا ہے جو انسانیت کا اصل ورثہ ہیں۔ ان کے کلام کی دائمی چمک اس حقیقت کی گواہ ہے کہ جب تک انسانی دل میں دھڑکن باقی ہے، میر کی صداقتِ جذبہ بھی زندہ رہے گی۔

ادبی تاریخ کے آئینے میں جب ہم میر کا موازنہ حافظ اور غالب سے کرتے ہیں، تو ایک نمایاں فکری فرق سامنے آتا ہے۔ حافظ کا شیراز ہو یا غالب کی دہلی، دونوں نے اپنے عہد کے جبر اور تباہی کا مشاہدہ کیا، مگر ان دونوں عظیم فنکاروں نے زمانے کے شکنجوں کو توڑ کر نشاط، سرکشی اور ایک والہانہ سرشاری کو اپنا شعار بنایا۔ ان کے یہاں ایک ایسی انانیت اور فکری بالیدگی ملتی ہے جو غم کے اندھیروں میں بھی چراغِ شگفتگی روشن رکھتی ہے۔ اس کے برعکس میر کا رستہ ذرا کٹھن اور جداگانہ ہے۔ میر کے ہاں وہ شوخی اور نشاط تو نہیں، مگر ایک ایسی جاں گسل افسردگی اور پُر وقار بے چارگی ہے جو براہِ راست روح کے زخموں سے پھوٹتی ہے۔ ان کی شاعری نسیم و صبا کے نرم جھونکوں کے بجائے ان بگولوں کی مانند ہے جو اپنے اندر طوفانوں کا اضطراب سمیٹے ہوئے ہیں۔ میر نے اپنے دکھ کو کسی فلسفیانہ لبادے یا مصنوعی سرشاری میں چھپانے کی کوشش نہیں کی بلکہ یہی وہ بے ساختہ صداقت اور سوز دروں ہے جو ان کے کلام کو غالب اور حافظ کی رنگینی سے الگ ایک منفرد آفاقیت عطا کرتی ہے۔ میر کی شاعری پر وقت کی گرد کبھی اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ ان کا کلام صدیوں کی مسافت طے کرنے کے بعد بھی اسی طرح تازہ اور اثر انگیز ہے جیسے روزِ اول میں تھا۔ یہ وہ معیارِ سخن ہے جو نقادوں کے لیے مشعلِ راہ اور عام قارئین کے لیے تسکینِ قلب کا باعث ہے۔ میر محض اردو شاعری کے معمارِ اعظم ہی نہیں، بلکہ انسانی جبلتوں اور سماجی حقائق کے وہ عظیم ترجمان ہیں جن کی آواز دلوں کو گرماتی بھی ہے اور ذہنوں کو جھنجھوڑتی بھی۔ جب تک انسانیت کا ناتہ درد اور محبت سے جڑا ہے، میر کی یہ فلسفۂ حیات پر مبنی شاعری ہر دور میں ایک روشن مینار بن کر اس کی رہنمائی کرتی رہے گی۔

■

Dr. Nezamuddin Ahmad
Head, Department of Urdu,
B.N.M.V. College, Madhepura(Bihar)
Mobile No. 9313116230
Email: ahmad.nezamuddin@gmail.com

نعیمہ جعفری پاشا

نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں متصوفانہ رجحان

تصوف ایک فکر ہے، سوچ ہے، نظریہ ہے۔ یہ ایک عقیدہ اور یقین ہے جس کا تعلق قلب اور باطن سے ہوتا ہے۔ یہ کوئی مسلک نہیں ہے۔ اس کے لیے کسی ظاہری علامات اور کسی خاص حلیے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ لمبے کرتے اور اونچے پاجامے کی مانگ نہیں کرتا۔ یہ لمبے بالوں اور لمبی داڑھی کا بھی محتاج نہیں ہے۔ یہ شریعت کا مخالف نہیں ہے بلکہ شریعت پر عمل پیرا ہوتے ہوئے باطن کی طہارت پر زیادہ زور دیتا ہے۔ یہ قلب کی ماہیت وطہارت پر کاربند رہنے پر اصرار کرتا ہے۔ پاک روح، پاک جسم میں ہی مطمئن رہ سکتی ہے۔

اللہ کی وحدت پر ایمان تو ہر مسلمان کا فرض اولین ہے لیکن صوفی ہر تخلیق میں اللہ کا جلوہ دیکھتا ہے۔ اس کا یقین ہی نہیں پختہ عقیدہ ہے کہ ''وہ'' ہی ہے، صرف ''وہ'' ہی ہے۔ سب کچھ اسی سے ہے اور ہر شے میں اسی کا جلوہ ہے۔ وہ ظاہر بھی ہے اور باطن بھی، اول بھی ہے اور آخر بھی اور وہ ہی باقی ہے، وہ ہی موجود ہے۔ کائنات کی ہر تخلیق میں وہ ہی جلوہ گر ہے۔ پھول میں رنگ وبو بنا، سورج اور چاند میں چمک اور روشنی، پہاڑوں میں بلندی، آسمان میں وسعت اور سمندروں کی گہرائی اسی کی ذات بالاصفات کے پرتو ہیں۔ کہیں ''ہمہ اوست'' کا نعرہ بلند ہوا تو کہیں ''ہمہ از اوست'' سے تعبیر کیا گیا۔ کسی نے اسے وحدت الشہود کے حوالے سے جانا تو کسی نے اسے وحدت الوجود کے ذریعے سمجھا۔ ہر شے میں اسی کا نور دیکھا، ہر وجود میں اس کا ظہور پایا، ہر آواز میں ''کن'' کی بازگشت سنی۔

یار کو ہم نے جا بجا دیکھا
کہیں ظاہر کہیں چھپا دیکھا
(شاہ نیاز احمد)

مطرب وہی آواز وہی، ساز وہی ہے
ہر تار میں بولا، وہ ہر اک تان میں آیا
(اصغر اکبر آبادی)

گل ہے وہی، سنبل ہے، وہی نرگس حیراں
اپنے ہی تماشے کو گلستان میں آیا
(اصغر اکبر آبادی)

گوش کو ہوش کے ٹک کھول کے سن شور جہاں
سب کی آواز کے پردے میں سخن ساز ہے ایک
(میر تقی میر)

لیکن تصوف کو بیان کرنا جتنا آسان ہے، اسے سمجھنا، اس پر عمل پیرا ہونا اور اسے جاں گزیں کر لینا اتنا ہی مشکل ہے۔ چار کتابیں پڑھ کر تصوف کو سمجھ لینے کا دعویٰ غلط ہے کیونکہ یہ ایک کیفیت ہے جسے وہی سمجھ سکتا ہے جس پر طاری ہوتی ہے۔ یہ راہ بہت بہت مشکل ہے، لوگ بھٹک جاتے ہیں۔ مظاہر کو اصل سمجھ لیتے ہیں۔ عکس پر وجود کا دھوکا کھا لیتے ہیں اور مظاہر کی پرستش کرنے لگتے ہیں، جو سمجھ لیتے ہیں وہ عکس سے حقیقت تک پہنچ جاتے ہیں اور عوام الناس مغالطے میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ''بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی'' اس راہ کو اختیار کرنا اور بات ہے اور منزل تک صحیح سلامت پہنچنا مشکل ترین مقام ہے۔

شاعری بالخصوص غزل کی شاعری متصوفانہ کلام کے لیے موزوں پائی گئی۔ غزل میں عشق محبوب، شمع وپروانہ، گل وبلبل، ہجر ووصال جیسی اصطلاحات کے پردے میں عشق حقیقی کی کیفیات کا اظہار فارسی شاعری سے ہی اردو شعر وشاعری میں ہوا۔

حافظ، سعدی، رومی حکیم سنائی، نظامی عطار، عراقی وغیرہ کی شعری روایات ہمارے سامنے ہیں ان میں سے اکثر کا شمار برگزیدہ صوفیوں میں ہوتا ہے۔ غزل کے علاوہ مثنوی اور قطعات میں بھی تصوف کے نکات بیان کیے گئے ہیں۔ فارسی میں سب سے معروف مثال ''مثنوی مولانا روم'' ہے جہاں متصوفانہ عقائد ونظریات کا مفصل، جامع اور واضح بیان موجود ہے۔ مثنوی مولانا روم کا شعر دیکھیں:

خشک تار و خشک چوب و خشک پوست
از کجا می آید ایں آواز دوست

اردو میں بھی یہ روایت برقرار رہی ہے۔ صوفیا کی مثنویاں اور دیگر کلام اردو شعر وادب کے دونوں مراکز، شمالی ہند اور دکن میں متصوفانہ موضوعات پر خاطر خواہ تعداد میں موجود ہیں۔ سترھویں اور اٹھارہویں صدی میں شمالی ہند میں شاہ تراب علی قلندر، شاہ رکن الدین عشق، سید علی غمگین، مرزا مظہر جان جاناں، شاہ نیاز احمد، شاہ اصغر اکبر آبادی، خواجہ میر درد، سراج اورنگ آبادی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام شعرا صوفی باعمل تھے، کسی نہ کسی صوفی سلسلے سے وابستہ تھے۔ ان

کی شاعری عشق حقیقی کا سرچشمہ ہے۔ اس دور میں تصوف کا رنگ اتنا گہرا تھا کہ زیادہ تر شعرا کے کلام میں ہمیں صوفیانہ مضامین ملتے ہیں۔ ان شعرا کو تین درجات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول وہ شعرا جو خود بھی صوفی بزرگ تھے، صاحب حال وقال تھے اور تصوف ان کی رگ جاں سے بھی قریب تھا۔ دوسرے وہ جو تصوف کا علم رکھتے تھے، تصوف کی سمجھ بھی رکھتے تھے لیکن خود صوفی نہیں تھے جیسے غالب، اقبال وغیرہ اور تیسرے وہ جو تصوف کو ''برائے شعر گفتن خوب است'' کے مقولے کے مطابق فیشن کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ یعنی ان کی غزلوں میں ایک آدھ شعر صوفیانہ نہج کا شامل ہو جاتا تھا۔

نظیر اکبرآبادی کا معاملہ بھی یہ تھا کہ وہ باحال صوفی نہ سہی لیکن باخیال تصوف پر یقین بھی رکھتے تھے اور سمجھ بھی رکھتے تھے۔ وہ وحدت الوجود کے ماننے والے تھے۔ نظیر کی متصوفانہ شاعری میں قلندرانہ شان ہے۔ قلندر، جس کے عشق میں سوز و گداز نہیں ہوتا بلکہ قلندرانہ لاتعلقی میں تعلق کی کیفیت ہوتی ہے۔

سب جھوٹ ہے کہ تم کو ہمارا ہو غم میاں
بابا کسے خدا کے سوا دم فقیر کا

علامہ میکش اکبرآبادی لکھتے ہیں:

''نظیر اکبرآبادی ایک قلندر مزاج آدمی تھے۔ وہ ایک پاک باطن، خوش باش انسان تھے۔ ان کا دل ہر صداقت کی طرف جھک جاتا تھا، چاہے سلیم چشتیؒ ہوں، گرونانک ہوں، سری کرشن ہوں، شیو جی ہوں یا بلدیو جی یا مذہبی تیج تہوار۔'' نظیر کے صوفیانہ اور قلندرانہ مزاج نے انھیں مذہب اور مسلک سے اوپر ہو کر مختلف مذہبی رہنماؤں اور شخصیات کی مدح پر راغب کیا۔ ان کی آزاد روی، وسیع القلبی، عدم تعصبی، بے نفسی، اخلاق، توکل اور مال و زر سے عدم دلچسپی نے انھیں عوام الناس سے قریب تر کر دیا تھا۔ ہر ایک سے ملنا، ہر ایک کی خبر گیری، ہر ایک کی دل آسائی کہ جس نے فرمائش کی اس پر نظم لکھ دی، یہاں پیسے کا لالچ یا نام و نمود کی طلب نہیں تھی بلکہ انسان نوازی کا جذبہ تھا۔ وہ عوامی میلوں ٹھیلوں، تیج تہواروں میں شریک ہوتے اور پورے جوش کے ساتھ ان کی عکاسی کرتے۔ نظیر کی دلچسپیاں اتنی گوناگوں تھیں کہ ان کی شخصیت کو کسی ایک مسلک میں قید کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ

نظیر کی شاعری کا یہ عوامی رنگ ہے جو عوام کے لیے تھا اور عوام کی فرمائش پر تھا اور جس کے لیے نظیر جانے جاتے تھے۔ نظیر کے تقریباً ہر نقاد نے کبھی توصیف کے طور پر اور کبھی تعرض کے طور پر نظیر کی شاعری کے اس پہلو کو اجاگر کیا ہے۔

حقیقت بھی اظہر من الشمس ہے کہ ان کے کلام کا بڑا حصہ عوام کی فرمائش پر لکھا گیا۔ چاہے آگرے کی لکڑی ہو، تل کے لڈو ہوں یا نارنگی بیچنے والی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بازاری عورتیں جو گلی کوچوں میں، کوٹھوں کے جھروکوں میں، میلوں ٹھیلوں تہواروں میں بنی ٹھنی اپنی چھب دکھاتی پھرتی تھیں، ان کی فرمائش پر بھی میاں نظیر ان پر نظمیں لکھ دیتے تھے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے کسی موتی بیگم کو ان کی محبوبہ قرار دے دیا ہے کیونکہ نظیر کے کلیات میں ان پر بھی نظم شامل ہے۔ بقول علامہ میکش اکبرآبادی ''اس طرح تو نظیر کی بہت سی معشوقائیں مل جائیں گی۔'' آگے چل کر میکش صاحب یوں رقم طراز ہیں کہ ''عمر کے کسی حصّے میں ہر انسان حسن کی طرف ملتفت ہو جاتا ہے اور حسن پرستی انسان کی سرشت میں شامل ہے لیکن اس سے نظیر کے کردار پر کیچڑ نہیں اچھالی جا سکتی۔''

نظیر کا زمانہ سیاسی، سماجی، تہذیبی، معاشرتی اور معاشی ہر حوالے سے انحطاط اور زوال کا زمانہ تھا۔ ایسے حالات میں سماج میں طوائف گردی، بے حیائی اور چھچھورے پن کے جو اثرات نمایاں ہو جاتے ہیں ان کی تصویر کشی نظیر نے عوام ہی کی زبان میں پوری سچائی کے ساتھ کی ہے۔ نظیر کی شاعری کا یہ عوامی رنگ ہے جو عوام کے لیے تھا اور عوام کی فرمائش پر تھا اور جس کے لیے نظیر جانے جاتے تھے۔ نظیر کے تقریباً ہر نقاد نے کبھی توصیف کے طور پر اور کبھی تعرض کے طور پر نظیر کی شاعری کے اس پہلو کو اجاگر کیا ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ نظیر نے 95 سال کے لگ بھگ عمر پائی۔ ان کی شاعری کی عمر بھی کم و بیش 75 سال ضرور رہی ہوگی۔ شاعری کا کافی حصہ اوائل عمر کی تخلیق رہا ہوگا۔ اس کی تصدیق نہیں ہو سکی ہے کیونکہ نظیر کے کلام پر تاریخیں درج نہیں ہیں۔ لیکن ہمارا مطمح نظر نظیر کے اس کلام کا جائزہ لینا ہے جس سے اخلاقیات اور تصوف کے مضامین کی نشان دہی ہوتی ہے۔ ان کی منظومات، توکل، وجد و حال، فقر، چڑیوں کی تسبیح، موت، آئینہ، توحید، فنا و بقا، بنجارہ نامہ، اللہ ہی اللہ ہے، حمد، نعت، منقبت میں صوفیانہ رنگ ہے یا ان کی تضمینات میں جو زاویہ نظر پیش ہوا ہے ان ہی سے درحقیقت نظیر کا اصل چہرہ نظر آتا ہے۔ انھوں نے حافظؔ، سعدی، خسرو، اصغر اکبرآبادی کی متصوفانہ غزلیات پر جو تضمینیں کہی ہیں ان کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ نظیر کا اصل مزاج کیا تھا۔ نظیر کے اکثر شاگرد ان کو صرف استاد ہی نہیں بلکہ خدا رسیدہ بزرگ مانتے تھے۔ اسی وجہ سے انھیں گورغریباں میں دفن کرنے کے بجائے ان کے گھر پر اسی نیم کے درخت کے نیچے دفنایا گیا، جس کے نیچے بیٹھ کر وہ لڑکوں کو درس دیتے تھے۔ اس دور کی ایک روایت یہ بھی رہی ہے کہ پیروں، فقیروں اور خدا رسیدہ بزرگوں کو عام قبرستان کے بجائے گھر کے احاطے میں ہی دفنایا جاتا تھا۔

نظیر کی رہائش آگرے کے نوری دروازے محلے میں تھی اور سسرال محلہ تاج گنج میں تھی۔ پیشے سے معلم تھے۔ بعض ہندو امرا کے لڑکوں کو پڑھانے ان کے گھر جاتے تھے اور بقول شہباز ایک وقت کا کھانا بھی اپنے شاگردوں کے یہاں کھا لیا کرتے تھے۔ اس میں مذہب و ملت اور مسلک کی کوئی قید نہیں تھی۔ یہ نہ صرف ان کی وسیع القلبی اور بے تعصبی کا اشارہ ہے بلکہ اس میں ان کے قلندرانہ مزاج اور روش کے پیچھے متصوفانہ فکر اور نظریہ بھی کارفرما ہے۔ وہ انسانیت اور انسان دوستی کے قائل تھے۔ اس فانی دنیا میں کچھ رہنے والا نہیں ہے تو پھر تفریق کیسی ''سب اللہ ہی اللہ ہے''۔

باغ و چمن کے غنچہ و گل میں نہ ہو اسیر
قمری کی سن صفیر نہ بلبل کی سن صفیر
اپنے تئیں تو دیکھ کہ کیا ہے تو اے نظیر

ہر لحظہ اپنی چشم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی خود ہی بہار دیکھ
(آئینہ)

لے عالم ارواح سے تا عالم جنات
انسان پری، حوروملک جن و خبیثات
کیا ابر ہوا، جنگل و کوہ، ارض و سمٰوات
اک پھونک میں اڑ جائیں گے جوں نقش طلسمات
ہشیار، نہ پختہ نہ کوئی خام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا
(فنائے جہاں)

نظیر کے حالات، واقعات، نظریات، مشغولیات اور مسلک و مذہب کو جاننے کے حوالے سے دو قدیم کتابیں مستند مانی جاتی ہیں۔ عبدالغفور شہباز کی ''زندگانی بے نظیر'' اور قطب الدین باطن کی ''گلشن بے خار'' باطن نظیر کے شاگرد تھے جبکہ شہباز کی معلومات کا ماخذ نظیر کی نواسی کی زبانی سنے ہوئے حالات اور واقعات ہیں، نظیر کا ناقدین نے بوجوہ باطن کے تذکرے کو زیادہ قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ باطن کا زیادہ زور نظیر کا کلام جمع کرنے پر تھا۔ نظیر کی گھریلو زندگی کے بارے میں ان کی معلومات واجبی سی تھیں۔ البتہ شہباز کی کتاب کو مستند مانا جاتا ہے۔ علامہ میکش اکبرآبادی کے ایک مضمون کا ایک اقتباس یہاں نقل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''شہباز کا اردو ادب پر یہ بڑا احسان ہے کہ انھوں نے نظیر کے متعلق وہ مواد فراہم کیا جو ان کے بعد ممکن نہ تھا۔ یعنی تحقیق کے دروازے کھول دیے۔ لیکن ایسی بہت سی باتیں تھیں جن کو قبول کرنا مشکل تھا اس لیے تحقیق کی گئی اور بہت سی باتیں سامنے آئیں، جن کا سامنے لانا اس لیے ضروری ہے کہ پھر کوئی اتنا جاننے والا بھی نہ رہے گا۔''

شہباز نے زندگانی بے نظیر تحریر کرتے ہوئے نظیر کی نواسی سے بہت سی معلومات حاصل کیں۔ میکش صاحب کی تحقیق ہے کہ نظیر کے انتقال کے وقت ان کی نواسی کی عمر سات سال تھی اور شہباز نے جب ان سے رابطہ کیا تو وہ ضعیف ہو چکی تھیں۔ لہٰذا ان کا بیان چشم دید سے زیادہ اپنی والدہ سے سنی ہوئی باتوں پر محمول ہے۔ (اس زمانے میں لڑکیوں کی شادی کم عمر میں ہو جاتی تھی اور ان کا زیادہ وقت سسرال میں ہی گزرتا تھا۔) لہٰذا نواسی کا بیان سوفی صد قابل اعتبار نہیں ہے۔ سات سال کی عمر کی دیکھی سنی باتیں ضعیف العمری میں کتنی معتبر ہو سکتی ہیں اور کتنی یاد رہی ہوں گی اور کتنا ان کی یادداشت نے دھوکا دیا ہوگا!

اسی طرح نظیر کے مسلک کے بارے میں بھی مختلف النوع آرا پیش کی گئیں۔ نظیر کو امیرالمومنین حضرت علیؓ سے خاص عقیدت تھی۔ ان کی کلیات میں حضرت علیؓ کی شان میں کئی منقبتیں ہیں۔ نظیر کے بعض ناقدین نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ نظیر اہل تشیع تھے۔ میکش صاحب کے بیان کے مطابق حضرت علیؓ سے عقیدت شیعہ ہونے کا ثبوت ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ بھی نظیر کی تصوف سے نسبت اور صوفیوں کی صحبت کا اثر تھا۔

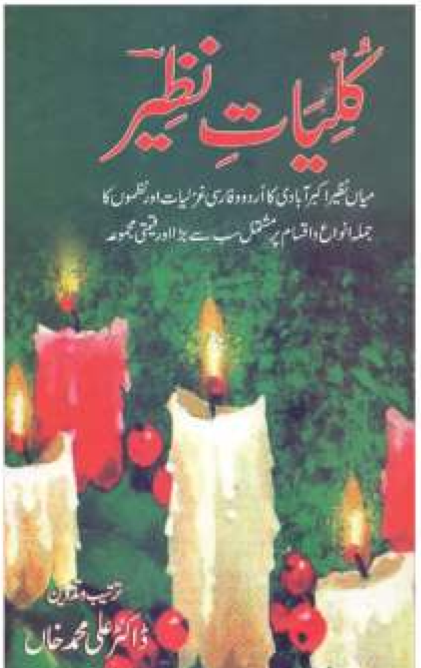

تصوف کے چار بڑے اور مشہور سلسلے ہیں۔ قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ۔ حضرت علیؓ ان میں سے تین سلسلوں قادریہ، چشتیہ، اور سہروردیہ کے سرسلسلہ تھے۔ جبکہ چوتھا سلسلہ نقشبندیہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق سے منسوب ہے، جو حضرت سلمان فارسیؓ کے ذریعے آگے بڑھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات کے بعد حضرت سلمان فارسی نے بھی مزید تعلیم و تعلم کے لیے حضرت علیؓ سے ہی رجوع کیا۔ چشتیہ سلسلہ حضرت علیؓ سے حضرت حسن بصریؒ کو تفویض ہوا اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری سے ہوتا ہوا آگے بڑھا۔ قادریہ سلسلہ حضرت علیؓ سے ان کے صاحب زادے امام حسینؓ سے ہوتا ہوا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے پھیلا۔ اسی طرح نقشبندیہ اور سہروردیہ سلسلوں کی روایت بھی ثابت ہے۔ یہی سبب ہے کہ تصوف کے پیروکاروں کو حضرت علیؓ سے دو طرفہ عقیدت ہے۔ عموماً لوگ اسے شیعیت سے منسوب کرتے ہیں۔

نظیر کے والد کا نام فاروق تھا۔ ان کی والدہ بھی اہل سنت خانوادے سے تھیں اور نہ خود نظیر شیعیت کی طرف مائل تھے، البتہ نظیر کی بیوی شیعہ تھیں۔ اسی سے ان کی اولادیں، بیٹے گلزار علی اسیر اور بیٹی شیعہ عقائد کی طرف راغب تھے۔ میکش اکبرآبادی نے لکھا ہے:

''میں نے اس امر پر اس وجہ سے اور زیادہ تحقیق اور چھان بین کی ہے کہ ابھی (میکش صاحب کی اوائل عمر میں) نظیر اور ان کے خاندان کو قریب سے جاننے والے جو لوگ باقی ہیں، اگلے زمانے میں وہ بھی نہیں ہوں گے اور نظیر کے مسلک کے بارے میں غلط مفروضات مستحکم ہو جائیں گے۔''

حضرت علیؓ سے عقیدت اور اہل بیت یا پنجتن پاک سے محبت بہت سے سنی حضرات بھی رکھتے ہیں۔ خصوصاً صوفیا کا یہی وطیرہ رہا ہے۔ نظیر چشتیہ اور قادریہ سلسلے کے بزرگوں سے خاص طور پر عقیدت رکھتے تھے۔

شہباز نے زندگانی بے نظیر میں نظیر کی نواسی سے کیے گئے سوالات نقل کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''میں نے پوچھا کیا کسی بزرگ سے ارادت تھی؟'' انھوں نے جواب دیا ''مرید تو کسی کے نہ تھے ہاں فقرا کے ساتھ اکثر اٹھتے بیٹھتے تھے۔ ان لوگوں سے خاص عقیدت تھی۔ مکان کے پاس ایک مسجد تھی وہاں ایک بزرگ شاہ غلام رسول رہتے تھے۔ بہت بڑے مشائخ میں تھے۔ پیری مریدی کرتے تھے، ان سے بڑا ربط تھا۔''

اس تحریر سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ نظیر کو صوفیوں سے بہت قربت تھی، مرید نہ ہونے کا حال قابل اعتبار نہیں ہے کیونکہ بقول علامہ میکش اکبرآبادی ''ضروری نہیں کہ گھر کی عورتوں اور بچوں کو ایسی معلومات ہوں۔'' شہباز بھی لکھتے ہیں ''یہ معلومات احباب کی زبانی زیادہ معتبر ہو سکتی ہیں۔'' شاہ محمد اکبر داناپوری کے حوالے سے شہباز نے نقل کیا ہے۔

''حضرت مولانا فخرالدین چشتی دہلی کے مشہور و معروف مشائخ میں سے تھے۔ وہ ایک مرتبہ آگرہ تشریف لائے اور حضرت سیدنا امیر ابوالعلیٰ اکبرآبادی کے یہاں قیام فرمایا۔ نظیر اپنے دوست ملا محمد بدایونی بیدار کے ساتھ

ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے اور انھیں سے مذاق تصوف پیدا ہوا۔''

یہ تحریر شاہ اکبر داناپوری کی کتاب سے نقل کی گئی ہے۔ جس سے صوفیا کی خدمت میں نظیر کی حاضری کا پتہ چلتا ہے لیکن اس میں بھی بعض نکات قابل اعتبار نہیں ہیں۔ مثلاً سیدنا امیر ابوالعلیٰ اکبرآبادی عہد جہانگیری کے بزرگ تھے جن کا مزار آگرہ میں ہے۔ حضرت مولانا فخر الدین چشتی نے سیدنا کے گھر پر نہیں بلکہ مزار سے ملحق حجرے میں قیام فرمایا تھا جہاں نظیر حاضر ہوتے تھے۔

نظیر کے مزاج میں تصوف کی طرف التفات سے متعلق کئی زیادہ معتبر ذرائع سے تحقیق کی گئی جس کا لب لباب یہاں نقل کرنا مناسب ہوگا۔

نظیر علامہ میکش اکبرآبادی کے جد چہارم حضرت سید امجد علی شاہ اصغر اکبرآبادی کے ہم عصر تھے۔ حضرت اصغر اکبرآبادی کا قیام اس زمانے میں ریشم کے کٹڑے میں تھا جو نظیر کے مکان سے بہت قریب تھا۔ خاندانی مخطوطوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظیر کو شاہ صاحب سے خاص عقیدت تھی۔ نظیر نے ان کی ایک مشہور غزل پر تضمین بھی کہی ہے۔ دو بند ملاحظہ ہوں۔

وہ رنگ کہیں لعل بدخشان میں آیا
نیلم میں کہیں گوہر غلطان میں آیا
یاقوت میں الماس میں مرجان میں آیا
''جب حسن ازل پردہ امکان میں آیا
بے رنگ بہر رنگ ہر اک شان میں آیا''

بو ہو کے ہر ایک پھول کی پتی میں بسا ہے
موتی میں ہوا آب ستاروں میں ضیا ہے
تنہا نہ ہماری ہی وہ شہ رگ سے ملا ہے
''نزدیک ہے وہ سب سے جہاں اس سے بھرا ہے
جب چشم کھلی دل کی تو پہچان میں آیا''

یہ تضمین نظیر کی کلیات میں شامل ہے اور اسے پڑھ کر صاف اندازہ ہوتا ہے کہ یہ محض ''برائے شعر گفتن'' نہیں ہے بلکہ نظیر کو خود بھی تصوف سے ارادت تھی۔ جن سید شاہ غلام رسول کا ذکر نظیر کی نواسی نے کیا تھا، ان کی بہن حضرت اصغر اکبرآبادی سے منسوب تھیں اور شاہ غلام رسول کی صاحب زادی حضرت اصغر اکبرآبادی کے فرزند سید منور علی شاہ صاحب کو بیاہی تھیں۔ سید غلام رسول حضرت رفیع الدین صفوی کی اولاد میں تھے جو صاحب کشف بزرگ تھے۔ شاہ غلام رسول کے پاس صوفی اور محدثین کی آمد و رفت رہتی تھی اور نظیر بھی حاصل فیض باطنی کی نیت سے ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ حضرت سید امجد علی شاہ اصغر اکبرآبادی نے کئی دستاویزیں تحریر فرمائیں جن میں تفصیل سے تمام حالات درج ہیں۔ شاہ صاحب ہر ماہ مشاعروں کا بھی انعقاد فرماتے تھے جس میں آگرے کے معتبر صوفی بزرگ اور نامور شاعر اپنا کلام سناتے تھے۔ نظیر کا بھی ان مشاعروں میں حاضر ہونا ثابت ہے۔

حضرت امجد علی شاہ اصغر اکبرآبادی کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تحریروں کے علاوہ آپ کے پوتے مولانا سید مظفر علی شاہ المتخلص باللہ کی کتاب ''جواہر غیبی'' جو نہ صرف تصوف پر ایک مستند کتاب ہے بلکہ تاریخی اعتبار سے تذکرہ نویسی کے حوالے سے بھی اہمیت کی حامل ہے۔ اس دور کے شعرا کے علاوہ اس دور کی شعری اور متصوفانہ سرگرمیوں کے بارے میں بھی مستند کتاب ہے۔ میکش صاحب نے بھی اس دور کے شعرا کے بارے میں معلومات اسی کتاب سے نقل کی ہیں۔ ان معلومات کی روشنی میں میکش صاحب لکھتے ہیں۔

''نظیر صوفیوں کے دوست اور عقیدت مند تھے۔ آگرے کے مشہور صوفی بزرگ سیدنا ابوالعلیٰ اکبرآبادی کے مزار کے حاضر باش تھے اور اپنے صوفی دوست شاہ سید غلام رسول کے ساتھ صوفیائے وقت کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ اسی دوران دہلی سے حضرت مولانا فخر الدین چشتی جو مولانا کلیم الدین جہاں آبادی کے خلیفہ اور سجادہ نشین تھے، اپنے وصال سے تین سال پہلے 1816 میں آگرہ تشریف لائے تھے اور کئی ماہ قیام کیا تھا۔ حضرت ابوالعلیٰ کے مزار کے نزدیک حجرے میں قیام تھا۔ نظیر شاہ سید غلام رسول اور شاہ بیدار کے ساتھ ان کے حلقہ وعظ و نصیحت میں حاضر رہتے تھے۔ حضرت شاہ اصغر کا وصال 1814 میں ہو چکا تھا اور یہ ان کے صاحبزادے سید منور علی شاہ جعفری کا زمانہ تھا جو خود بھی صاحب حال بزرگ تھے اور قادریہ سلسلے سے نسبت تھی۔ یہ تمام تفصیلات ''جواہر غیبی'' میں موجود ہیں۔ نظیر کا انتقال 1830 میں ہوا۔ انھوں نے نہ صرف امجد علی شاہ اصغر اکبرآبادی کا زمانہ پایا بلکہ آپ کے پوتے مولانا مظفر علی شاہ الٰہی اکبرآبادی کی جوانی کا دور بھی دیکھا اسی لیے ان دونوں حضرات نے اپنی تحریروں میں نظیر کا ذکر تصوف سے رغبت کے حوالے سے کیا ہے۔

راقم الحروف کا تعلق بھی اسی خانوادے سے ہے، چنانچہ یہ مستند روایات علامہ میکش اکبرآبادی کی زبانی نیز مندرجہ بالا کتب اور دستاویزات کے ذریعہ حاصل ہوئی ہیں۔

نظیر کے خمسہ جات اور تضمینات بجائے خود تصوف میں نہ صرف ان کی دلچسپی بلکہ ذوق و شوق کے شاہد ہیں۔ سراج اورنگ آبادی کی مشہور زمانہ غزل پر نظیر کی تضمین کا ایک بند پیش کیا جاتا ہے۔

عجب اتفاق ہے کہ خود بخود میرے دل سے عیش نکل گیا
پڑی آگ غم کی وہ تن میں آ کہ بہ رنگ شمع پگھل گیا
ادھر آہ شعلہ زباں ہوئی ادھر اشک آنکھوں سے ڈھل گیا
چلی سمت غیب سے اک ہوا کہ چمن ظہور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

خمسہ بر غزل امیر خسرو:

کب لالہ و گل کر سکیں عارض سے تیرے ہمسری
قد سے خجل سرو و سہی رفتار سے کبک دری
محبوب تجھ سے سیکھ لیں ناز و ادا و دلبری
''اے چہرہ زیبائے تو رشک بتان آذری
ہر چند وصفت می کنم در حسن تو بالا تری''

سری کرشن سے نظیر کو خاص تعلق اور عقیدت تھی، جس کی دو وجوہات سمجھ میں آتی ہیں۔ اول تو نظیر برج کے علاقے میں متمکن تھے۔ آگرہ، متھرا اور نواح کا علاقہ برج دیش کہلاتا ہے جو سری کرشن کے حوالے سے مقدس سمجھا جاتا ہے۔ رادھا، کرشن کی محبتیں، میرا کی عقیدتیں اور جوگ، متھرا اور برسانا کی ہولی اور بسنت، نظیر نے صرف دیکھی سنی ہی نہیں بلکہ جی تھیں۔ صوفی بزرگوں کے یہاں ان اصطلاحات کا جابجا استعمال ہوا ہے۔ کرشن رادھا کی محبت کو محبوب حقیقی کی محبت کی علامت کے طور پر اکثر صوفیانہ شاعری میں پیش کیا گیا ہے۔ بسنت کے تہوار اور سرسوں کے پیلے پھول مرشد کو پیش کرنا اور نظم میں بیان کرنا حضرت امیر خسروؒ کے حوالے سے آج تک روایت کے طور پر درگاہوں میں منایا جاتا ہے۔ زرد کپڑے اور صافے باندھے جاتے ہیں۔ اسی طرح ہولی کے رنگوں کو بھی محبوب حقیقی کی محبت میں رنگنے کی تمنا کے طور پر شعروں میں باندھا گیا ہے۔ حضرت نیاز احمدؒ صاحب کا ہندی کلام اس سلسلے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

ہوری کھیلن شام سے میں چلی برج نگریا
ہاتھ میں تھال عبیر گلال سر پر رنگ کی گگریا

نظیر کی عوامی شاعری یقیناً عوام کی دلچسپیوں کے حوالے سے بھی رہی ہو اور خود ان کی دلبستگیوں کا بھی عکس ہو، اس سے نظیر کے مسلک، متصوفانہ نہج اور تعلق پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ان کی شاعری ساٹھ ستر دہائیوں پر محیط ہے۔ جس میں ہر رنگ شامل ہے۔

سکھی جا کے کہو من موہن کو جیا ترپت تو ہے درشن کو
موہے کل ہے کا کل ناہیں پت کیوں پیا کل تن من برہن کو
(حضرت نیاز احمد بریلوی)

نظیر کہتے ہیں:

موہن مدن گوپال ہری بنس من ہرن
بلہاری ان کے نام پہ میرا یہ تن یہ من
گردھاری نندلال، ہری ناتھ گوردھن
لاکھو کیے بناؤ ہزاروں کیے جتن
ایسا تھا بانسری کے بجیا کا بالپن
کیا کیا کہوں میں کشن کنہیا کا بالپن
ایک روز منہ میں کانھ نے ماکھن چھپا دیا
پوچھا جسودا نے توہیں منہ بنا دیا
منہ کھول تین لوک کا عالم دکھا دیا
اک آن میں دکھا دیا اور پھر بھلا دیا
ایسا تھا بانسری کے بجیا کا بالپن

سری کرشن جی کی شخصیت، ان کا عشق، ان کی بانسری وغیرہ صوفیا کے لیے بھی باعث کشش رہا ہے بلکہ کرشن جی کی بانسری تو اکثر تصوف کی ایک علامت کے طور پر بھی مقبول رہی ہے۔ اکثر صوفیا کے ہندی کلام میں ان کا تذکرہ وجود حق کی تمثیل کے طور پر بھی استعمال ہوا ہے۔

نظیر کی نظموں میں صوفیانہ مضامین متصوفانہ فکر اور قلندرانہ شان کی چند مثالیں پیش ہیں۔

تنہا نہ اسے اپنے دل تنگ میں پہچان
ہر باغ میں ہر دشت میں ہر سنگ میں پہچان
بے رنگ میں بارنگ میں نیرنگ میں پہچان
منزل میں مقامات میں فرسنگ میں پہچان
ہر عزم ارادے میں ہر آہنگ میں پہچان
ہر دھوم میں ہر صلح میں ہر جنگ میں پہچان
ہر آن میں، ہر بات میں، ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان
(توحید۔ خدا کی خدائی)

لے عالم ارواح سے تا عالم جنات
انسان پری حور وملک جن و خبیثات
کیا ابر ہوا، جنگل و کوہ، ارض سمٰوات
اک پھونک میں اڑ جائیں گے جوں نقش طلسمات
ہوشیار نہ پختہ نہ کوئی خام رہے گا
آخر وہی اللہ کا ایک نام رہے گا
(نظم: فنا اور بقا)

ان کے تو جہاں میں عجب عالم ہیں نظیر آہ
اب ایسے تو دنیا میں ولی کم ہیں نظیر آہ
کیا جانے فرشتے ہیں کہ آدم ہیں نظیر آہ
ہر وقت میں ہر آن میں خرم ہیں نظیر آہ
جس ڈھال میں رکھا وہ اسی ڈھال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں
(ہر حال میں خوش رہنا کمال فقر ہے)

قادر، قدیر، خالق و حاکم، حکیم ہے
مالک، ملیک، حیّ و توانا قدیم ہے
دونوں جہاں میں ذات اسی کی کریم ہے
یعنی اسی کا نام غفور الرحیم ہے
غیر از خدا کے کس میں ہے قدرت جو ہاتھ اٹھائے
مقدور کیا کسی کا، وہی دے وہی دلائے
ستار، ذوالجلال، خداوند کردگار
رزاق، کارساز، مددگار، دوست دار
انسان، دیو، جن و پری، فیل و مور و مار
جاری اسی کے ہاتھ سے ہیں سب کے کاروبار
غیر از خدا کے کس میں ہے قدرت جو ہاتھ اٹھائے
مقدور کیا کسی کا، وہی دے، وہی دلائے
(نظم: توکل)

ہوا کے اوپر جو آسماں کا بے چوب خیمہ یہ تن رہا ہے
نہ اس کی میخیں، نہ ہیں طنابیں، نہ اس کے چوبیں ادھر ہوا ہے
ادھر ہے چاند اور اُدھر ہے سورج، ادھر ستارے اُدھر ہوا ہے
کسی کو مطلق خبر نہیں ہے کہ کب بنا ہے اور کیوں بنا ہے
پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا، کروڑوں پنڈت، ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر، خدا کی باتیں خدا ہی جانے
(نظم: خدا کی باتیں خدا ہی جانے)

نظیر کی فارسی شاعری اور صوفیا کے فارسی کلام پر ان کے متعدد خمسہ جات ہیں جو بہ وجہ طوالت شامل نہیں کیے گئے ہیں۔

غرض نظیر کی عوامی شاعری یقیناً عوام کی دلچسپیوں کے حوالے سے بھی رہی ہو اور خود ان کی دلبستگیوں کا بھی عکس ہو، اس سے نظیر کے مسلک، متصوفانہ نہج اور تعلق پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ان کی شاعری ساٹھ ستر دہائیوں پر محیط ہے۔ جس میں ہر رنگ شامل ہے۔ نظیر کے کلام کا بڑا حصہ جو خالق کائنات کی عظمت ورفعت، بے ثباتی دنیا، وعظ و نصیحت آمیز نظموں پر مشتمل ہے، وہ کسی کی فرمائش یا عوامی دلچسپیوں کے حوالے سے نہیں ہے بلکہ یہ کلام نظیر اکبرآبادی کی اصل سوچ، فکر، رجحان اور شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ نظیر قلندر صفت آدمی تھے۔ نہ کسی کی چاکری کی اور نہ کسی امیر، عہدے دار یا جاگیردار کی خوشامد میں قصیدہ لکھا۔ قناعت اور تقویٰ پر عمل پیرا رہے۔ آگرے میں اس وقت امراء، خوش حال جاگیرداروں اور زمین داروں کی کمی نہیں تھی لیکن نظیر کے کسی سوانح یا تذکرے سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ انہوں نے کسی امیر کی بارگاہ میں حاضری دی ہو۔ ان کی حاضر باشی پیروں فقیروں اور صوفیائے وقت کی بارگاہ میں ہی رہی۔ مالی خوشحالی میسر نہیں تھی ۔ لڑکوں کو پڑھاتے تھے۔ کچھ امیروں کے لڑکوں کو درس دینے ان کے گھر بھی جاتے تھے۔ محلّہ تاج گنج سے نائی کی منڈی، ریشم کٹرہ، میوہ کٹرہ وغیرہ اکثر پیدل آتے جاتے تھے۔ اس کے باوجود جب الور کے راجہ نے ایک خطیر رقم دے کر بلایا تو وقتی طور پر ارادہ ڈگمگایا اور وہ روانہ بھی ہو گئے لیکن جیسے ہی تاج محل نظروں سے اوجھل ہوا، سواری واپس کروالی۔ دنیا کے طلبگار یا مال و زر کے محبت سے یہ عمل ممکن نہیں ہے۔

حوالہ جات

گلزار نظیر: عبدالغفور شہباز
گلشن بے خار: قطب الدین باطن
جواہر غیبی: مظفر علی شاہ جعفری الہی اکبرآبادی
آگرہ اور آگرہ والے: علامہ میکش اکبرآبادی

Dr. Naima Jafri Pasha
141, Ground floor,
Pocket-2, Jasola,
New Delhi-110025
Mob.:9911802189
E-mail: naimajafripasha@gmail.com

کامران مارہروی

ظریف الطبع شاعر

طیش مارہروی

طیش مارہروی کا تعلق مارہرہ ضلع ایٹہ کے مشہور و معروف کمبوہ خاندان سے تھا۔ پورا نام محمد یوسف حسن تھا۔ فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ احسن مارہرویؒ کے بیان کے مطابق سنہ ولادت 1870ء کے آس پاس ہے۔ ابتدا میں رعایت اسمی کے لحاظ سے عزیز تخلص رکھتے تھے بعد میں طیش تخلص اختیار کیا۔ مارہرہ کے جملہ تلامذۂ داغ میں سب سے پہلے یہی داغ کی شاگردی سے سرفراز ہوئے۔ مولف تذکرہ خم خانہ جاوید نے آپ کا ذکر یوں فرمایا ہے:

''محمد یوسف حسن مارہروی، شاگرد حضرت داغ مرحوم۔ ابتدائی عمر سے شعر کہتے ہیں۔ پہلے عزیز تخلص تھا، اب طیش ہے۔ ریاست رام پور کے درباری شعرا میں رہ چکے ہیں۔ محاورات و روزمرہ کی طرف زیادہ توجہ فرماتے ہیں۔ شعر مزیدار اور دلنشین کہتے ہیں۔ اپنے استاد کے رنگ کو خوب پہچانتے ہیں۔''

(جلد پنجم صفحہ 455)

طیش اردو و فارسی دونوں زبانوں میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ حافظہ نہایت قوی تھا اور شعرائے متقدمین کے کلام پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں مولوی محمد مہدی اسسٹنٹ مہتمم دفتر تاریخ بھوپال فرماتے ہیں:

''میں نے اپنی عمر میں دو شخصوں کو دیکھا جن کی باتیں سننے سے دل سیر نہیں ہوتا، ایک آغا کمال الدین سنجر، دوسرے حضرت طیش۔ اپنے اور اساتذہ فارس و ہندوستان کے اشعار زیادہ تر مع ردیف و قافیہ اس قدر آپ کی نوک زبان پر ہیں کہ صبح سے شام اور شام سے صبح ہو جائے گی لیکن ذخیرہ ختم نہ ہوگا اور اس بات میں مبالغہ نہیں ہے کہ اگر شعر خوانی کا سلسلہ ایک سال تک رہے تو بھی بحر سخن میں کمی نہ ہوگی۔''

طیش کا شمار اپنے زمانے کے پختہ مشق شعرا میں ہوتا تھا۔ شاعری میں ان کا رنگ کلاسیکی تھا۔ کلام میں بلا کی شوخی اور دلکشی تھی۔ محاورات و روزمرہ کو بڑے سلیقے سے انھوں نے برتا ہے۔ اشعار میں تراکیب کی ندرت اور بیان کی لطافت بدرجہ اتم موجود ہے۔ حسرت موہانی نے اپنے رسالے محاسن سخن میں جابجا طیش کے اشعار بطور سند پیش کیے ہیں۔ طیش کا کلام سادگی و پرکاری، سلاست و روانی کا بہترین مرقع ہے۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

مسکرانا اس کا اور قدموں پہ گر جانا مرا
اس نے یوں مانا اگر کہنا کبھی مانا مرا

جان بھی لیتی ہے عاشق کا تو کس پیار کے ساتھ
شمع آغوش میں لے لیتی ہے پروانے کو

مے کی تعظیم بھی کرتا ہوں دمِ بادہ کشی
پہلے آنکھوں سے لگا لیتا ہوں پیمانے کو

ہم امتحان ترا کر چکے ہیں خوب اے موت
پڑے جو وقت کسی پر کبھی نہ تو آئے

سحر ہوئی کہ خرابات جاگ اُٹھے اِک بار
پکارتے ہوئے میکش سبو سبو آئے

ہم یہی پوچھتے پھرتے ہیں زمانے بھر سے
جن کی تقدیر بگڑ جاتی ہے کیا کرتے ہیں

جانا بھی قیامت ہوا اس غنچہ دہن کا
بو ہو کے اُڑا جاتا ہے سب رنگ چمن کا

یہ جان لیا اُس پہ کوئی حادثہ گزرا
صد کو ہوئی دیر تو ماتھا مرا ٹھنکا

تمنائے ہم آغوشی میں بھی ہم سے سوا نکلے
وہی جو شام سے بیٹھے تھے سرتا پا حیا بن کر

کس تکلف سے لب رنگیں کی چاہی اس نے داد
پہلے دکھلایا گیا لعل بدخشانی مجھے

کوئی تنکا پڑا اڑ کر یہ ہے صیاد کا حیلہ
کھٹکتا ہے ضرور آنکھوں میں اُسکی آشیاں کوئی

شب فرقت بھی جو سامان قضا کا نہ ہوا
بولی سر پیٹ کے تقدیر کہ اچھا نہ ہوا

فیصلہ کر گئے جب سے ترے ناوک آکر
جگر و دل میں پھر اُس روز سے جھگڑا نہ ہوا

طیش کی لاش چھپائی گئی یوں راتوں رات
شہر بھر میں کہیں اس قتل کا چرچا نہ ہوا

شعر کہنے کی طرح طیش کے پڑھنے کا انداز بھی اچھوتا تھا۔ اس پر مولوی صاحب مذکور یوں رقم طراز ہیں:

''آپ کا طرز شعر خوانی اس قدر دل پسند ہے کہ شعر سے زیادہ آپ کے پڑھنے میں لطف آتا ہے شبلی مرحوم کہا کرتے تھے کہ شعر کو سب سے اچھا پڑھنے والا میں نے اپنی مدت العمر میں ایک تو مسز سروجنی نائیڈو کو

دیکھا دوسرے یوسف حسن طپش کو۔''[3]

طپش 1909 میں بعہد نواب حامد علی خاں دربار رامپور سے وابستہ ہوئے اور نواب صاحب کے زمرۂ مصاحبین میں جگہ پائی۔ اپنی طبع رسا اور خداداد شعری و علمی صلاحیت کے جوہر دکھا کر کچھ ہی عرصے میں نواب صاحب والی رام پور و دیگر مقربین دربار پر ایک رنگ چڑھانے میں کامیاب رہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ دوسرے درباری شعرا اور مصاحبوں کی صورت میں انھوں نے اپنے حریف بھی پیدا کر لیے جن سے ان کی خوب چشمک رہا کرتی تھی۔ ان میں منشی حیات بخش رسا کا نام قابل ذکر ہے۔

طپش کے متعدد خطوط راقم الحروف کے پاس محفوظ ہیں جن سے ان چشمکوں اور چھیڑ چھاڑ کا حال بخوبی معلوم ہوتا ہے۔ طپش نے یہ خطوط مولانا احسن مارہروی کو رامپور سے لکھے تھے جو تا حال غیر مطبوعہ ہیں۔ ان خطوط کی زبان برجستہ اور طرز بیان از حد دلکش ہے۔ طپش کے متعلق لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ ان کے سینے میں لطائف و ظرائف کا ایک سیل رواں تھا۔ اور ان کا یہ وصفِ خاص ان کے خطوط سے خوب جھلکتا ہے۔ دلچسپ واقعات کا بیان اور اس پر طپش کی ظرافتِ طبع، بزلہ سنجی اور لطیفہ گوئی نے ان میں ایک خاص لطف پیدا کر دیا ہے۔

ذیل میں بطور نمونہ چند خطوط پیش کیے جاتے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

رامپور 7 جون

مخدومِ طپش رنجور

آداب نیاز۔ سخت وحشت اور پریشانی تھی کہ آپ نے اپنی خیریت سے کیوں نہ مطلع فرمایا۔ خط لکھنے کے تہیہ میں تھا کہ پرسوں حافظ جی نے خط دیا جس سے تسکین ہوئی۔ اگر میرے خط میں دیر ہوا کرے گی تو محض عدیم الفرصتی کی وجہ سے۔ حتی الامکان جلد ہی جواب دے دیا کروں گا۔ وہی اوقات ہیں۔ تمام دن سونا تمام رات جاگنا۔

پرسوں اپنے حریف[4] کو ایسا چاروں شانے چت پچھاڑا کہ سب ہڈیاں پسلیاں چور چور ہو گئیں۔ دو نظمیں ایسی تڑپتی ہوئی پڑھیں کہ سب پھڑک گئے۔ اب تک میں نے حجاب نہ اٹھایا تھا اور بدایوں کا للا بنا ہوا تھا۔ اس دن جوہر دکھا دیے اور ظاہر کر دیا کہ طپش کیا چیز ہے۔ بعد نظموں کے ایسی چلی ایسی چلی کہ توبہ بھلی ہے۔ مردود کھسیا گیا اور سخت بدحواس ہو گیا۔ میں داد سے لاد دیا گیا۔ اس کی ہیچ مدانی اور ہرزہ سرائی کھل گئی غرض ثابت ہو گیا کہ وہ پاجی ایک مضمحل اور دبلی چیل ہے اور طپش ایک شہزور شہباز۔ بڑی داستان ہے کہاں تک لکھوں، زبانی اس معرکہ کا حال بیان کروں گا۔۔۔۔۔

طپش

طپش کے بیشتر خطوط میں وقائع نگاری کا عنصر نمایاں ہے، ان مکاتیب میں انہوں نے دربار رامپور کی شعری محافل کا احوال بالتصریح بیان کیا ہے۔ ایک طویل خط جو 1910 کا مرقومہ ہے، ملاحظہ ہو:

مخدوم طپش۔ آداب نیاز۔ عجب اتفاق ہوا کہ میں نے پہلے کارڈ کے جواب کا انتظار ختم نہ ہونے دیا کہ آج دوسرا کارڈ ڈاک میں چھوڑ وایا۔ لڑکا ابھی واپس نہ ہوا تھا کہ آپ کا کارڈ نمودار ہوا۔ ہاں ہاں شاداں آپ سے رنجیدہ اور منشی صاحب بے لطف ہیں۔ سب زبانی عرض کروں گا۔ آپ کا یہ لکھنا کہ تو نے جو لکھا بجا لکھا صریح حریف کی طرف داری پر دال ہے۔ مجھے تو خیال تھا کہ آپ کا دل اس نامعقول نوٹ کو پڑھ کر ضرور گرما گیا ہوگا۔ لیکن دیکھا تو ٹھنڈا پڑا ہے۔ آپ کا اس معاملے میں چاپ چاپ کر گفتگو کرنا اور دھیمی آواز میں مجھے تسلی دینا بس یہی قیامت ہے۔ کیا اس نوٹ سے آپ کی اور جملہ شاگردان داغ کی توہین ثابت نہیں ہوتی، گویا آپ کی خاموشی پکار رہی ہے کہ بیشک ہم سب کی غزلیں ہذیان اور خرافات تھیں اور لاجواب غزل رسا کی تھی اگر آپ کو کسی طرح اس میں حصہ لینا منظور نہیں اور آپ ایسے ہی حریف سے دبے ہوئے ہیں تو عزیزی محمد امین[5] کی طرح میاں افتخار عالم صاحب[6] ہی کو گدگدایے کیونکہ وہ ہمیشہ سے حریف کے مداح ہی ہیں۔ ان کو بھی کل پرچے جلوہ یار کے ملاحظہ کرایے اور انصاف کی درخواست کیجیے اگر وہ میرے غلبے کو تسلیم کر لیں تو اپنے دل ہی تک نہ رکھیں پبلک میں حقیقت نفس الامری ظاہر کریں۔

ناظم علی ہجر بھی بدمعاش اور شہدا نکلا، اس کو حریف نے 8 (آٹھ آنے) بھیجے۔ اپنے پرچے[7] میں خصوصیت سے حریف کی تعریف لکھ دی آپ نے ملاحظہ کی ہوگی۔ چالاکی تو دیکھیے کہ مجھے پرچہ نہ بھیجا اور سب کو بھیجا۔ مجھے ایک کارڈ دیا اور غزل مانگی۔

میں نے کل اس کو لکھ دیا تیری شکل گھگو کی سی، یا الو کی سی، یا تو بن مانس ہے۔ میں نے اس کو دغا باز مکار سالوس اور منافق بھی لکھا، یہ بھی لکھا کہ تو نے بے شک بدایوں میں اس عدیم الفرصتی کی حالت میں حریف سے (منہ کالا کرایا)۔

اب آپ جلوہ یار اور اس پاجی ہجر سے قطع تعلق کریں اور تبادلہ موقوف کریں اور غزل دینا یک لخت چھوڑ دیں اور جتا دیں کہ ہم طپش کے مربی اور طرفدار ہیں۔ اور نوح[8] کو بھی آپ لکھیں کہ دونوں پاجیوں کو غزل نہ دیا کریں اور علاوہ اس کے شاگردان داغ میں ایک جوش پیدا کریں لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ آپ ایسا نہ کریں گے۔ اور کچھ نہ کریں گے مگر مجھے تو ہر طرح آپ کو کھولنا اور دکھانا ہے کہ آپ حاسد کے طرفدار ہیں۔

دونوں غزلیں مرسل ہیں۔ دم نہیں[9]۔ اس میں رسا کی غزل سراسر ہذیان ہے۔ امیر احمد سے آپ منگوا سکتے ہیں ضرور منگوایئے۔ میری حسرت نکلجائے گی۔

ملیح آباد کا گو مصمم قصد نہیں تاہم ضعیف سا ارادہ تو ہے ہی۔ اس صورت میں بھی آپ مجھے طلب فرمالیں، میں بخوشی حاضر ہو سکتا ہوں کیونکہ آج کل سرکار والا پہاڑ پر ہیں۔ دس پندرہ دن مارہرہ رہ کر آپ کے ہمراہ چلا چلوں گا۔ مارہرہ میں یہ دن تفریح اور لطف میں گزریں گے۔ مجھے حسرت ہے کہ کبھی اتنا لمبا سفر آپ کے ہمراہ کروں، واللہ آپ کو بھی لطف آ جائے گا۔ ایک ہفتہ لکھنؤ رہیں گے۔ حضرت دلیر[10] سے بھی چھیڑ چھاڑ شروع کر دیجیے اگر آپ چاہیں گے اور مجبور کریں گے تو بے شک وہ اٹھ کھڑے ہوں گے، اگر آپ ہی نے ڈھیل ڈالی تو کچھ نہ ہوگا۔

یہ آپ نے کیا غضب کیا کہ عزیزی محمد امین صاحب کو صرف جلوۂ یار میں مقابلتہً دونوں کا کلام دکھا دیا۔ خدا کے واسطے آپ ابھی ابھی فریقین کی غزلیں کسی سے نقل کرا کے ان کے حوالے کیجیے۔ جب ان کے پاس اسلحہ نہ ہوں گے تو وہ کیا خاک پڑھیں گے۔ لیکن شاید یہ بھی آپ سے مشکل سے بن پڑے اس لیے کہ لگی تو میرے دل کو ہے اور آپ کا دل صبر و سکون کی حالت میں پڑا ہے۔

اب میں یہاں زبردست پوائنٹ دیتا ہوں جس کے بل پر وہ مضمون لکھ سکیں واضح ہو کے حاسد کو منیر کا یہ مطلع از بس پسند ہے اور احباب میں پڑھا بھی کرتے ہیں مطلع

کیا کروں جامہ دری بے سر و ساماں ہوں میں
شرم آئے تو کہاں سر بگریباں ہوں میں

اس کی خرابی یوں لگائی اور سرقہ کرنا بھی نہ آیا۔

میں کہاں سر در گریباں ہوں گریباں ہی نہیں
منفعل ہو کر بھی ہوتی ہے پشیمانی مجھے

کیوں پھبتا ہے یا نہیں۔ میرا ایک شعر محبوب الکلام میں سات برس ہوئے کہ چھپ چکا ہے اس کا اس طرح ستیاناس کیا۔

یہ بھول ہوئی ساقی ہم منہ سے لگا بیٹھے
آنکھوں سے لگانا تھا پیمانے کو کیا کہیے 11

میرا شعر یہ تھا۔

مے کی تعظیم بھی کرتا ہوں تو دم بادہ کشی
پہلے آنکھوں سے لگا لیتا ہوں پیمانے کو

داغ کا ایک شعر ہے۔

محو آرائش و زینت ہی رہے آٹھ پہر
تجھ کو اللہ کرے فرصت بیداد نہ ہو

اس کا یہ حال بنایا۔

ہم کو غرض کہ فرصتِ بیداد دیں تمھیں
آئینہ کیوں ہٹائیں تیرے روبرو سے ہم

اس کے علاوہ ایک غضب اور بھی دیکھا۔ حال کے جلوۂ یار میں ایک مصرع بحر سے خارج ہے۔ تعجب ہے کہ آپ کی نگاہ نہیں پڑی۔ فرماتے ہیں۔

خودی ہو کس طرح ہم میکشوں میں اے زاہد
ذرا سی اور چڑھا لی جو بے خودی نہ رہی

اور لیجیے۔

رسا کا پاؤں جمتا گر نہ ایسا ناتواں ہوتا
یہ ظالم وہ خدائی خوار ہے جانے کہاں ہوتا

خدا جانے جانے کہاں کی زبان ہے۔ پبلک میں پیش کرنے کے قابل ضروری واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ ہوم صاحب بہادر کے دربار میں بڑے بڑے عمائد اور سخندان جمع تھے۔ میں نے ایک خاص بات پر چیخ چیخ کر نہایت غیظ کی حالت میں حریف سے مخاطب ہو کر کہا کہ جس زمین میں آپ بدایوں میں غزل پڑھ آئے ہیں اس میں نصاب، التہاب، مہاب قافیہ تھے، جو لوگوں نے پڑھے تھے آپ ان کے معنی بتائیے اور کریمہ کا یہ شعر پڑھا۔

یکے بر حصیر و یکے برسریر
یکے در پلاس و یکے در حریر

اور اس کے بھی معنی پوچھے، یہ بھی کہا کہ صرف حصیر اور پلاس ہی کے معنی بتائیے اگر بتا دیے تو میں خود ایک سیاہ لنگڑے گدھے پر سوار ہو کر تمام شہر میں گشت کر کے رام پور کو چھوڑ دوں گا ورنہ تمہارا حال ایسا بنایا جائے گا اور قسم دلائی کہ معنی بتانے میں کچھ اٹھا نہ رکھنا۔ تمام جلسہ دنگ اور انگشت بدنداں تھا۔ بس چہرہ فق ہو گیا اور نرمی سے یہی جواب دیا کہ اب تو آپ کے بھی دل کی بھڑاس نکل گئی اب تو مجھ کو بھی سب کچھ کہہ لیا۔ میں آپ سے بہت کم ہوں اور اپنے عجز کو تسلیم کرتا ہوں۔ مجھے آپ سے کب دعوائے ہمسری ہے۔ اس کے بعد میں نے ہوم صاحب بہادر سے عرض کیا کہ روزانہ ایک طرح عطا ہوا کرے اور دونوں کو حکم ہو۔ چند روز میں حال کھل جائے گا۔ ظاہر ہے کہ حریف کی یہ کسر نفسی نہ تھی بلکہ عجز تھا اگر معنی معلوم ہوتے تو زنہار کسر نہ اٹھا رکھی جاتی۔ محمد امین صاحب کو یہ سب حوالے کر دیجیے اور غزلیں ضرور نقل کرا کے ان کو دینا چاہیے۔

(اگر آپ نے ہجر اور جلوہ یار کو غزل دی اور نوح وغیرہ کو برگشتہ نہ کیا تو میں یقیناً زہر کھا لوں گا اور پھر یہ منحوس شکل نہ دکھاؤں گا)

طیش۔ رامپور
مئی 1910

ایک غلغلہ بلند ہو رہا ہے کہ مارہرہ میں طاعون۔ طاعون۔ اب لکھیے کہ اس کی کہاں تک اصلیت ہے۔ بدایوں سے واپس آ کر میں نے آپ کے خط کا انتظار کیا، اب تھک کر سبقت کرتا ہوں۔ عیسیٰ قم سے جلاتے تھے اور آپ نے ڈھائی روپیہ دے کر جلا دیا۔ واللہ سخت ضرورت مند تھا اور یہی تمنا لے گئی تھی۔ حیران ہوں کہ اس کا شکریہ کس طرح ادا کروں۔ اسی طرح مجھے خوش رکھنا چاہیے تا کہ ہر انجمن میں مدح گستر رہوں۔ کیونکہ میرے پاس زبان ہی ہے۔ دلیر میاں نے بھی بڑی ذرہ نوازی فرمائی شکریہ ادا کیجیے۔ اب میں آپ سے ایسا خوش ہوں کہ اگر روس آپ کا مخالف بن جائے تو بلا تکلف فوراً اس سے بھڑ جاؤں۔ اگر جاپان آنکھ اٹھا کر دیکھے تو دونوں آنکھیں نکال لوں۔ قسم قرآن کی اب آپ کے کلام میں ایک کیفیت پیدا ہو گئی ہے جس کا احساس شاید آپ کو نہیں۔ اب ایک کام کیجیے، کلام کا کل ذخیرہ نکال لیے اور کسی کھلاڑی کو سنانا شروع کیجیے اور گہرا انتخاب ہو۔ بس عطر کھینچ لیجیے، باقی کو تلف کیجیے۔ پھر دیوان چھپوا دیجیے۔ لاجواب نسخہ ہوگا۔ مگر میرے سوا اس کام کے شایان آپ کس کو خیال فرما سکتے ہیں۔ ہر پھر کر احقر ہی پر نظر پڑے گی۔ میرے اور حریف کے متعلق آپ کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ جلوہ یار میں پیدا نہ ہوا۔ غزل ملاحظہ فرمائیے میاں آزاد کو مقابلۃً کلام دکھائیے۔ اور ان کے دل سے اس کی وقعت دور کیجیے۔ اب مجھے کب بلائیں گے۔ تڑپ رہا ہوں۔

طیش

رام پور میں اس زمانے میں ایک انگریز خاتون فلورا (Miss Mary Flora) نامی اقامت پذیر تھیں۔ شاعری سے بھی شغف تھا اور شریر تخلص کیا کرتی تھیں۔ آسی لدنی نے اپنی کتاب ''تذکرۃ الخواتین'' میں ان کا ذکر فرمایا ہے۔ کثرت شراب نوشی کے سبب کم عمری ہی میں فوت ہوئیں۔ عمائدین اور شعرا کی توجہ کا مرکز رہیں۔ رامپور میں ان کے ہونے سے مقامی شعرا کے مابین چھیڑ چھاڑ کی ایک فضا ہموار ہو چلی تھی نتیجتاً ہزلیات کا بازار بھی گرم تھا جس کا محور بھی اکثر یہی رہا کرتی تھیں۔

اسی ضمن میں طیش کے ایک خط کا اقتباس درج ذیل ہے جس میں مس فلورا اور ان کے معاشقے کا احوال مذکور ہے، ملاحظہ ہو۔

رام پور اسٹیٹ بازار، ملا ظریف 10 مارچ 1913
معظم و محتشم زاد لطفکم۔

آداب نیاز۔ خیال فرمایا ہوگا کہ طیش روپیوں کے لیے بے قرار تھا۔ اب منی آڈر پہنچ گیا۔ وصول کر کے بیٹھ رہا۔

لاحول ولا۔ میں جیسا نیازمند اور ادنیٰ خادم ہوں۔ آپ پر بھی ظاہر ہے۔ جب تک رام پور میں رہوں گا اس خیال سے ضرور بے قرار رہوں گا کہ آپ یہاں نہیں۔ میں کیا کروں موقع ہر وقت ایسے پیش نظر رہتے ہیں جس سے تڑپ کر رہ جاتا ہوں۔ کیا کہوں کہ آپ کس قدر یاد آ جاتے ہیں۔ کوئی لغت میرے پاس ہو تو روپیوں کے شکریہ کے لیے الفاظ تلاش کروں۔ خدا کی قسم بڑا لطف فرمایا۔ بہت ممنون فرمایا۔ اس نوازش کو نہ بھولوں گا۔ اب یہاں کے حالات جو آپ پر مجہول ہیں بیان کرتا ہوں۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی تھا کہ بزم اور فلورا دونوں ۔۔۔۔ گئے تھے لیکن جس تاریخ سے فلورا جدا ہوئی تھی اسی دن سے محمد حسین گویا اور حضرت رسا اس کی جستجو میں سرگرم تھے اور اس کی کسی کو خبر نہ تھی۔ بار بار سفر سے واپس آ آ کر پان پان سوچہ چہ سو لے جاتے تھے۔

اور یہی کہتے تھے کہ ہم اب لائے، آخر ایک مرتبہ لائے۔ صرف دو روز رہنے پائی تھی کہ میر علی رضا مہتمم پاندان خانہ و امام باڑہ وغیرہ اسے لے اڑے۔ خدا جانے ان سے کب کی گھٹی ہوئی تھی کسی کو نہ معلوم تھا، اور علی رضا نے بھوپال جا کر اس سے نکاح کر لیا اور ریاست کو خط لکھ بھیجا۔ ریاست مولوی صاحب کے خلاف ہوگئی اور فلورا کے اڑا لانے میں زیادہ جد وجہد شروع ہوگئی۔ آخر رسا اور محمد حسین گویا جو اس کام پر مدت سے تعینات تھے دونوں شاہجہاں پور جا کر ناظم علی خاں ہجر سے ملے اور کہا کہ آپ بھوپال سے اس کو اڑا لائیں آپ کے حق میں بہت کچھ ہوگا۔ چنانچہ ہجر صاحب بھوپال برابر آتے جاتے رہے اور آخر 17 جنوری کو یہاں لے آئے۔ ہجر صاحب بھی ہمراہ آئے اور اب تک امید وارانہ رسا کے مکان پر مقیم ہیں۔ دیکھیے ان کے حق میں کیا ہوتا ہے۔ بزم کی اور فلورا کی تنخواہ کھل گئی، اب تک سرکاری مکان میں سب مقیم ہیں۔ فلورا یہاں حاملہ آئی اور صبح و شام میں بچہ ہونے والا تھا لیکن پندرہ بیس دن کے بعد لڑکا پیدا ہوا اور دو روز جی کر مر گیا۔ اب میر علی رضا ٹامک ٹوئی مارتے پھرتے ہیں اور کچھ بتاتے نہیں ہیں۔

بے نظیر شاہ صاحب بحصول رخصت چھ ماہ وطن گئے ہوئے تھے۔ حال میں آئے ہیں اور حضرت رسا ہی کے مکان پر وہ بھی مقیم ہیں۔ ہجر صاحب کا خوان جاری ہے اور سواری بھی مقرر ہے۔ میں بھی کبھی ہو آتا ہوں۔ حضرت رسا کی علالت تو دائمی ہے لیکن اب حالت زیادہ نازک ہوگئی ہے۔ پاؤں پر ورم بھی آگیا ہے چلنے پھرنے سے معذور، علاج کے نام سے نفرت، ڈاکٹر یا حکیم کو فیس کے خوف سے نہیں بلاتے اور ڈولی میں خود یوں نہیں جاتے کہ ڈولی کے کرایہ کا صدمہ کون اٹھائے گا۔ بہر حال ان کا حال اچھا نہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ وہ یہ نہیں جانتے کہ میری حالت کس قدر سقیم ہے۔ خیر وہ جانے ان کا کام جانے۔ ہمیں کیا۔

روزانہ شب کو جناب شوق صاحب ہی سے بات چیت رہتی ہے آپ کی محبت و اخلاق کے بڑے مداح اور مشکور ہیں مگر آدمی نرے اول جلول ہیں۔

فلورا کے آجانے سے نظموں کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا ہے۔ ہم لوگوں کی بات چیت کا ذریعہ اور دربار تک رسائی ہوجانے کا وسیلہ بس یہی کلام ہے۔ اسی میں ترقی بھی ہوجاتی ہے اور ہو بھی چکی ہے۔ اگر آپ اس موقع پر چند غزلیں کہہ کر روانہ کریں گے تو میں جی جاؤں گا۔ میں برابر فکر سخن میں مصروف ہوں اپنے امکان بھر کوشش کرتا ہوں اور بہت کہتا ہوں، تاہم جتنی ضرورت ہے اس سے بہت کم کہتا ہوں، اگر اس مرتبہ آپ نے مدد دے دی تو گویا ایک سلطنت بخش دی۔ حضرت دلیر کو بھی شامل کر دیجیے، فکر بٹ جائے گی تو آسانی ہوجائے گی۔ اب خمسوں کی قید نہیں رہی صرف غزل۔ میں خیال کرتا ہوں کہ آپ ایک منٹ میں ایک غزل تیار کر سکتے ہیں، ماشاءاللہ طبیعت میں دریا سے زیادہ روانی ہے۔ طرح کے چار مصرعے پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ایک ہفتے میں غزلیں بھیج کر سرفراز فرمایا جائے گا۔ یہ واضح رہے کہ فلورا کا نام اصلی ہی ہے اور اشعار میں برابر باندھا جاتا ہے۔ مولوی علی رضا پر بھی تبرے ہوتے ہیں۔

مصرع ہائے طرح۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ 12

اب سوائے فلورا کے اور کسی کے متعلق نظم نہ ہوگی، سب بوچھار اسی پر ہے۔ کہیں کہیں۔۔۔۔ کو بھی یاد کر لیا جائے۔ علی رضا سے عقد کرنا اور زچہ خانہ۔ اور بچہ جننا۔ یہ سبجیکٹ خوب ہے۔ گویا میدان وسیع ہوگیا۔ اور چار شعر صرف اس زمین میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔

یہ زمین استاد کی ہے ضرورت آپڑی ہے۔ صرف چار شعر عمدہ کہہ کر بھیج دیجیے۔ اس کے علاوہ دو ایک زمینیں چلتی ہوئی آپ خود تجویز فرمالیں۔ جب تک غزلیں آئیں گی میں بے چین رہوں گا، اس لیے عرض ہے کہ اس عریضہ کی رسید میں بواپسی ایک کارڈ روانہ فرما کر ممنون فرمائیں۔

یوسف حسن طپش

طپش کا کلام اپنے زمانے کے موقر رسائل و جرائد میں شائع ہوا۔ ان میں ریاض سخن (مارہرہ)، نیرنگ رامپور، تصویر مشاعرہ (رامپور)، کمال دہلی (دہلی)، فصیح الملک (مارہرہ)، جلوہ یار (میرٹھ)، محبوب الکلام (دکن)، گلدستہ نسیم سخن (قنوج)، اردوئے معلیٰ (علی گڑھ)، زمانہ (کانپور)، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ان کی یاد میں ایک مجموعہ بنام ''حدیقہ نعت'' موجود ہے جس میں حضرت محسن کاکوروی کے مشہور زمانہ نعتیہ قصیدہ 'نظم دل افروز' پر تضامین شامل ہیں، دیگر مشاہیر کے کلام پر اور خود طپش کے کلام پر بعض شعرا نے جو تضمینیں کہیں وہ بھی شامل کتاب ہیں۔ طپش نے غزل کے علاوہ مرثیہ وسلام میں بھی طبع آزمائی کی لیکن افسوس اس کا کوئی نمونہ دستیاب نہ ہو سکا ان کی مرثیہ گوئی پر قدرت کا اندازہ اس سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت محسن کاکوروی اپنے ایک مکتوب بنام احسن مارہروی میں لکھتے ہیں

''میں نے اس لڑکے میں وہی صلاحیت پائی جو مرزا دبیر اور انیس میں تھی''۔ 13

طپش صاحب اولاد تھے اور انہوں نے تین بیٹے اپنی یادگار چھوڑے۔ ان کے تینوں بیٹے شاعری کا مذاق رکھتے تھے اور فن شعر میں اپنے والد ہی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ طپش کے بڑے بیٹے کا نام محمد اشتیاق حسن تھا اور افسر تخلص۔ خلف اوسط محمد مشتاق حسن شریر اور چھوٹے بیٹے محمد محبوب حسن تھے جو وارث تخلص کیا کرتے تھے۔ محبوب حسن وارث نے بعد میں احسن سنبھلی سے سلسلہ تلمذ استوار کیا۔ وارث کا کلام رسالہ زمانہ (کانپور) میں خصوصیت سے شائع ہوا کرتا تھا۔ وہ کانپور کی ایک ادبی انجمن موسوم حلقہ ادبیہ کے فعال رکن بھی رہے۔

طپش مارہروی کے اشعار رواں اور زبان پر چڑھنے والے ہوتے تھے۔ معروف شعرا کے بعض مشہور زمانہ اشعار ایسے بھی دیکھنے میں آتے ہیں جو اپنے مضمون یا خیال کے اعتبار سے طپش کے بعض شعروں سے مناسبت رکھتے ہیں، بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ طپش ہی کے شعروں سے استفادے کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ ذیل میں صرف دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

وہ شہرۂ آفاق شعر جسے عام طور پر میر سے منسوب کیا جاتا ہے یعنی۔

وہ آئے بزم میں اتنا تو میر نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

اس شعر کی بابت یہ امر محقق ہے کہ یہ شعر میر کا نہیں، اس شعر کے متعلق اکثر شہادتیں فکر رامپوری کے حق میں ہیں۔ یہ شعر فکر کی ایک غزل کا مقطع بتلایا جاتا ہے جو اس طرح ہے۔

وہ آئے بزم میں اتنا تو فکر نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

طپش کی ایک غزل جو اسی زمین میں ہے مارچ واپریل 1910 کے جلوۂ یار میں شائع ہوئی ہے۔ جلوہ یار ایک ماہوار گلدستہ تھا جس میں شعرا کا بیشتر طرحی کلام شائع ہوتا تھا، اس گلدستے کو نواب رام پور کی سرپرستی

حاصل تھی اور شعرائے رامپور کا کلام اس میں خصوصیت سے شائع ہوا کرتا تھا۔ مذکورہ شمارے کے لیے مصرع طرح یہ تھا۔

خیال یار رہا دل میں بیکسی نہ رہی

طیش کی غزل 26 اشعار پر مشتمل ہے، مطلع اور چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

غضب ہے گر ترے خنجر کی دل لگی نہ رہی
ہماری جان کا کیا ہے رہی رہی نہ رہی
ہزار بار یہ دیکھا کہ ان کے چہرے سے
نظر جو ہٹ گئی آنکھوں میں روشنی نہ رہی
ہزار نقش کفِ پائے غیر دیکھے ہیں
ہمارے سجدوں کے قابل تری گلی نہ رہی

اس طرح میں متعدد شعرا نے طبع آزمائی فرمائی ہے لیکن صرف تین شعرا نے روشنی کا قافیہ باندھا ہے اور ان تین میں بھی صرف طیش نے ''چراغوں میں روشنی'' کا مضمون ادا کیا ہے۔ طیش کا شعر یہ ہے۔

بیان تیرگی شام ہجر۔ تابہ کجا
خلاصہ یہ کہ چراغوں میں روشنی نہ رہی

قارئین ملاحظہ فرمائیں کہ طیش کے مصرع ثانی میں کس قدر روانی اور سلاست ہے۔

فراق گورکھپوری کا ایک مشہور شعر ہے۔

کھو دیا تم کو تو ہم پوچھتے پھرتے ہیں یہی
جس کی تقدیر بگڑ جائے وہ کرتا کیا ہے

طیش کی ایک غزل جو نومبر 1909 کے جلوہ یار میں شائع ہوئی اس کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیں۔

ہم یہی پوچھتے پھرتے ہیں زمانے بھر سے
جن کی تقدیر بگڑ جاتی ہے کیا کرتے ہیں

سطور بالا سے ظاہر ہے کہ ان اشعار میں مذکورہ مضمون اور خیال کو برتنے میں طیش ہی نے مسابقت کی ہے۔

طیش ایک قادر الکلام اور پختہ گو شاعر تھے۔ ان کے کلام میں بلاشک وہ تمام ترفنی محاسن موجود ہیں جو ایک اچھی شاعری کا لوازمہ تصور کیے جاتے ہیں، لیکن ان کو وہ شہرت حاصل نہ ہوسکی جو ان کے بعض خواجہ تاش اور دیگر ہمعصر شعرا کے حصے میں آئی۔ شعرائے رامپور یا دربار رامپور سے متعلق جو تذکرے ابھی تک منظر عام پر آ چکے ہیں ان میں بھی طیش کا ذکر نہیں ملتا اور اگر کہیں ملتا بھی ہے تو برائے نام۔

ایسے میں ضرورت اس امر کی ہے کہ اردو والے اپنے ان باکمالوں کو بھی یاد کرتے رہیں جن کو اب قریب قریب بھلا دیا جا چکا ہے۔

آخر میں طیش مارہروی کے کلام کا انتخاب ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

غزل

میں ہاتھ اٹھا دوں تو یہ ساماں نظر آئے
خود دوڑ کے آغوش دعا میں اثر آئے
مجھ تک ہی شرارت سے نہ یہ فتنہ گر آئے
ہاں تیر تمہارے ادھر آئے ادھر آئے
کچھ دیر کہیں حال طبیعت کا کسی سے
کچھ دیر کو قابو میں طبیعت اگر آئے
میں ہوش میں آیا تو وہ بولے شب وعدہ
ہم آپ کے آنے سے یہاں پیشتر آئے
اپنی بھی تو صورت پہ تمہارا ہی گماں ہے
آئینہ جو دیکھا تو تمھیں تم نظر آئے
یہ خیر ہے چھپ جاتے ہیں دکھلا کے وہ جلوہ
عاشق تو حواسوں میں نہ دو دو پہر آئے
وہ روٹھ کے بیٹھے ہیں مجھے دیکے یہ دھمکی
جو آئے مرے پاس سمجھ سوچ کر آئے
کی خوف زدہ ہوکے جو فریاد کسی نے
نالے مرے افلاک پہ چڑھ کر اتر آئے
اس نے بھی اسی وقت چنی مانگ میں افشاں
جب کاہکشاں میں اسے تارے نظر آئے
کیا کرتے ہیں اغیار طواف اس کے مکاں کا
چکر مجھے اے طیش یہ کیوں رات بھر آئے

(ماخوذ از کمال دہلی ستمبر 1909)

غزل

نہ کہہ کہ مجھ پہ ترا اختیار کیا ہوگا
جو تو ہی کرنے لگا مجھ کو پیار کیا ہوگا
ادھر کبھی ہوئی تو اس طرف خفا قاتل
ہمارا فیصلہ اے جان زار کیا ہوگا
یہاں تو اٹھ نہ رہی کچھ کسر ہمارے ساتھ
یہ دیکھنا ہے کہ زیر مزار کیا ہوگا
گلے میں ڈال لو باہیں مری تو لطف آئے
گلے میں ڈال کے پھولوں کا ہار کیا ہوگا
کرے گا ہجو جو ممبر پہ مے کی او زاہد
لپٹ پڑے جو تجھے بادہ خوار کیا ہوگا
یہ سوز دل کی ہے چنگاریوں سے خوف مجھے
اڑے نکل کے اگر یہ شرار کیا ہوگا
شباب لائیں کہاں سے کہ پھر مریں تم پر
یہ ایک بار ہوا بار بار کیا ہوگا
مری فغاں سے پڑی ہے فلک پہ اک ہلچل
فرشتے کہتے ہیں پروردگار کیا ہوگا
مرے گناہ تو ہیں بے شمار اے زاہد
شمار ان کا بروز شمار کیا ہوگا
کہے گا دابنے کو پاؤں کوئی کیوں ہم سے
کسی کو ہم پہ بھلا اعتبار کیا ہوگا
حیا و شرم سے جکڑے ہوں دست و پا جس کے
وہ کھل کے وصل کی شب ہمکنار کیا ہوگا
ستم اٹھائے عدو کے بڑی متانت سے
تمہاری طرح کوئی بردبار کیا ہوگا
یہ مجھ سے پوچھتی ہے بار بار حسرت وصل
نہ آئے وہ تو شب انتظار کیا ہوگا
مکاں سجایا ہے اے طیش کس لیے تو نے
بتا تو آج ترے گھر میں یار کیا ہوگا

(ماخوذ از گلدستہ جلوۂ یار بابت ماہ ستمبر 1909)

حواشی

1 اردوئے معلی علی گڑھ بابت اپریل 1913
2 حدیقۂ نعت مصنفہ طیش مارہروی مطبوعہ 1922
3 ایضاً
4 منشی حیات بخش رسا شاعر دربار رامپور۔
5 قرین قیاس ہے کہ منشی محمد امین زبیری مارہروی مراد ہیں۔
6 سید افتخار عالم آزاد مارہروی مصنف حیات النذیر متوفی 1924۔
7 اس رسالے کا نام زبان اردو تھا، ناظم علی خاں ہجر شاہجہاں پوری متوفی 20 جون 1914 کی ادارت میں شاہجہاں پور سے نکلتا تھا۔
8 نوح ناروی۔
9 یہ طرح مشاعرہ کانفرنس بدایوں منعقدہ 1910 کی ہے۔
10 سید امیر حسن دلیر مارہروی شاگرد داغ متوفی 1958۔
11 اس زمین میں رسا و طیش کی غزلیں 1909 کے تصویر مشاعرہ میں چھپی تھیں۔
12 شوق قدوائی۔
13 ''تخمیس'' یعنی تضمین نظم دل افروز مصنفہ احسن مارہروی مطبوعہ علی گڑھ۔

■

Mr. Syed Kamran Ali
Maulvi Tola,
Near-Jama Masjid Shamsi
Badaun (U.P)
Mob.:8265813657
E-mail: syedkamranali739@gmail.com

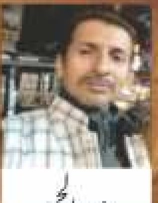

عبدالحی

رضا نقوی واہی

اب جا رہا ہوں یاس کی دنیا لیے ہوئے

اردو میں طنز و مزاح کی روایت زبان کے ارتقا کے ساتھ ہی نمو پانے لگی تھی۔ ولی دکنی اور جعفر زٹلی کے کلام میں مزاح نظر آجاتا ہے۔ جعفر زٹلی کے یہاں مزاح نے فحش گوئی کی صورت اختیار کرلی تھی لیکن ان کی شاعری میں طنز اس قدر بھرا ہوا ہے کہ اس میں نشتریت اور زہرناکی کے عناصر شامل ہیں۔ شمالی ہندوستان میں شاکر ناجی اور سودا سے اس کی شروعات ہوتی ہے۔ انشا، رنگین سے ہوتے ہوئے طنز و مزاح نظیر اور اکبر الہ آبادی تک پہنچتا ہے۔ نظیر اور اکبر الہ آبادی نے عوامی روایتوں، رسوموں اور مغربیت پر بھرپور طنز کیا ہے۔ غالب کے خطوط طنز و مزاح کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ انھوں نے اپنی ذات کو نشانہ بناتے ہوئے مزاح و ظرافت کی ایک زبردست مثال قائم کی۔ مکتوبات کے علاوہ ان کی شاعری میں بھی طنز و مزاح کے عناصر موجود ہیں۔ اودھ پنچ اور منشی سجاد حسین نے ظرافت نگاری کو نیا مقام عطا کیا۔ بعد میں فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، خواجہ حسن نظامی، شوکت تھانوی، کنہیا لال کپور اور ظفر علی خاں نے طنز و مزاح کو مزید استحکام دیا اور اردو ادب میں اسے باقاعدہ ایک صنف کے طور پر قبول کرلیا گیا۔

برصغیر کی تقسیم کے بعد پاکستان میں شفیق الرحمٰن، مشتاق احمد یوسفی، کرنل محمد خاں، ابن انشاء وغیرہ اور ہندوستان میں فرحت کاکوروی، فکر تونسوی، کوثر چاندپوری، وجاہت علی سندیلوی، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، شفیقہ فرحت اور نصرت ظہیر کے نام قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح شاعری میں رضا نقوی واہی، سلمان خطیب، دلاور فگار، شوکت تھانوی، ہلال رضوی، ماچس لکھنوی اور شہباز امروہوی، ساغر خیامی، پاپولر میرٹھی وغیرہ نے مزاحیہ شاعری کو مزید استحکام بخشا۔ مزاح اور دل بستگی انسانی فطرت کا ایک لازمی جز ہے۔ کوئی بھی انسان جو ان سے محظوظ نہیں ہوتا اسے مغرور، بدمزاج جیسے القابات سے نوازا جاتا ہے جب کہ ہمیشہ خوش رہنے والے اور ہنسنے مسکرانے والے کو خوش خلق اور خوش مزاج کہتے ہیں۔ شاعری میں اپنی ذات کو نشانہ بناتے ہوئے اور معاشرے کی بہتری کے لیے کچھ پیش کرنا بہت مشکل کام ہے اور رضا نقوی واہی اس مشکل کام کو نہایت آسانی سے کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ اپنے آپ کو ہدف علامت بنانا ایک بڑے فنکار کی نشانی ہے اور واہی اس فن میں طاق ہیں۔

دبستان بہار نے اردو زبان ادب کی ترویج و اشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ شاد، امداد امام اثر، رمز عظیم آبادی، راسخ عظیم آبادی، سہیل عظیم آبادی، بسمل عظیم آبادی، کلیم الدین احمد، کیف عظیم آبادی، قاضی عبدالودود، کلیم عاجز، عبدالمغنی، وہاب اشرفی، الیاس احمد گدی، کلام حیدری، سید محمد حسنین، شکیلہ اختر، اختر اورینوی، انجم مانپوری جیسے ادیبوں و ناقدین کی سرزمین عظیم آباد اردو زبان و ادب کے آغاز اور ارتقا سے ہی اہمیت کی حامل رہی ہے۔ یہاں کے ادیبوں اور شاعروں کی ادبی خدمات کے ذکر کے بغیر اردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔

رضا نقوی واہی اردو ادب میں طنز و مزاح کے ان منفرد شاعروں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے قہقہے کے پس پردہ ایک سنجیدہ، دردمند اور بیدار ذہن چھپا رکھا تھا۔ واہی کے ہاں طنز محض ظرافت برائے ظرافت نہیں بلکہ فکر و شعور کی بیداری کا ذریعہ ہے۔ وہ ایسے شاعر ہیں جن کے یہاں مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ سماج کی تلخ حقیقتیں بھی سانس لیتی محسوس ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ واہی کا طنز سطحی نہیں، نہ ہی ان کا مزاح محض وقتی دل لگی تک محدود رہتا ہے، بلکہ وہ قاری کو ہنساتے ہنساتے آئینہ دکھا دیتے ہیں۔ اس حوالے سے معروف مزاح نگار کنہیا لال کپور کا یہ قول دیکھیں:

میرا تب بھی عقیدہ تھا اور اب بھی ہے کہ اکبر الہ آبادی اور ظریف لکھنوی کے بعد مزاحیہ اور طنزیہ شاعری میں تیسرا بڑا نام آپ کا ہے۔ خدا آپ کو اپنی اور اغیار کی نظر سے بچائے۔ آپ کو طنز و مزاح کی جملہ اقسام پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ خاص کر پیروڈی اور طنز میں آپ کا کوئی رقیب نہیں۔ شعرستان آپ کی امر تخلیق ہے۔

(بحوالہ ادب نکھار، رضا نقوی واہی نمبر، سرورق، مئی جون 1983 مئو ناتھ بھنجن)

شعرستان واہی کی ایسی منفرد شعری تخلیق ہے جس کی مثال پورے اردو ادب میں ملنی مشکل ہے۔ یہ ایک ایسی دنیا ہے جہاں دو کروڑ اکسٹھ ہزار شاعروں کو بسایا گیا ہے اور شاعروں کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ شاعروں کی اس خیالی دنیا کو ایک جزیرے پر بسایا گیا ہے جہاں ان کا کام مچھلی مارنا اور تاڑی سے پیاس بجھانا ہے۔ شعر و سخن کی ایک ایسی محفل اس طویل نظمیہ سیریز

میں سجائی گئی جو صرف واہی ہی سجا سکتے تھے۔ اس نظم کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی اور کنہیا لال کپور نے اسے امر تخلیق سے تعبیر کیا۔ کچھ اشعار ملاحظہ کریں:

مغویہ شاعر کا خط نقاد کے نام

کیا بود و باش پوچھو ہو اے ناقد سخن
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دو چار چھوٹے چھوٹے جزیرے جنوب میں
تھے متصل کو انڈمن و نیکوبار کے
بہر سخن گری تھے جو عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہان روزگار کے
واللہ کیا زمانہ تھا بے روک ٹوک ہم
دن رات شعر کہتے تھے ٹانگیں پسار کے
گھر والیوں کا خوف نہ نقادہی کا ڈر
راتیں شب برات تھیں دن تھے بہار کے
مچھلی پکڑ کے کھاتے تھے لگتی تھی بھوک جب
بجھتی تھی پیاس تاڑ سے لبنی اتار کے
اسمگلروں سے کر کے تہی لوگ سازباز
قصاب گھر میں لائے ہمیں گھیر گھار کے
اب پھر ہے ناقدوں کی چھری اور گلوئے شعر
اب پھر ہدف ہیں ہم قلم بے مہار کے
صد حیف کیا خبر تھی کہ پھر ایک بار ہم
ہوں گے اسیر گردش لیل و نہار کے
ناقد نے جس کو لوٹ کے ویران کردیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

(بحوالہ شعرستان واہی، ص۔38)

اس طویل نظم میں واہی نے جس طرح کے الفاظ اور اصطلاحات کا استعمال کیا ہے وہ واہی کی شناخت ہیں۔ کچھ الفاظ تو ایسے ہیں جو مقامی اور دیہی رنگ لیے ہوئے ہیں جنھیں بہار والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ مثلاً، پسارنا، لبنی، تاڑی، اٹنگا، اکارت جیسے درجنوں الفاظ اس طویل نظم میں ملتے ہیں۔ اسی طرح غزل گوئی کا چکہ جام، شاعران تاڑی باز، ماہر ہوٹنگ جرگہ شاعران نکسلی، الٹرا موڈرن شاعر، قوم بیکاراں، وارث طنز و ظرافت اور نیم وحشی شاعران جیسی اصطلاحات بھی ہیں جو واہی کے بیدار مغز شاعرانہ ذہن کی پیداوار ہیں۔

واہی کا تعلق بہار کے اس خطے سے تھا جہاں اردو تہذیب، زبان اور ثقافت کی جڑیں گہری رہی ہیں۔ ان کا شعری مزاج اسی تہذیبی پس منظر میں پروان چڑھا، مگر ان کی نظر صرف مقامی مسائل تک محدود نہیں رہی۔ انھوں نے اپنے عہد کی سیاسی، سماجی، اخلاقی اور تہذیبی گراوٹ کو نہایت باریک بینی سے دیکھا اور اس پر طنز کے نشتر چلائے۔ ان کا طنز کبھی چیختا نہیں، بلکہ آہستہ سے دل میں اتر جاتا ہے اور دیر تک اثر قائم رکھتا ہے۔ ان کے طنز کی خوبی یہ ہے کہ آپ کے ہونٹوں پر خود بخود مسکراہٹ رینگ جاتی ہے اور آپ اس مسکراہٹ کے ساتھ واہی کے رنگ میں رنگتے چلے جاتے ہیں۔ کبھی اردو ادب تو کبھی ناقد تو کبھی شاعر ہر کوئی ان کے تیر و نشتر کا نشانہ بنتا ہے۔ فاروقی ہوں کہ کلیم الدین ہوں یا کہ سلطان اختر سب کو انھوں نے اپنی شاعری میں شامل کیا۔ رضا نقوی واہی کی شاعری اپنے عہد کی ایک منفرد آواز تھی جس نے نامور ناقدین اور ہم عصر طنز

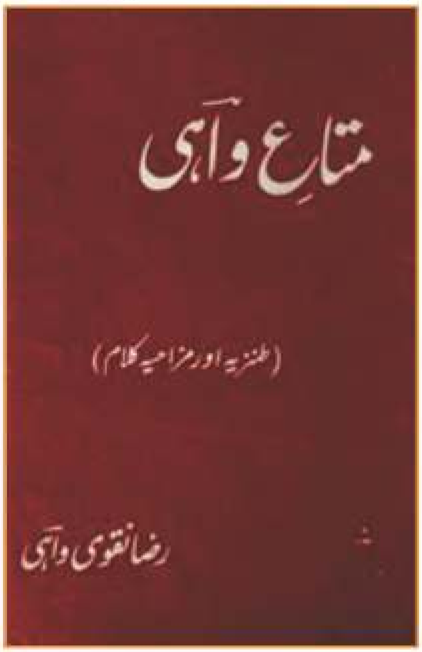

و مزاح نگاروں کو بھی قلم اٹھانے اور نئے نئے انداز میں سوچنے پر مجبور کردیا۔ معروف طنز و مزاح نگار نصرت ظہیر واہی کی شاعری پر کچھ یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

شگفتگی، شائستگی اور برجستگی طنز و مزاح میں بنیادی عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ واہی نے اپنے شعری اسلوب میں شائستگی کو سب سے اوپر رکھا اور اس کے لیے کئی بار فنکارانہ برجستگی اور تبسم ریز شگفتگی کو بھی قربان کردیا، لیکن ابتذال کی پرچھائیں تک اپنے سخن پر نہیں پڑنے دی۔ کل ملا کر یہی وجہ ہے کہ ان کے اسلوب میں مزاح پر طنز حاوی نظر آتا ہے۔ ان کا طنز محض جلی کٹی سنانے اور قصاب کی طرح چھری سے کاٹنے پیٹنے جیسا طنز نہیں بلکہ گہری سماجی بصیرت رکھنے اور شعور کی رگوں میں اتر جانے والا طنز ہے جس میں کاٹ نہیں گدگداہٹ ہے اور یہی گدگداہٹ پھول کی پتی سے تراشنے کا ہنر بن جاتی ہے۔ واہی نے انسان، سماج اور اس کے اندر باہر چاروں طرف پھیلی ہوئی کائنات کے ہر معاملے کو موضوع سخن بنایا اور فکری و تخلیقی وسعت کا یہ وصف انھیں اکبر اور دلاور دونوں سے کسی قدر مختلف بنا دیتا ہے۔ یہاں تک کے خالص ادبی موضوعات کو بھی انھوں نے بڑی پرلطف سنجیدگی سے سخن کا حصہ بنایا ہے جس کی سب سے اہم مثال ان کی طویل نظم شعرستان ہے۔

(بحوالہ۔ اردو دنیا، نئی دہلی، ص۔16، مئی 2015)

جس طرح شاد نے دبستان عظیم آباد کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے اسی طرح واہی نے دبستان عظیم آباد کی طنز و ظرافت کی روایت کو پختہ اور مستحکم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ رضا نقوی واہی کی شاعری کا ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ انسانی کمزوریوں کو ہدف بناتے ہیں، مگر انسان کی توہین نہیں کرتے۔ وہ افراد سے زیادہ رویوں پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں تلخی کے باوجود شائستگی برقرار رہتی ہے۔ ان کا طنز اصلاحی ہے، تخریبی نہیں۔ وہ سماج کو توڑنے کے بجائے سنوارنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ اکبر الہ آبادی کی روایت سے جڑے نظر آتے ہیں، مگر ان کا لب و لہجہ اپنے عہد کے مطابق ہے۔

واہی کے یہاں مزاح اکثر خود احتسابی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ وہ خود کو بھی طنز کی زد میں لے آتے ہیں، جو بڑے فنکار کی علامت ہے۔ ان کی شاعری میں ''میں'' کا حوالہ آتے ہی ایک عام انسان سامنے آ جاتا ہے، جو کمزور بھی ہے، مضحکہ خیز بھی، اور قابلِ رحم بھی۔ یہی انسانی پہلو ان کی شاعری کو مشینی ہونے سے بچاتا ہے۔ قاری محسوس کرتا ہے کہ یہ اشعار کسی زندہ دل انسان کے تجربات سے نکلے ہیں۔

ان کے طنزیہ اشعار میں زبان کی سادگی قابلِ توجہ ہے۔ وہ بھاری بھرکم تراکیب، مشکل استعارات اور ثقیل لفظیات سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کا کمال یہی ہے کہ عام بول چال کی زبان میں غیر معمولی بات کہہ جاتے ہیں۔ یہی سادگی ان کی شاعری کو عام قاری تک پہنچاتی ہے اور اسے محض خواص تک محدود نہیں رہنے دیتی۔ تاہم، یہی سادگی بعض ناقدین کے نزدیک ان کی شاعری کی ایک کمزوری

بھی سمجھی گئی ہے، کیونکہ کہیں کہیں یہ انداز بہت زیادہ عام بن جاتا ہے۔ رضا نقوی واہی کی شاعری میں طنز کے ساتھ ساتھ مزاح کی کئی سطحیں ہیں۔ کہیں ہلکی سی شرارت ہے، کہیں گہری کاٹ، کہیں نرم سی چوٹ اور کہیں زہر میں بجھا ہوا تیر۔ وہ موقع اور موضوع کے مطابق لہجہ بدلنے پر قادر ہیں۔ ان کی یہی لسانی اور فکری لچک انھیں یک رنگی سے بچاتی ہے۔ وہ ایک ہی ڈھب پر اشعار نہیں کہتے بلکہ ہر موضوع کے لیے الگ فضا قائم کرتے ہیں۔ ان کے ہاں سیاست پر بھی طنز ملتا ہے لیکن وہ نعرہ بازی سے دور رہتے ہیں۔ وہ سیاست دانوں کی وعدہ خلافیوں، مفاد پرستی اور موقع پرستی کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ قاری ہنس بھی لیتا ہے اور شرمندہ بھی محسوس کرتا ہے۔ ان کا طنز چیخ کر الزام نہیں لگاتا بلکہ مسکرا کر سچ کہہ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری وقتی سیاسی حالات سے بندھ کر نہیں رہتی بلکہ ایک عمومی انسانی تجربہ بن جاتی ہے۔

واہی کی شاعری میں سماجی تضادات کا بیان بھی نہایت دلچسپ ہے۔ امیر و غریب، عالم و جاہل، حاکم و محکوم سب ان کے طنز کی زد میں آتے ہیں۔ مگر وہ طبقاتی نفرت نہیں پھیلاتے، بلکہ طبقاتی شعور بیدار کرتے ہیں۔ ان کے یہاں ہمدردی کا مرکز ہمیشہ عام انسان رہتا ہے، وہی انسان جو نظام کی چکی میں پس رہا ہے اور پھر بھی مسکرانے کی کوشش کرتا ہے۔

اگر واہی کی شاعری کی خامیوں پر بات کی جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بعض اوقات ان کے اشعار میں فوری تاثر تو بہت مضبوط ہوتا ہے، مگر دیرپا فکری گہرائی کم محسوس ہوتی ہے۔ کچھ اشعار محض وقتی حالات کے ردِعمل کے طور پر سامنے آتے ہیں، جن کی معنویت وقت کے ساتھ کم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح بعض نظموں یا قطعات میں تکرار کا احساس بھی ہوتا ہے، گویا ایک ہی خیال مختلف انداز میں دہرایا جا رہا ہو۔ ایک اور تنقیدی نکتہ یہ ہے کہ واہی کی شاعری میں تخیل کی بلند پروازی کم اور مشاہدے کی گرفت زیادہ ہے۔ یہ وصف جہاں ان کے طنز کو زمینی حقیقتوں سے جوڑتا ہے، وہیں بعض اوقات شاعرانہ جمالیات کو محدود بھی کر دیتا ہے۔ وہ فلسفیانہ تجرید یا علامتی پیچیدگی کی طرف کم مائل ہوتے ہیں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ طنز و مزاح کی صنف میں یہی سادگی اور براہِ راست انداز ان کی انفرادیت قرار پاتا ہے اور طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں ان کی مستحکم شناخت بن جاتا ہے۔ واہی کی شاعری کا ایک اہم پہلو ان کا اخلاقی شعور ہے۔ وہ اقدار کے زوال پر کڑھتے ہیں، مگر واعظ نہیں بنتے۔ وہ نصیحت کو لطیفے میں چھپا دیتے ہیں۔ یہی فنی چابک دستی انھیں خطیبانہ انداز سے محفوظ رکھتی ہے۔ ان کے اشعار پڑھتے ہوئے قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ شاعر اس کے برابر بیٹھ کر بات کر رہا ہے، اوپر کھڑے ہو کر درس نہیں دے رہا۔

رضا نقوی واہی کی شاعری کا ایک اختصاصی پہلو یہ بھی ہے کہ انھوں نے اس صنف کو محض وقتی تفریح کے حصار سے نکال کر فکر و نظر کی وسعت عطا کی۔ ان کے کلام میں معاشرتی زوال، اخلاقی اقدار کی پامالی اور انسانی رویوں کے تضادات پر جو گہری چوٹ ملتی ہے، وہ انھیں اپنے عہد کے دیگر مزاح نگاروں سے ممتاز کرتی ہے۔ واہی نے نصیحت کو لطیفے کے پیرائے میں کچھ اس طرح بیان کیا ہے کہ قاری کو محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر اس کے برابر بیٹھ کر محوِ گفتگو ہے، نہ کہ کسی بلند منبر پر کھڑا ہو کر درس دے رہا ہو۔

واہی صرف ایک شاعر ہی نہیں بلکہ ایک فعال ادیب اور محقق بھی تھے۔ ان کے نثری کارنامے، جن میں کالم نگاری، تنقیدی مضامین اور شعری مجموعوں کی ترتیب شامل ہے، ان کی ہمہ جہت شخصیت کا ثبوت ہیں۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ انھوں نے دبستان بہار کی ادبی تاریخ کو محفوظ کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کی تصانیف آج بھی اس لیے پڑھی جاتی ہیں کہ ان کا طنز ماضی کا قصہ نہیں بلکہ آج کے انسانی رویوں پر بھی پوری طرح صادق آتا ہے۔ روزنامہ ساتھی کے مزاحیہ کالم، کتابوں پر تبصرے، کئی تنقیدی مقالات اور مقدمے بھی انھوں نے لکھے ہیں۔ بہار کے نظم گو شعرا پر ایک انتھولوجی بعنوان اشارہ ترتیب دی۔ جمیل مظہری کی نظموں اور غزلوں کے مجموعے ترتیب دیے۔ اختر اورینوی کی حیات و خدمات پر رسالہ ساغر نو مرتبہ قمر اعظم ہاشمی میں بطور مشیر شامل رہے۔ مجلس مشاورت میں تین لوگوں کے نام تھے، عبدالمغنی، رضا نقوی اور لطف الرحمٰن۔ ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے واہی کی حیات و خدمات پر مبنی اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اپنے نوجوان دوستوں کے ساتھ مل کر ایک رسالے کا 600 صفحات پر مشتمل اختر اورینوی نمبر نکالا۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ بات درست نہیں ہے۔ کیونکہ یہ رسالہ ساغر نو میری نظر سے گذرا ہے جس کی ترتیب قمر اعظم ہاشمی صاحب نے کی تھی۔ ہاں ایک دوسرا رسالہ مجھے ملا جس کی مکمل ترتیب رضا نقوی واہی صاحب نے کی تھی۔ انھوں نے اپنے قصبے کھجوا کے مدرسہ اسلامیہ پر 1987 میں ایک رسالہ ترتیب دیا تھا جس میں بطور مدیر ان کا نام لکھا ہوا ہے۔ یہ رسالہ مجھے ملا تو میں دیکھ کر حیران ہوا کہ واہی صاحب کو صحافت کے بھی سارے گر آتے تھے اور انھوں نے ماہر صحافی کے انداز میں اس رسالے کو ترتیب دیا ہے۔ اس رسالے میں کھجوا کی تاریخ، وہاں کی مسجدوں، امام باڑے، کربلا اور دیگر تفصیلات موجود ہیں۔ 84 صفحات پر مشتمل اس رسالے میں انھوں نے تعارف کے تحت لکھا ہے کہ پروفیسر سمیع عسکری نے واہی صاحب سے کھجوہ سے متعلق ایک رسالہ چھپوانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا جسے واہی صاحب نے پورا کیا۔ اس میں اہل کھجوہ کا شجرہ، کھجوہ کی تاریخی حیثیت، صحافتی روایت اور وہاں کے اہم افراد پر مضامین شامل ہیں۔ اس رسالے کے زیادہ تر مضامین رضا نقوی واہی نے ہی لکھے ہیں۔ اس طرح یہ رسالہ ان کی ایک نثری تصنیف قرار پاتا ہے۔ اس رسالے کا ذکر مجھے ہمایوں اشرف صاحب کی کتاب آئینہ در آئینہ اور فرد نامہ میں بھی نہیں ملا اور نہ ہی ادب نکھار کے واہی پر چھپے خاص شمارے میں۔

واہی کے فن پر مزید گفتگو کی جا سکتی ہے لیکن میں ان کے کچھ اشعار پر اپنی باتیں ختم کرتا ہوں:

دل کے ٹوٹے ساز پر رکھ دی ہیں کس نے انگلیاں
زندگی خود محو حیرت ہے سراپا گوش ہے

زندہ رہنا ہے تو موجوں سے گلے مل کر چلو
زندگی ساحل نہیں طوفان کا آغوش ہے

تیرے ہر ہر شعر پر اٹھتی ہے محفل کی نگاہ
جانِ محفل کی نظر لیکن رضا خاموش ہے

کا ش تو بجھا لو پیاس کہ راہ دراز سے
آیا ہوں جام آبلہ پا لیے ہوئے

آیا تھا لے کے عالم امید دہر میں
اب جا رہا ہوں یاس کی دنیا لیے ہوئے

■

Dr. Abdul Hai
Gaya College, Gayaji,
Bihar.823001
Mob.:9899572095
E-mail: ahaijnu@gmail.com

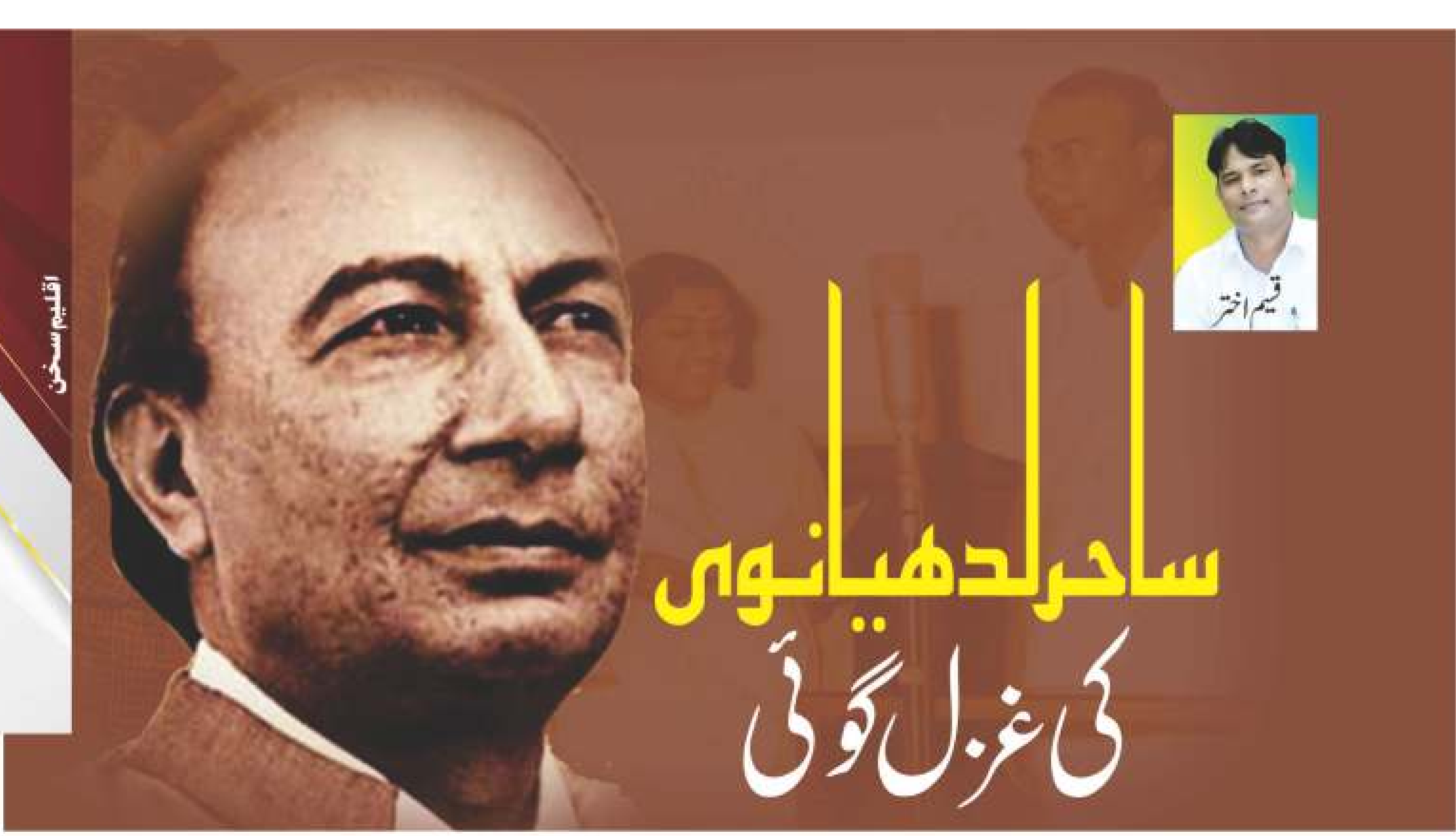

قیسم اختر

ساحر لدھیانوی کی غزل گوئی

ترقی پسند شعرا میں ساحر کی شخصیت بھی مجاز کی شخصیت کی طرح ہمیشہ سے دلچسپی کا مرکز رہی ہے۔ جس طرح مجاز کی شخصیت کی تعمیر اور اس کی زندگی کے تار و پود میں ان کے ہنگامہ خیز رومان کی کشش اور کسک کی لذت رچی بسی ہے اسی طرح ساحر کی شخصیت اور زندگی کے در و بست میں بھی ان کے رومان کی ہنگامہ خیزی اور ناکام عشق کا کرب رچا بسا ہوا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ جب ساحر لدھیانوی پر گفتگو کرتے ہیں تو ان کی شخصیت کے اسرار اور زندگی کے پیچ و خم پر زیادہ توجہ کرتے ہیں اور ان کی شاعری کے لہجے، اسلوب اور آہنگ کو بھی ان کی زندگی سے جوڑ کر دیکھتے ہیں۔ نتیجتاً بیشتر لوگ ان کی نظموں اور نغموں کو ہی اپنے مطالعے میں شامل کرتے ہیں اور ان کی غزلوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بیشتر ترقی پسند شعرا نے نظموں پر توجہ کی ہے۔ کیونکہ نظم کے فارم میں اپنی بات کو زیادہ وضاحت سے پیش کرنے کے سارے امکانات پائے جاتے ہیں۔ ساحر نے بھی زیادہ تعداد میں نظمیں کہی ہیں جو ان کے یہاں غزلوں کے مقابلے میں آٹے میں نمک کے برابر تو نہیں بلکہ کچھ زیادہ ہے۔ مگر یہ غزلیں ان کی شاعری میں نمکینی کا باعث ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ لوگوں نے ساحر کی نظموں پر اس قدر توجہ نہیں دی اور ان کی غزلوں کو اس طرح نظر انداز کیا کہ اس دور کے بیشتر دوسرے شعرا کی طرح ساحر کے متعلق بھی یہ بات عام ہوگئی کہ وہ صرف نظموں اور نغموں کے شاعر بن کر رہ گئے۔ یہ بات بھی درست ہے کہ کچھ ناقدین نے ان کی نظموں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی غزلوں کا بھی وقفے وقفے سے ذکر کیا ہے مگر دل جمعی کے ساتھ کسی ناقد نے ان کی غزلوں کا مطالعہ پیش نہیں کیا ہے۔

ڈاکٹر نغمہ پروین اپنی کتاب، ''ساحر لدھیانوی حیات اور کارنامے'' میں پروفیسر نظیر صدیقی کا ایک اقتباس نقل کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

''اگر چہ ساحر نے نظمیں زیادہ کہیں لیکن وہ اردو کے معدودے چند شاعروں میں سے ہیں جو نظم و غزل پر یکساں قدرت رکھتے ہیں اور میرے ایک نظریے کے مطابق نظم میں ان کی کامیابی کا راز یہی تھا کہ وہ ایک کامیاب غزل گو تھے۔ یہ بات جس طرح اقبال اور فیض پر صادق آتی ہے اسی طرح ساحر پر بھی منطبق ہوتی ہے۔''1

اردو کا جو شاعر غزل کی خوبیوں سے آشنا نہیں ہوتا اور جو غزل کے منہاج اور مزاج کو نہیں سمجھتا وہ نہ تو اچھی نظمیں لکھ پاتا ہے اور نہ اچھی نثر تحریر کر سکتا ہے۔ ساحر اتنے کامیاب نظم گو شاعر اور نغمہ نگار اس لیے بن سکے کہ وہ غزل اور غزلیہ شاعری کی روایات اور اس کی ترجیحات سے پوری طرح واقف تھے۔ غزل کا فن اختصار اور ایجاز کا فن ہے۔ غزل کا مزاج نہایت رومانی ہوتا ہے۔ نیز، جیسا کہ ہم جانتے ہیں، ترقی پسند تحریک کی رگوں میں دوڑنے والے لہو میں حقیقت پسندی سے زیادہ رومانیت اور انقلابیت کی بجلی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کے مزاج آشنا شعرا ترقی پسند تحریک کی ہمنوائی میں زیادہ چمکے اور دیر تک چمکتے رہے۔ فریڈرک اینگلز نے بہت پہلے کہا تھا:

''مقصدی میلان کو اشاروں کے ذریعے بے ساختہ اور غیر محسوس طور پر اثر ڈالنا چاہیے اس کی ضرورت نہیں کہ مصنف اپنے خیالات اور عقائد کا ڈنکا پیٹ کر زبردستی پڑھنے والے پر اپنا اثر ڈالے.... مصنف کے نظریات جس قدر پوشیدہ رہیں فن کاری کے حق میں اسی قدر بہتر ہوتا ہے۔''2

اینگلز نے جس بے ساختگی اور اثر پذیری کا ذکر کیا ہے دراصل وہی شعر کی شعریت، رمزیت، کیفیت، غنائیت اور تغزل ہے۔ نیز نظریات کی پوشیدگی سے مراد رمزیت، اشاریت اور کنایہ ہے، جسے ہم کسی حد تک ابہام کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ کیونکہ ان ہی خوبیوں اور صفات کی بدولت غزل کی فضا بنتی ہے۔ اسی طرح یہ صنف دوسری اصنافِ شاعری سے ممتاز بنتی ہے۔

ساحر کا انفراد یہ ہے کہ وہ نہ صرف استعارات کے ذریعے کیفیت پیدا کرنے کے ہنر سے واقف ہیں بلکہ ان کی غزلوں میں صنائع کا بھی بڑے قرینے اور سلیقے سے استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ جب وہ کہتے ہیں کہ:

کون جانے یہ ترا شاعرِ آشفتہ مزاج
کتنے مغرور خداؤں کا رقیب آج بھی ہے

ساحر لدھیانوی کی غزلوں کے بیشتر اشعار ان کے تجربات و مشاہدات کی بھٹی سے نکلے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار قارئین کو بھی اپنے تجربات کا حصہ بنا لیتے ہیں۔

تو یہ نہ صرف حالات کے جبر کے خلاف ردعمل کا طاقتور اظہار ہوتا ہے بلکہ زمانے کے استبداد کے خلاف احتجاج کی آواز بھی بن جاتا ہے۔

ساحر لدھیانوی کی غزلوں کے بیشتر اشعار ان کے تجربات و مشاہدات کی بھٹی سے نکلے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار قارئین کو بھی اپنے تجربات کا حصہ بنا لیتے ہیں۔ ساحر تو بالکل واضح الفاظ میں کہتے ہیں کہ:

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

کسی بھی فن پارے کے حوالے سے تہذیبی اقدار اور تجربے کی آنچ کی تلاش ناقد کا ذمہ ہے اور ناقد یہ بات جانتا ہے کہ خارجی حالات کے جبر سے تہذیبی قدریں بدلتی رہتی ہیں اور ان ہی بدلتی قدروں کے درمیان فن کار پروان چڑھتا ہے اور اس کے فن پر نکھار آتا ہے۔ فی زمانہ تہذیبی اقدار میں تغیر اور سماجی و سیاسی اور معاشرتی زندگی کے متنوع مسائل دراصل تمدنی اور صنعتی زندگی کے عروج کی دین ہوتے ہیں۔ لہٰذا کسی بھی فن پارے کا مطالعہ اس تہذیبی و معاشرتی اقدار یا زندگی کے بدلتے تیور کو سمجھے بغیر ممکن اور مکمل نہیں ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ساحر کے یہاں شاعری میراجی یا اختر الایمان کی طرح موضوعات کا انتخاب نہیں بلکہ زندگی کے براہ راست تجربے کا اظہار اور تلاش کا نام ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

پہلے ہنس کے ملتے ہیں پر نظر چراتے ہیں
آشنا صفت ہیں لوگ اجنبی دیاروں کے

پیدائش کے دن سے موت کی زد میں ہیں
اس مقتل میں کون ہمیں لے آیا ہے
کیسے کیسے چشم و عارض گردِ غم سے بجھ گئے
کیسے کیسے پیکروں کی شان زیبائی گئی
اس طرح سے زندگی نے دیا ہمارا ساتھ
جیسے کوئی نباہ رہا ہو رقیب سے
زندگی کا نصیب کیا کہیے
ایک سیتا تھی جو ستائی گئی

ان اشعار کی معنویت، ان کے استعاراتی نظام اور تشبیہی ندرت کی بدولت دو چند ہوگئی ہے اور شعریت کے چہرے کا غماز بن گئی ہے۔ ان اشعار میں ساحر کے سماجی شعور کی نشاندہی بہ آسانی کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ زندگی اور زمانے سے متعلق ان کا یہ رویہ عصر حاضر کے مسائل و مصائب اور خود ان کے حالات و ماحول سے اثر پذیر ہوا ہے۔ یہ درست ہے کہ ساحر کی حقیقت نگاری میں رومان کا رنگ شامل ہے مگر سچ یہ ہے کہ ان کی فکر کا پرتو بہت روشن ہے۔ علی سردار جعفری لکھتے ہیں:

''ترقی پسند شاعروں کا محور رومان اور احتجاج ہے۔ فیض کے یہاں محبوبہ کا وہ تصور نہیں ہے جو ساحر کے یہاں ہے۔ مخدوم اور مجاز کی شاعری کا محور بھی رومان اور احتجاج رہا ہے مگر ان چاروں ہم عصر شعرا کے مزاج الگ الگ ہیں، مجاز کے یہاں سرفروشانہ سرشاری ہے۔ فیض کے یہاں معشوق نواز حسن پرستی اور ساحر کے یہاں عاشقانہ انانیت۔''3

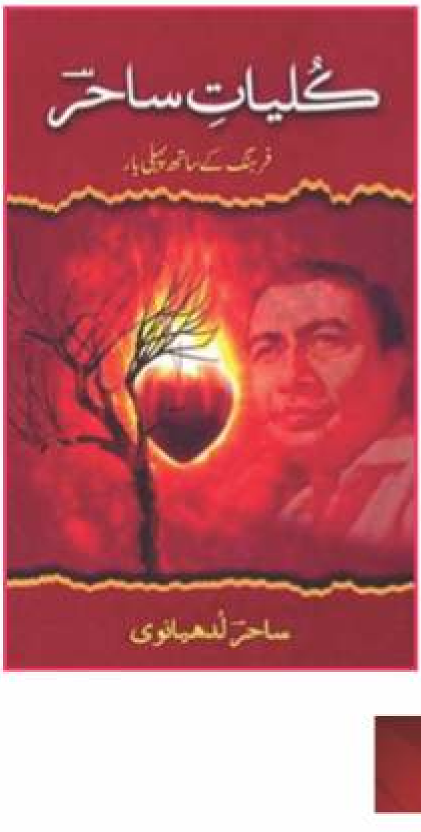

ساحر کی شاعری میں احتجاج کی لے واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ انسانوں کی تذلیل برداشت نہیں کر پاتے ہیں۔ انھیں اپنے آس پاس کی زندگی میں جو اونچ نیچ اور جبر و استحصال نظر آتا ہے وہ انھیں اندر سے دہکا دیتا ہے۔ مگر چوں کہ وہ ایک پختہ کار فنکار بھی ہیں اس لیے ان کی شاعری سراپا احتجاج اور پروپیگنڈہ نہیں بنتی۔ اشعار تو دیکھیں:

اس رنگینیٔ حیات کا کب تک اٹھائیں بار
بیمار اب الجھنے لگے ہیں طبیب سے
تنگ آچکے ہیں کشمکش زندگی سے ہم
ٹھکرا نہ دیں جہاں کو کہیں بے دلی سے ہم
اس دور احتیاج میں جو لوگ جی لیے
ان کا بھی نام شعبدہ کاروں میں آئے گا

تلخ سے تلخ بات کو اس طرح کہنا کہ شاعری کا حسن برقرار رہے، فن شاعری پر مکمل قدرت کے بغیر ممکن نہیں۔ ساحر کو فن شاعری کی ساری نزاکتوں کا علم تھا اور انھیں شاعری کی زبان کی ندرت پر بھی دسترس حاصل تھی۔ اس لیے وہ کسی بھی موقعے پر شعریت کی حدود سے باہر نہیں نکلتے ہیں۔ خواجہ احمد عباس نے لکھا ہے کہ:

''جب میں یہ کہتا ہوں کہ ساحر ہمارے ملک کے تین مقبول زندہ شاعروں میں سے ایک ہیں تو یہ بات معمولی نہیں، علاوہ ازیں ساحر کا فن شعر پر عبور، اس کا انداز تحریر، اس کا لفظوں کا انتخاب، تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال کا سلیقہ اتنا مکمل اور جامع ہے جو دوسرے جدید شعرا کی دسترس سے باہر ہے۔ بزرگ شعرا بھی اسے حقیقی شاعر تسلیم کرتے ہیں اور اس کے شعر تنقید کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔''4

ساحر لدھیانوی کا تعلق چونکہ جاگیردارانہ نظام سے تھا اس لیے انھوں نے جاگیرداروں کے جبر بھی دیکھے تھے اور کسانوں کی ناآسودگی اور ان کی زندگی کی بے یقینی کا بھی انھیں اندازہ تھا۔ یہی سبب ہے کہ ان کا دل عوام کے دلوں کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہوگیا تھا اور عوام کا غصہ ان کے اپنے سینے میں لاوا بن کر ابلنے لگا تھا۔ مگر ان تمام کے باوجود انھوں نے فن کی حرمت پر حرف نہیں آنے دیا۔ کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ فن کا پیرہن حریری بہت نفیس اور نازک ہوتا ہے۔ اگر یہ پیرہن تار تار ہو جائے تو پھر موضوعات اور مواد کیسے ہی سچے اور سلگتے ہوئے کیوں نہ ہوں وہ فن کا مقام حاصل

نہیں کر سکیں گے۔ ساحر لدھیانوی ایک طرف احتجاج کی آواز تھے تو دوسری طرف فکر و فن کی پرواز کے بھی پاس دار تھے۔ ان کی تجزیاتی فکر زمانہ شناس ہی نہیں معاشی و معاشرتی بیداری کا پیغام اور جدید اور روشن امکانات کی ترجمان بھی ہے۔

اہل دل اور بھی ہیں اہل وفا اور بھی ہیں
ایک ہم ہی نہیں دنیا سے خفا اور بھی ہیں
بھڑکا رہے ہیں آگ لب نغمہ گر سے ہم
خاموش کیا رہیں گے زمانے کے ڈر سے ہم
ستم کے بہت سے ہیں رد عمل
ضروری نہیں چشم تر کیجیے
معمورۂ احساس میں ہے حشر سا برپا
انسان کی تذلیل گوارہ نہیں ہوتی

ساحر کا کمال یہ ہے کہ ان کے یہاں غزل اپنے تمام لوازمات کے ساتھ غزل ہی رہتی ہے، جن میں کلاسکیت اور رومانیت کے ساتھ ساتھ تجربات و مشاہدات کی آمیزش سیاسی و سماجی کشمکش اور ترک الفت کے تاثر کو موثر انداز میں پیش کرنے کی کوشش نظر آتی ہے۔ وہ بندھے ٹکے استعارات و علامات اور تشبیہات و کنایات سے کام نہیں لیتے بلکہ نئی تشبیہات و علائم کو ضرورت کے تحت نہایت خود اعتمادی اور سلیقے سے استعمال کرتے ہیں ان کی ان ہی خوبیوں نے انھیں زندگی میں ہی ان شہرتوں اور کامیابیوں سے ہمکنار کر دیا تھا جن کی جستجو میں اکثر فنکار کی عمریں تمام ہو جاتی ہیں۔ مخمور سعیدی لکھتے ہیں:

''ایسی شخصیتیں کم ہوتی ہیں جن کے کارناموں کی وقعت اور شہرت سے ان کی زندگی میں ہی انھیں ہر دلعزیز بنادے اور ہزاروں لاکھوں دلوں پر ان کی حکمرانی ہو جائے ساحر لدھیانوی ایک ایسی ہی شخصیت کا نام تھا۔ ساحر کا شاعرانہ مرتبہ اختلافی بحث کا موضوع بن سکتا ہے مگر یہ دعویٰ بلا خوف تردید کیا جا سکتا ہے کہ اپنے ہم عصروں میں انھیں سب سے زیادہ عوامی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کی اکثر نظمیں، غزلیں اور گیت نوجوان نسلوں کا عزیز ترین ذہنی سرمایہ رہے ہیں۔''5

ساحر کو زندگی میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کی ایک بڑی وجہ تو یہی ہے کہ انھوں نے انسانی زندگی کے دکھ درد کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور ایسے انداز و اسلوب میں پیش کیا کہ عوام و خواص دونوں کے دلوں پر نقش ہو گیا۔ دوسری بات یہ کہ انھوں نے زندگی

عشق کے تجربات اور مسائل کے تعلق سے ساحر کا وھی، مخصوص رویہ جھلکتا ھے۔ جو ان کی عشقیہ نظموں میں بھی نمایاں ھوا ھے۔ اس عشق میں محبوب کے قرب و و صال کی گھڑیاں بہت مختصر رھی ھیں۔ اول تو غم دوراں نے اس کی مہلت کم دی پھر سما ج نے ان کے چاھنے والوں کے درمیان مستقل طور پر دیوار یں کھڑی کر دیں۔ چنانچہ اس قسم کے اشعار جن میں آغاز محبت، عشق کی کیفیات اور معاملات کا بیان ھو۔ ساحر کی غزلوں میں خال خال ھی ملتے ھیں۔

کی ناکامیوں کے ساتھ ساتھ دل کی بے تابیوں کو بھی اپنی شاعری میں کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس طرح ان کی شاعری دو آتشہ بن گئی اور ان کے قارئین ان کے ہم نوا ہو گئے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے جو آج بھی تازہ اور زندہ جذبات سے بھرپور معلوم ہوتے ہیں:

دیکھا تو تھا یوں ہی کسی غفلت شعار نے
دیوانہ کر دیا دل بے اختیار نے
تجھ کو خبر نہیں مگر اک سادہ لوح کو
برباد کر دیا ترے دو دن کے پیار نے
جب کبھی ان کی توجہ میں کمی پائی گئی
از سر نو داستان شوق دہرائی گئی
نگاہیں جھکتے جھکتے بھی بہم ٹکرا ہی جاتی ہیں
محبت چھپتے چھپتے بھی نمایاں ہوتی جاتی ہے

ان اشعار میں ساحر کے بیان کی شگفتگی، جذبہ و خیال کی رعنائی اور اسلوب کی رنگا رنگی کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ان میں کسی طرح کے نظریاتی تغیر کا کوئی زور و شور نہیں ہے جو آج کے دور کے مزاج اور منہاج سے بہت حد تک وابستہ ہے۔ ان اشعار میں گرچہ محرومی و دادرسی کے ساتھ خلوص اور احساس کی شدت دیکھی جا سکتی ہے لیکن خود ترحمی کی کوئی کیفیت نہیں پائی جاتی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ شاعر قنوطی نہیں ہے۔ نظیر صدیقی نے بجا طور پر لکھا ہے کہ:

''عشق کے تجربات اور مسائل کے تعلق سے ساحر کا وہی، مخصوص رویہ جھلکتا ہے۔ جو ان کی عشقیہ نظموں میں بھی نمایاں ہوا ہے۔ اس عشق میں محبوب کے قرب و وصال کی گھڑیاں بہت مختصر رہی ہیں۔ اول تو غم دوراں نے اس کی مہلت کم دی پھر سماج نے ان کے چاہنے والوں کے درمیان مستقل طور پر دیواریں کھڑی کر دیں۔ چنانچہ اس قسم کے اشعار جن میں آغاز محبت، عشق کی کیفیات اور معاملات کا بیان ہو۔ ساحر کی غزلوں میں خال خال ہی ملتے ہیں۔''6

باوجود اس کے کہ وہ عشق کی ناکام حسرتوں سے عمر بھر پیچھا نہ چھڑا سکے، ناکامی عشق کے تدارک کے لیے ہمیشہ وہ کوشاں رہے لیکن ساحر لدھیانوی نے مجروح سلطان پوری جیسے غزل گو شاعر کی طرح اپنے فکر و شعور کو صرف غزل کا پابند نہیں کیا اور نہ انھوں نے کبھی جم کر غزلیں کہنے کی کوشش کی۔ ان کے یہاں گنتی کی جو چند غزلیں ہیں وہ اس پایہ کی ہیں کہ انھیں مطالعے کا حصہ بنایا جائے اور ان کی خوبیوں کا ذکر کیا جائے۔ اس کے علاوہ ان کی فنی نزاکت، زبان و بیان کی سلاست اور موضوعات کی رنگا رنگی کے حوالے سے ترقی پسند تحریک میں شامل غزل گو شعرا کے باب میں ساحر کی غزلوں پر بھی گفتگو ہو۔

حواشی

1 ساحر لدھیانوی حیات اور کارنامے'' ڈاکٹر نغمہ پروین، سرسوتی پریس الہ آباد۔ 2007۔ ص:353

2 جدید غزل پاکستان اور ہندوستان میں۔ پروفیسر نظیر صدیقی۔ فنون، لاہور۔ ص:168۔ 1969

3 دیباچہ، ساحر لدھیانوی حیات اور کارنامے'' ڈاکٹر نغمہ پروین، سرسوتی پریس الہ آباد۔ 2007۔ ص:8

4 ایضاً۔ ص:274

5 ساحر لدھیانوی ایک مطالعہ۔ مرتب: مخمور سعیدی۔ موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ 1981۔ ص:11

6 ایضاً۔ ص:12

■

Dr. Qaseem Akhtar
Assistant Professor Deptt. of Urdu
Marwari College,
Kishanganj-855107, (Bihar)
Mob.: 9470120116
E-mail: qaseemskhtar786@gmail.com

فہمینہ علی

کبیر اجمل کا شعری اظہار

اردو

تہذیب کے دبستانوں میں بنارس اپنی شہرہ آفاق گہرائی، تنوع اور روحانی معنویت کے سبب ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ یہ محض ایک جغرافیائی اکائی نہیں، بلکہ ایک ایسا تہذیبی مظہر (Cultural Phenomenon) ہے جہاں صدیوں کی تاریخ، مذاہب کی آمیزش، اور زبانوں کی رنگا رنگی نے مل کر ایک منفرد فکری اور جمالیاتی فضا قائم کی ہے۔ بنارس کو اکثر مذہبی شعائر اور روحانی روایتوں کے تناظر میں دیکھا جاتا ہے، لیکن یہ شہر محض عقیدت کا مرکز نہیں بلکہ لسانی اور فکری تجربوں کی گہوارہ گاہ بھی ہے، جہاں فارسی، اردو، ہندی، اور برج بھاشا کی لہریں باہم پیوست ہوکر ایک نادر جمالیاتی فضا پیدا کرتی ہیں۔

بنارس صرف جغرافیائی نقشے کا حصہ نہیں بلکہ ایک ثقافتی یادداشت (Cultural Memory) ہے۔ یہاں کے مندر، درگاہیں، گنگا کے کنارے اور گھاٹ مل کر انسان کو ایک ایسے جمالیاتی اور روحانی تجربے سے گزارتے ہیں جو شاعری کے لیے زرخیز زمین فراہم کرتا ہے۔ کبیر اجمل کی شاعری اسی بنارسی تہذیب کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ جس نے زبان کو محض اظہار کا وسیلہ نہیں بلکہ ایک جمالیاتی تجربہ بنایا ہے۔ یہ شہر، اپنی تہذیبی کثرت اور صوفیانہ روایت کے سبب، لفظ کو معنی کے دریا میں بہانے اور جملے کو تجربے کا آئینہ بنا دینے کا ہنر بخوبی جانتا ہے۔ بنارس کی فضا میں روایت اور جدت، مذہب اور فلسفہ، اور ماضی اور حال کی کشمکش اس طرح گندھی ہوئی ہے کہ شاعر کے لیے یہ محض الہام کا مقام نہیں بلکہ شعوری جستجو کی دنیا بھی ہے۔ یہی وہ ماحول ہے جو کبیر اجمل کے کلام کو ان کے عہد نفسا نفسی میں بھی تہذیبی معنویت عطا کرتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کے بقول شاعری محض جذبات کا اظہار نہیں بلکہ ایک 'لسانی تشکیل' (Linguistic Construct) ہے جو معنی بیان نہیں کرتی بلکہ معنی پیدا کرتی ہے۔[1] کبیر اجمل کے اشعار بھی اسی تصور کے تحت سمجھے جا سکتے ہیں۔ ان کے کلام میں ایک ایسی شعوری صناعت ملتی ہے جو اشعار کو محض وجدانی اظہار کے درجے سے بلند کرکے ایک ''فکری بیانیہ'' بنا دیتی ہے۔

اسی سے اجمل تمام فصل غبار صحرا
اداس آنکھوں میں پھر بھی روشن دیا اسی کا

تری وفا کی گلاب رت بھی اداس راہوں میں کھو گئی ہے
سو زرد موسم فصیل شہر انا پہ تحریر کر رہا ہوں

وہ کون ہے جو مرے دسترس سے باہر ہے
ہم اہل ہجر شکست سواد شام کے بعد

عذاب آیا تو تیری طرف ہی آئیں گے
کسے پکار رہا ہے غبار دشت طلب

کبیر اجمل غزل کے روایتی تقاضوں سے بھی باخبر ہیں اور عہد حاضر کے عصری تقاضوں سے بھی۔[2] ان کی شاعری کا سفر تجربے سے تجزیے اور تجزیے سے تنظیم نو کی جانب گامزن ہے۔ ان کے تخیل کی پرواز ذوق و شوق کے ساتھ مشاہدات کو بھی اہم گردانتی ہے ان کے یہاں عشق کا تصور روایتی بیڑیوں میں جکڑا ہوا نہیں ہے۔ بلکہ اس میں تازہ کاری کا احساس ملتا ہے۔ ان کی عشقیہ شاعری میں 'ناز حسن' کے ساتھ ساتھ نیاز حسن کی تفصیل' بھی موجود ہے، لیکن یہ محض جذباتی رومانیت نہیں بلکہ واقعیت اور حقیقت پسندی کا امتزاج ہے، ان کے یہاں خارجی حالات اور اجتماعی معاملات کا شعور ایک بیلنس کے ساتھ کام کرتا ہے اور عشق زیادہ تر حقیقی انداز میں جلوہ نما نظر آتا ہے لیکن کہیں کہیں اس میں مجازی عشق کی کیفیات بھی شامل ہیں جنھیں برتنے میں انھوں نے علامتوں اور استعاروں کا نفیس سہارا لیا ہے۔ وہ 'ایک نام' جو حصار سخن میں آکر بھی نہیں آتا، جو 'خوشبوؤں کا آذر ہے، خواہشوں کا پیکر ہے' فکر کا شناور ہے، جس کا چہرہ خواب زاروں میں نمو کی صورت ہے، جس کے عکس کی خوشبو شرمیلی ہے، جو سلگتی ریت پر ابر بہار جیسا ہے، جو ماضی کے شبستاں سے شاعر کو صدائیں

دیتا ہے، وہ جو پیکرِ احساس ہے جو خواہشوں کی سبز وادی میں رہتا ہے، وہ کوئی شبیہ خوش نما ہے، دل کے سادہ کاغذ پر بنتا ہوا چہرہ ہے، جو ہمیشہ شاعر کے تصور میں نمایاں رہتا ہے، جسے وہ کبھی کبھی تنہا سوچنا چاہتے ہیں جب تصورات کے آنگن میں وہ چاندنی بن کر اترتا ہے تو روش روش اس کی چاہت میں جگمگاتے بھی ہیں۔ وہ ایک سیماب خواہشوں کا پیکر ہے، وہ جس کے آنگن کے مہکتے پھول آج بھی شاعر کے ذہن میں تازہ ہیں لیکن اس کا نہ تبدیل ہونے والا پندار اب بھی ویسا ہی قائم ہے، خیالستان میں کہیں کہیں اس کی شبیہ ابھرتی بھی ہے تو لب ورخسار تک آ کر تھم جاتی ہے ،وادی خواب سے بے زار لوٹتی آنکھوں میں جس کی شکستہ پائی کا دکھ شامل ہے ،لیکن جس کو آواز بھر دینے سے بھی اندرونی توڑ پھوڑ شروع ہو جاتی ہے ،ان کا محبوب کسی خواب کی مانند ہے اور ان کا 'وہ خواب طلب گار تماشہ' ہرگز نہیں ہے۔ آپ کے بیشتر اشعار میں اس مجازی خدا کی جھلکیاں نظر آتی ہیں یہ مجازی خدا چلتی پھرتی دنیا کا کوئی عام محبوب نہیں بلکہ بہت ہی باشعوری کے جہاں میں رہنے والی وہ امید ہے، جس کی جستجو کسی عام انسان کے بس کی بات نہیں اس پر وہ ہی قائم رہ سکتا ہے جسے سنگ سے صہبا نچوڑنے کا ہنر آتا ہے۔

دیارِ خوں میں بہے موجِ فن میں آئے کبھی
وہ ایک نام حصارِ سخن میں آئے کبھی

خواب در خواب مہکتی ہوئی وہ چشمِ غزال
آج آنکھوں میں اسی رات کی خوشبو رکھو

تیرا خیال نہ آنا تھا سو نہ آیا ہمیں
مگر یہ کیا کہ کوئی شمع جھلملا بھی گئی

کلامِ اجمل کی ایک اہم جہت اس کا صوتی آہنگ (Acoustic Texture) ہے۔ ان کے مصرعوں میں حروف کی نشست و برخاست اور صوتی تکرار سے ایک ایسا توازن پیدا ہوتا ہے جو اردو غزل کی کلاسیکی روایت کو یاد دلاتا ہے لیکن ساتھ ہی جدید حسیت کا رنگ بھی رکھتا ہے۔ یہ صوتی آہنگ محض شعری حسن کے لیے نہیں بلکہ معنی کی تشکیل میں فعال کردار ادا کرتا ہے۔ یہ اشعار اردو شاعری کے جدید رجحانات اور کلاسیکی استعاراتی نظام کے ایک تخلیقی امتزاج کی عمدہ مثال ہیں۔ انھوں نے روایت سے اخذ کردہ علامتوں جیسے خاک، خون، ہجرت، رقص، اُفق اور پرندہ کو محض روایتی معنوں میں استعمال نہیں کیا، بلکہ انھیں ایک وجودی کرب (Existential Angst) اور تہذیبی شعور کے نئے معنی عطا کیے ہیں۔

اردو شاعری کی اصل قوت اس کی تہذیبی گہرائی، علامتی کثافت اور داخلی معنویت میں مضمر ہے۔ شاعر جب اپنے وجودی تجربات کو بیان کرتا ہے تو وہ محض ذاتی دکھ یا جذبات کی کہانی نہیں کہتا بلکہ ایک پوری تہذیبی یادداشت اور فکری روایت کو اپنی آواز دیتا

کلامِ اجمل کی ایک اہم جہت اس کا صوتی آہنگ (Acoustic Texture) ہے۔ ان کے مصرعوں میں حروف کی نشست و برخاست اور صوتی تکرار سے ایک ایسا توازن پیدا ہوتا ہے جو اردو غزل کی کلاسیکی روایت کو یاد دلاتا ہے لیکن ساتھ ہی جدید حسیت کا رنگ بھی رکھتا ہے۔ یہ صوتی آہنگ محض شعری حسن کے لیے نہیں بلکہ معنی کی تشکیل میں فعال کردار ادا کرتا ہے۔ یہ اشعار اردو شاعری کے جدید رجحانات اور کلاسیکی استعاراتی نظام کے ایک تخلیقی امتزاج کی عمدہ مثال ہیں۔

ہے۔3 یہ اشعار اسی سلسلے کی ایک روشن مثال ہیں، جہاں کلاسیکی استعاروں کو جدید حسیت کے ساتھ برتا گیا ہے۔ شاعر نے ہجرت، فنا، پرواز اور خاک وخون جیسے روایتی الفاظ کو عناصر کے طور پر نہیں بلکہ معنوی جہات کے نئے دریچے کھولنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ اس میں وہی شعری روش نمایاں ہے جسے فاروقی نے اردو غزل کی اصل طاقت قرار دیا تھا: یعنی معنی کا ''کلامیاتی تسلسل'' اور استعارہ سازی کی ''تہذیبی شعور'' سے جڑی پیچیدگی۔ ان اشعار کو اسی تناظر میں دیکھتے ہیں۔

ہمیں نے رقص کیا نغمہ فنا پر بھی
ہمیں ہی پلکوں پہ ہجرت کا بار اٹھانا تھا

بال و پر کی وسعتوں میں قید ہوں
میں پرندہ دُور اُفق کے پار کا

خاک سے خون کو ہم رنگ کیا ہے اجمل
اپنے ہونے کا یہی ایک سبب آخری ہے

رقص کا تعلق عموماً سرشاری اور وجد سے ہے، مگر کبیر اجمل نے اسے فنا کے نغمے کے ساتھ جوڑ کر اس کی تہذیبی معنویت کو نیا رخ دیا ہے۔ ''پلکوں پہ ہجرت کا بار'' کی ترکیب میں نزاکت اور سنگینی کا امتزاج فاروقی کے اس نکتے کو ذہن میں لاتا ہے کہ اردو غزل کی اصل طاقت اس کی ''خیال پرستی'' اور ''کلامیاتی تخیل'' (Rhetorical Imagination) ہے، جو بیک وقت جمالیاتی اور فکری سطح پر معنی پیدا کرتی ہے۔

دوسرے شعر میں شاعر نے آزادی اور اسارت کے تضاد کو علامتی پیرائے میں بیان کیا ہے۔ بال و پر پرواز اور حریت کی علامت ہیں، لیکن یہاں وہی آزادی قید کا استعارہ بن گئی ہے۔ شاعر کی یہ خود آگاہی کہ وہ ''افق کے پار کا پرندہ'' ہے، اس کے داخلی اضطراب، بے وطنی اور غیر محدود خواہشات کو ظاہر کرتی ہے۔ اس استعارے میں جدید اردو شاعری کی علامتی روایت کی بازگشت سنائی دیتی ہے جو اقبال، میراجی اور ن م راشد کے بعد انسانی وجود کی وسعت اور محدودیت کو فلسفیانہ تناظر میں پیش کرتی ہے۔ تیسرا شعر اردو شاعری کے کلاسیکی مابعد الطبیعیاتی ڈسکورس کی جدید قرأت ہے۔ ''خاک'' اور ''خون'' اردو شعری روایت میں حیات و ممات کی علامتیں ہیں۔ شاعر نے اس تضاد کو فلسفیانہ انداز میں استعمال کرتے ہوئے زندگی کی معنویت موت اور فنا کے شعور ہی سے اخذ کی ہے۔ یہ رویہ محض قنوطیت نہیں بلکہ وہ فکری پیچیدگی ہے جو جدید اردو غزل میں معنی کے کئی پرت پیدا کرتی ہے۔

یہ اشعار فاروقی کے اس تصور کو عملی صورت دیتے ہیں کہ اردو شاعری محض رومان یا جذباتیت کا اظہار نہیں بلکہ تہذیبی شعور، علامتی استعارہ سازی اور جمالیاتی فکر کا امتزاج ہے۔4 ان اشعار میں داخلی کرب کو جمالیاتی اظہار میں ڈھالا گیا ہے، اور یہی جمالیاتی رویہ اردو غزل کی کلاسیکی روایت کی اصل شناخت ہے۔ شاعر روایت کے استعارے استعمال کرتے ہوئے بھی ان

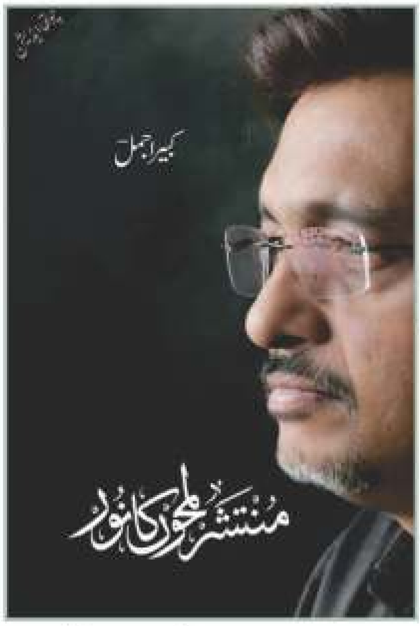

میں نئے معنوی امکانات پیدا کرتا ہے؛ یہی عمل اسے محض کلاسیکی پیروی سے بلند کر کے جدید حسیت کے دائرے میں داخل کرتا ہے۔ یوں یہ تینوں اشعار ایک ساتھ مل کر اردو شعری روایت کے دو اہم پہلوؤں، علامتی روایت کی تسلسل پذیری اور جدید ذہن کی وجودی پیچیدگی کو سامنے لاتے ہیں۔ ان میں 'ہجرت' محض جغرافیائی تجربہ نہیں بلکہ تہذیبی یادداشت اور داخلی بے وطنی کی علامت ہے؛ 'پرندہ' صرف ایک مخلوق نہیں بلکہ انسانی ارادے اور تخیل کی لاحدود پرواز کی تمثیل ہے؛ اور 'خاک و خون' حیات اور فنا کی ازلی کشمکش کا بیانیہ ہے۔ یہ سب مل کر اردو شاعری کی اس قوتِ تخلیق کی گواہی دیتے ہیں جو زمانے کے تغیرات کے باوجود معنی کی نئی جہات پیدا کرتی رہتی ہے۔

جس دور کی شاعری کبیر اجمل کی ہے، اس میں جدت پسندی اور تجربات کی شدت کا زور تھا۔ اس ادبی ماحول میں اکثر شعرا مایوس اور Pessimist دکھائی دیتے ہیں، زندگی کے زنگ آلود پیچ و خم اور روزمرہ کی رکاوٹوں سے تھک کر۔ ایسے میں کبیر اجمل ایک حوصلہ مند اور پُرعزم شاعر کے طور پر ابھرتے ہیں، جو مشکلات کے باوجود امید، عزم اور زندگی کی مثبت بصیرت کے پرچار میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کے اشعار میں غالب کی طرح وجودی خوش بینی اور داخلی قوت کی جھلک نمایاں ہے، جو اس دور کے ادبی منظر نامے میں تازگی اور نیا رنگ لے کر آتی ہے۔

بہت ہوا تو ہواؤں کے ساتھ رو لوں گا
ابھی تو ضد ہے مجھے کشتیاں ڈبونے دے

چلے چلو یوں ہی جب تک سفر کشادہ ہے
زمین کہیں نہ کہیں آسمان ہوتی ہے

ستارے بے سبب بجھتے نہیں ہیں
میں سورج بن کے آنگن میں کھڑا ہوں

انھی سے مجھ کو ملا عزمِ زندگی اجمل
میں جانتا ہوں کہ کیا ہے مقام پھولوں کا

کبیر اجمل کے یہ اشعار اپنے ادبی وزن، استعارے، اور معنوی گہرائی کے اعتبار سے اس دور کی شاعری میں ایک تازگی اور نیا زاویہ پیش کرتے ہیں۔ جہاں اس دور کے بیشتر شعرا Pessimist اور زندگی کے تلخ حقائق سے تھکے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، وہیں کبیر اجمل ایک حوصلہ مند، امید افروز اور زندگی کی جدوجہد پر یقین رکھنے والے شاعر کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ ان اشعار میں کشتیاں ڈوبانے کی تصویر محض خارجی حالات کی عکاسی نہیں بلکہ شاعر کے اندرونی عزم اور استقلال کی علامت بھی ہے، زمین اور آسمان کا استعارہ نہ صرف جغرافیائی بلکہ معنوی حقیقتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے، یعنی ہر رکاوٹ کے باوجود ہر جگہ میں نیا موقع اور نئی امید موجود ہے، یہ شعر شاعر کی خود اعتمادی، خودی اور داخلی قوت کی واضح تصویر پیش کرتا ہے۔ ستارے جو رکاوٹ یا مشکلات کی علامت ہیں، اپنی جگہ برقرار ہیں، یہاں سورج شاعر کے عزم اور حوصلے کا عمدہ استعارہ بن کر سامنے آیا ہے، پھولوں کا مقام جاننا محض جمالیاتی غور نہیں بلکہ وجودی اور فلسفیانہ فہم کی علامت ہے، جو ہر چھوٹی چیز میں زندگی کی معنویت تلاش کرنے کی قوت کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کی شاعری میں خود اعتمادی، داخلی روشنی، مثبت رجحان، اور وجودی خوش بینی کی جھلک واضح ہے۔ مزید برآں، ان کے اشعار کی ساخت، استعارہ نگاری، اور زندگی کے تجربات کو عاطفی و فکری زاویے سے پیش کرنے کا انداز انھیں ادبی طور پر ممتاز کرتا ہے۔ ہر شعر نہ صرف شخصی عزم اور حوصلہ کی نمائندگی کرتا ہے بلکہ وجودی اور فلسفیانہ بصیرت بھی پیش کرتا ہے، جو غالب کے Optimism کی یاد دلاتی ہے۔ یہ اشعار اس بات کی گواہی ہیں کہ کبیر اجمل نے اپنی شاعری میں زمانے کی مایوسی اور ادبی رجحانات کے باوجود زندگی کی روشنی اور امید کو برقرار رکھا۔

جس دور کی شاعری کبیر اجمل کی ہے، اس میں جدت پسندی اورتجربات کی شدت کازور تھا۔ اس ادبی ماحول میں اکثر شعرا مایوس اورPessimist دکھائی دیتے ہیں۔ زندگی کے زنگ آلود پیچ و خم اور روزمرہ کی رکاوٹوں سے تھک کر۔ ایسے میں کبیر اجمل ایک حوصلہ مند اور پُرعزم شاعر کے طور پر ابھرتے ہیں، جو مشکلات کے باوجود امید، عزم اور زندگی کی مثبت بصیرت کے پرچار میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کے اشعار میں غالب کی طرح وجودی خوش بینی اور داخلی قوت کی جھلک نمایاں ہے، جو اس دور کے ادبی منظرنامے میں تازگی اور نیا رنگ لے کر آتی ہے۔

کبیر اجمل نے کہیں کہیں اساطیری واقعات کو بھی استعاراتی فضا دی ہے اور اپنے عہد سے ہم آہنگ کیا ہے یہ بھی ان کی غزلوں میں معنویت کی ایک جہت ہے۔

میں اپنی فکر کا کوہ ندا ہوں
کوئی حاتم مرے اندر بھی آئے

زندگی تو کسی حاتم کی کہانی نہ سنا
عزم کی راہ میں بے جان شگوفے ہیں بہت

کوہ ندا اور حاتم کے حوالے سے جو شعر کہے گئے ہیں ان میں پہلے شعر میں خود اپنے اندر پوشیدہ خزانوں کی تلاش کی تمنا ظاہر کی گئی ہے دوسرے شعر میں حاتم کی کہانی سے بیزاری کا اظہار اس لیے کیا گیا ہے کہ عصر رواں خود میں اس قدر پیچیدہ مسائل رکھتا ہے کہ انھیں حل کرنا گویا لاشوں میں نئی روح پھونکنے جیسا ہے۔

حوالہ جات

1 شمس الرحمان فاروقی: لفظ و معنی، ص 39، شب خون کتاب گھر الہ آباد 1968

2 یعقوب یاور: منتشر لمحوں کا نور، مضمون، ص 13، اسکرین پلے پبلی کیشنز، بنارس 2007

3 شمیم حنفی: اردو شاعری کی فلسفیانہ اساس، ص 245، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ انڈیا، 1977

Dr. Fahmina Ali
Aligarh Muslim University
Aligarh (U.P)
Mob.: 7379636764
E-mail: anam.fahmina04@gmail.com

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم 'زبان اور زمینی صورتِ حال' کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے۔ یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تا کہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورتِ حال سے آگاہ ہوسکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورتِ حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➢

مشتاق احمد

جمال اویسی

پاسدارِ شعر و سخن

موجودہ عہد میں جن شاعروں نے اپنی سنجیدہ فکر، تخلیقی بصیرت اور فنی مہارت کے ذریعے اردو شاعری کو تازہ لہجہ عطا کیا، ان میں جمال اویسی (28/جنوری 1961 ۔ 07/مارچ 2026) کا نام نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ جمال اویسی اردو کی نئی نسل کے ان شعرا میں شامل ہیں جنھوں نے نظم، رباعی اور غزل تینوں اصناف میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا اور اپنے منفرد لہجے کے ذریعے ایک الگ شناخت قائم کی۔ جمال اویسی کی شاعری میں روایت اور جدت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ وہ کلاسیکی شعری روایت سے گہرا رشتہ رکھتے ہوئے بھی جدید عہد کے مسائل، انسانی احساسات اور سماجی حقیقتوں کو اپنے کلام کا موضوع بناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں ایک طرف فکری گہرائی ہے تو دوسری طرف جذبے کی شدت اور تخیل کی تازگی بھی نمایاں نظر آتی ہے۔

جمال اویسی کا اصل نام جمال احمد خاں، ولد پروفیسر اویس احمد دوراں تھا۔ ان کی پیدائش 28/جنوری 1961 کو محلّہ فیض اللہ خاں، دربھنگہ میں ہوئی تھی۔ انھوں نے ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ سے 1984 میں ایم اے اردو کی ڈگری حاصل کی تھی اور 2015 میں پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی تھی۔ بقول مرحوم جمال اویسی انھوں نے اپنی شاعری کی ابتدا 1975 میں کی تھی۔ وہ درس وتدریس سے وابستہ تھے۔ 1996 میں بطور اردو لکچرار ان کی پہلی پوسٹنگ جی ڈی کالج، بیگوسرائے، بہار میں ہوئی تھی۔ بعدۂ وہ ملّت کالج، دربھنگہ اور فی الحال ایم آر ایم کالج، دربھنگہ میں صدر شعبۂ اردو کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ حالیہ دنوں میں بیمار چل رہے تھے اور دن بہ دن ان کی صحت کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ ان کا ڈائلاسس ہو رہا تھا کہ آخر کار 7/مارچ 2026 کی شب میں ایک مقامی ہسپتال میں ان کا انتقال ہوگیا اور 8/مارچ 2026 کو رحم گنج دربھنگہ کے مقامی قبرستان میں مدفون ہوئے۔ لواحقین میں ایک لڑکا ایک لڑکی ہے۔ ان کی بیگم کا انتقال چھ ماہ قبل ہوگیا تھا۔

جمال اویسی اردو کی نئی نسل کے ان مستند شعرا میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے نظم اور غزل دونوں اصناف میں اپنی الگ شناخت قائم کی۔ ان کی شاعری میں داخلی کرب، سماجی شعور، روحانی احساس اور جمالیاتی لطافت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ جمال اویسی کی شاعری کا سب سے نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ روایت سے جڑے ہوئے بھی ہیں اور جدید حسیت کے ترجمان بھی۔ انھوں نے اپنے کلام میں کلاسیکی شعری اقدار کو برقرار رکھتے ہوئے نئے زمانے کے مسائل کو بڑی فنی مہارت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری نئی نسل کے لیے بھی پرکشش ہے اور سنجیدہ قارئین کے لیے بھی فکر انگیز۔ جمال اویسی کی نظم نگاری ان کے شعری سرمایے کا اہم حصہ ہے۔ ان کی نظموں میں عہد حاضر کے مسائل، انسانی المیے، سماجی تضادات اور روحانی تلاش کے موضوعات نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کی نظموں میں علامت اور استعارہ کا استعمال نہایت بلیغ اور معنی خیز ہے۔

جمال اویسی بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے۔ ان کی نظموں میں عہدِ حاضر کے انسان کی داخلی کشمکش، سماجی ناانصافیاں، انسانی تنہائی اور روحانی تلاش جیسے موضوعات نمایاں ہیں۔ ان کی نظموں میں علامت اور استعارہ کا استعمال نہایت بامعنی اور مؤثر ہے۔ لیکن ان کی غزلیہ شاعری بھی اپنے لہجے کے اعتبار سے منفرد شناخت رکھتی ہے۔ اب تک ان کے مندرجہ ذیل شعری مجموعے شائع ہو چکے تھے۔ ''رکا ہوا سیل (غزل/رباعی) 2002، نظم نظم (نظمیں) 2004، شور کے درمیان (غزلیں) 2006، مصباح (رباعیات) 2007، انا پذیر (غزلیں) 2012، نقشِ گریز (نظمیں) 2017، عشق کے سوا (غزلیں) 2017۔ اس کے علاوہ ان کی تین تنقیدی کتابیں بھی شائع ہوئی تھیں ان میں ''اویس احمد دوراں: ایک بازدید (2015)، جدید اردو تنقید (2017) اور ''مظہر امام: نئے منظرنامے میں'' شامل ہیں۔

جمال اویسی کو شاعری وراثت میں ملی تھی۔ ان کے والد اویس احمد دوراں اردو کے مشہور ترقی پسند شاعر تھے۔ غرض کہ جمال اویسی کو شعروشاعری کا ماحول گھر سے ضرور ملا لیکن وہ فطری صلاحیت کے مالک تھے اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیت کی بدولت نئی نسل کی صف میں نمایاں حیثیت حاصل کی۔ راقم الحروف نے ان کے پہلے شعری مجموعہ ''رکا ہوا سیل'' پر بھی ایک مضمون لکھا تھا اور اس میں ان کے شعری انفراد

سے بحث کی تھی کہ جمال اویسی لفظوں کے اندھیرے جنگل کا جگنو ہے۔ وہ مضمون میری تنقیدی کتاب ''تنقیدی تقاضے'' (مطبوعہ 2003) میں شامل ہے۔ جمال اویسی اپنی تمام کتابیں مجھے عنایت کرتے تھے اور یہ گذارش بھی کہ اس پر میں مضمون لکھوں لیکن میں انھیں بارہا یہی کہتا تھا کہ آپ کی شاعری کے تعلق سے میں نے ''رکا ہوا سیل'' پر جو کچھ لکھا تھا اس پر آج بھی قائم ہوں البتہ آپ کی شاعری فکری گہرائی اور گیرائی کے اعتبار سے نکھرتی جارہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جمال اویسی کے شعری مجموعوں کے مطالعے سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کے شعری سفر میں جستہ جستہ نہ صرف فکر و نظر کی تبدیلی واقع ہوتی رہی ہے بلکہ موضوعی اعتبار سے بھی ان کا قبلہ بدلتا رہا ہے۔ فن کی کسوٹی پر ان کی نظمیں زیادہ کسی ہوئی نظر آتی ہیں اور غزلوں میں کہیں کہیں بکھراؤ نظر آتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ انھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ ایک زبردست شعری رجحان کی توسیع کی، بالخصوص جدید مسائل کو کلاسیکی کیفیت کے ساتھ پیش کرنے کا ہنر انھیں خوب آتا تھا اور یہی وصف ان کے اظہار میں بانکپن اور حسن پیدا کرتا تھا۔ انھوں نے نہ تو روایت سے بغاوت برائے بغاوت کی راہ اختیار کی اور نہ نئے رجحانات کے تئیں تعصب سے کام لیا۔ ان کی شاعری میں رچا ہوا شعور اور پختہ ذہن کارفرما ہے جو مختلف اصناف میں پوری قوت کے ساتھ اپنا اظہار کرتا ہے۔ فکر و شعور کے ساتھ قلب و روح کے شدید تقاضوں کا ذوق لطیف اور ذوق کا وجدان میں بدل جانا اس وجدانی کیفیت کو شعری اظہار بنانا ان کا انفراد تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں زندگی کے ہزار رنگ دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن ہر ایک رنگ میں ایک نئی دنیا آباد نظر آتی ہے۔

بہرکیف! جمال اویسی کی شاعری اس عہد کے انسانی کرب و اضطراب کی ترجمان ہے اور فکری و نظری اعتبار سے حقوق انسانی کی پاسدار بھی۔ پہلے چند نظموں کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ ''نقش گریز'' (مطبوعہ 2019) ایک طرح سے ان کی نظموں کا کلیات ہے کہ اس میں 1978 سے 2016 تک کی نظمیں شامل ہیں اور خود جمال اویسی نے یہ اعتراف کیا ہے کہ:

''میری نظموں کا موضوع تقریباً ایک ہی ہے۔ انسان اور انسانی زندگی، لیکن انسانی مسائل کی سطح پر کسی جمہور کا خواب نہ دیکھا ہے اور نہ دکھانے کی کوشش کی ہے..... میری نظموں میں انسانی مسائل جدید شاعری کے مسائل بھی نہیں ہیں۔ میری نظمیں ایک سلسلہ وار فکری مکالمے کی صورت میں پڑھی جائیں تو زیادہ صحیح رہے گا'' (نقش گریز۔ پیش لفظ، ص:27)

جمال اویسی کو شاعری وراثت میں ملی تھی۔ ان کے والد اویس احمد دوراں اردو کے مشہور ترقی پسند شاعر تھے۔ غرض کہ جمال اویسی کو شعر و شاعری کا ماحول گھر سے ضرور ملا لیکن وہ فطری صلاحیت کے مالک تھے اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیت کی بدولت نئی نسل کی صف میں نمایاں حیثیت حاصل کی۔

ظاہر ہے کہ جب شاعر خود یہ اعتراف کر رہا ہے کہ اس کی نظموں کا موضوع تقریباً ایک ہی ہے اس لیے اسی تناظر میں جب ہم جمال اویسی کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اردو میں جو نظمیہ شاعری کی روایت ہے اس سے قدرے مختلف ہے۔ یہاں طویل نظموں کی گنجائش ممکن نہیں، چند مختصر نظمیں ملاحظہ کیجیے۔ نظم ''باغی'' کے اشعار ملاحظہ کیجیے۔

لفظ جب گونجتا ہے گنبد میں
کرنے لگتا ہے اک شگاف وہاں
اور انسان بیکراں مخلوق
ڈرنے لگتا ہے ناگہانی سے
گر یہ گنبد نما طلسم گرا
وہ بھی نابود اگلے پل ہوگا

ایک نظم اور ''چراغ کے لئے ایک نظم'' ملاحظہ کیجیے۔

آخر شب اے ہمسفر دور فلک سے آئے گی
بجھتے ستاروں کی ضیا چاند کی زرد روشنی
ہم نے چراغ سب کے سب صبح کے نام کر دیے
صبح پیام کائنات جس کے طلوع کے لیے
روز چراغ جلتے ہیں اور بجھائے جاتے ہیں

ایک نظم ''روشنی کا ٹوٹنا'' سے کچھ مصرعے دیکھیے۔

روشنی کا ٹوٹنا دیکھا ہے کس نے
میری آنکھوں میں چبھن اب تک ہے باقی
روشنی کی اک کرن جس لمحہ ٹوٹی
میں دریچے سے سٹا کچھ دیکھنے میں محو تھا

مذکورہ نظموں میں شاعر نے جدید شہری زندگی کی ایک علامتی تصویر پیش کی ہے۔ روشنی کے باوجود اندھیرے کا تصور دراصل اس دور کے اخلاقی اور روحانی بحران کی علامت ہے۔ جمال اویسی کی نظموں میں انسان کی داخلی تنہائی بھی بار بار سامنے آتی ہے۔ وہ جدید انسان کے اس کرب کو محسوس کرتے ہیں جو ترقی اور آسائش کے باوجود روحانی سکون سے محروم ہے۔
ایک اور نظم کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

میں نے وقت کے صحرا میں کئی خواب بوئے
لیکن ہوا نے سب چراغ بجھا ڈالے
اب میں خاموش کھڑا ہوں اسی ویرانے میں
جیسے خود اپنی صدا بھی مجھے پہچانتی نہیں

یہاں شاعر نے انسانی محرومی اور ناکامی کو ایک علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ صحرا اور چراغ کے استعارے شاعر کی فکری گہرائی کو ظاہر کرتے ہیں۔ جمال اویسی کی نظموں کی ایک بڑی خصوصیت ان کا علامتی اسلوب ہے۔ وہ براہ راست بیان کے بجائے علامتوں کے ذریعے اپنے خیالات کو زیادہ مؤثر اور دیرپا بنا دیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں چراغ، آئینہ، دریا، رات، سفر اور شہر جیسی علامتیں بار بار سامنے آتی ہیں۔ ان کی غزلوں کی طرف رخ کرتے ہیں تو یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ جمال اویسی کی غزلیہ شاعری کے موضوعات ان کی نظمیہ شاعری سے بہت مختلف نہیں ہیں بلکہ غزل میں بھی وجودی ہلاکت خیزی اور انسان کی اخلاقی پستی کو موضوع بنایا ہے۔ جیسا کہ اپنے شعری مجموعہ ''محیط'' کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ:

''اب تک میری غزلیہ شاعری کے متعلقات

انسان اوراس کی شکست وریخت کی اَن گنت داستانیں رہیں‘‘(ص:16)

پروفیسر وہاب اشرفی نے جمال اویسی کے شعری مجموعہ’’عشق کے سوا‘‘ کے فلیپ پر بہت کارآمد باتیں لکھی تھیں کہ جمال اویسی کے یہاں روایت کا بھی پاس ملتا ہے جسے تتبع یا نقل نہیں کہہ سکتے بلکہ نئے موضوعات کو پرانے سانچے میں سلیقے سے پیش کرنے کے عزم سے تعبیر کر سکتے ہیں‘‘۔ بلاشبہ ان کی غزلیں کلاسیکیت کی زمین میں پروان چڑھتی ہیں اور تناوری کے بعد جدیدیت کے ثمر سے بارآور ہوتی ہیں۔اس لیے ان کے غزلیہ اشعار بھی ان کے ہم عصروں میں کافی مقبول رہے اور ان کے لہجے کی گونج بھی سنائی دیتی رہی۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

میں اندھیروں سے ،اجالوں سے پرے ہوتا ہوا
صبح ہی کیا ہے مرے واسطے اور رات ہی کیا

سب کو ایک طرف ہے جانا چاروں سمت سے لوگ آ جائیں
گونگا ایک سفر ہے جس میں گونگی ہر رودادِ بشر ہے

آشفتہ نوائی مرا اکرام نہیں ہے
جس طرح میں جیتا ہوں بڑا کام نہیں ہے

میں بدن کے دار پر جس روز لٹکایا گیا
ہر ستارہ سرنگوں تھا یاد آتا ہے مجھے

تصادم ہے مجھ میں کئی قرنوں کا
نیا آدمی ہوں پر اسرار میں

تم آئے بیٹھے ذرا دیر ، پھر چلے بھی گئے
نظر اٹھائی تو دیکھا کہ آسماں بدلا

مذکورہ اشعار صرف فرد واحد کے کرب کی تصویر نہیں بلکہ پورے عہد کی علامت ہیں۔ جمال اویسی کی غزلیہ شاعری بھی ان کی ادبی شناخت کا اہم حصہ ہے۔ اگرچہ ان کی نظموں میں فکری وسعت زیادہ نمایاں ہے، لیکن ان کی غزلوں میں جذبات کی شدت اور زبان کی لطافت قابل توجہ ہے۔ان کی غزلوں میں کلاسیکی اردو غزل کی روایت بھی جھلکتی ہے اور جدید عہد کے احساسات بھی۔ یہ اشعار شاعر کے داخلی تجربے اور فلسفیانہ سوچ کو ظاہر کرتے ہیں۔ جمال اویسی کی شاعری کی زبان سادہ، شستہ اور بامحاورہ ہے۔ وہ مشکل الفاظ اور پیچیدہ تراکیب کے بجائے عام فہم زبان کو ترجیح دیتے ہیں۔ان کی یہی سادگی قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ان کے کلام میں ایک خاص موسیقیت بھی پائی جاتی ہے۔ جمال اویسی کی شاعری کا ایک اہم پہلو ان کا سماجی شعور ہے۔ وہ اپنے عہد کے مسائل سے بے خبر نہیں بلکہ ان پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ان کی شاعری میں ناانصافی، ظلم اور انسانی محرومیوں کے خلاف ایک خاموش احتجاج ملتا ہے۔

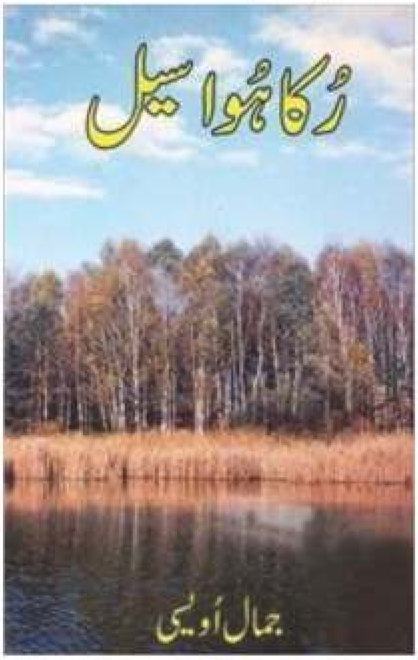

اک ایسی سمت جدھر کب سے ہو کا عالم ہے
میں جا رہا ہوں اکیلا قدم بڑھاتے ہوئے

یہ شعر امید اور حوصلے کے احساس سے لبریز ہے۔اردو کے بعض ناقدین کے مطابق جمال اویسی کی شاعری میں جدید عہد کی فکری پیچیدگیوں کو بڑی سادگی سے بیان کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ان کے کلام میں نہ صرف فکری گہرائی ہے بلکہ ایک خاص قسم کی صداقت بھی پائی جاتی ہے جو قاری کو متاثر کرتی ہے۔ان کی شاعری کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ وہ جذباتی اظہار کے ساتھ ساتھ فکری استدلال کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام محض جذباتی نہیں بلکہ فکری طور پر بھی مضبوط نظر آتا ہے۔ اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو جمال اویسی کی شاعری میں چند نمایاں خصوصیات سامنے آتی ہیں(1) فکری گہرائی اور فلسفیانہ انداز(2)علامتی اور استعاراتی اظہار(3) زبان کی سادگی اور شگفتگی (4) سماجی شعور اور انسانی ہمدردی(5) روایت اور جدت کا حسین امتزاج۔ یہ تمام خصوصیات انھیں نئی نسل کے معتبر شعرا کی صف میں نمایاں مقام عطا کرتی ہیں۔

اردو شاعری میں صنف رباعی ایک مشکل صنف سمجھی جاتی ہے کیوں کہ عروض کے اعتبار سے اس کا دائرہ بہت محدود ہوتا ہے۔ رباعی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ قاری پڑھتے ہی متحیر ہو جائے اور ایسا اسی وقت ہو سکتا ہے جب چاروں مصرعوں میں یکسانیت ، برجستگی، شگفتگی اور روانی ہو۔ جمال اویسی اپنی رباعیوں میں بھی مختلف مضامین کو جدت اور ندرت کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور اس میں وہ کامیاب بھی ہیں۔ان کی رباعیوں کا مجموعہ’’مصباح‘‘ دنیائے ادب میں مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔

انھوں نے اپنے پہلے شعری مجموعہ’’رکا ہوا سیل‘‘ میں’’چراغ‘‘سیریز کے تحت چند غزلیں شامل کی تھیں۔ ان کے مطالعے سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ اردو میں چراغ کو جس معنی میں استعمال کیا جاتا رہا ہے اس معنی میں جمال اویسی نے اس کا استعمال نہیں کیا ہے بلکہ چراغ ان کے یہاں نت نئے استعارے بن جاتے ہیں۔

مختصر یہ کہ جمال اویسی اردو شاعری کی نئی نسل کے ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی نظموں، رباعیوں اور غزلوں کے ذریعے اردو ادب میں ایک معنی خیز اضافہ کیا ہے۔ان کی شاعری میں انسان کی داخلی دنیا، سماجی حقیقتیں اور جمالیاتی احساسات ایک ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ان کا کلام اس بات کی دلیل ہے کہ اردو شاعری کی روایت آج بھی زندہ اور متحرک ہے۔ جمال اویسی جیسے شعرا اس روایت کو نہ صرف آگے بڑھا رہے ہیں بلکہ اسے نئے فکری اور تخلیقی امکانات سے بھی روشناس کرا رہے ہیں۔یقیناً جمال اویسی کا شعری سرمایہ آنے والے زمانوں میں بھی اردو ادب کے قارئین اور ناقدین کے لیے باعثِ دلچسپی اور قابل مطالعہ رہے گا۔افسوس صد افسوس کہ اردو کی نئی نسل کا ایک نمائندہ شاعر 7/مارچ 2026 کی شب میں اس دارِ فانی سے رخصت ہو گیا لیکن اس کا شعری سرمایہ دنیائے ادب میں اسے ہمیشہ زندہ جاوید رکھے گا کہ اس کی غزلیہ اور نظمیہ شاعری اپنے عہد کی آئینہ دار ہے۔

■

Professor Mushtaque Ahmad
Principal C.M Collage, Darbhnga, (Bihar)
Mob.9431414586
Email: rm.meezan@gmail.com

جیلانی بانو بحیثیت افسانہ نگار

فیضان الحق

جیلانی بانو اردو ادب کی تخلیقی دنیا کا ایسا نام ہے جس نے ایک لمبا سفر طے کیا۔ 14 جولائی 1926 کو بدایوں میں پیدا ہونے والی یہ تخلیق کار 1 مارچ 2026 کو حیدرآباد میں اپنی رحلت سے اردو دنیا کو سوگوار کر گئی۔ جیلانی بانو کا انتقال اس اعتبار سے ایک عہد کا خاتمہ ہے کہ انھوں نے مختلف ادبی رجحانات و میلانات اور ہنگامہ آرائیوں کے درمیان اپنی ایک منفرد شناخت حاصل کی۔ حکومت ہند نے ان کی خدمات کے اعتراف میں 'پدم شری' اعزاز سے نوازا۔ ان کے والد علامہ حیرت بدایونی اور خاوند انور معظم سے پوری اردو دنیا واقف ہے۔ انھوں نے ناول، افسانہ، تراجم اور ڈرامے کی جانب خاص توجہ دی۔ ناولوں میں ایوان غزل (1976) اور بارش سنگ (1985) کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔ ان کا پہلا افسانہ 'ایک نظر ادھر بھی' 1952 میں شائع ہوا۔ ''موم کی مریم'' جو اولا ماہنامہ 'سویرا' میں اور پھر پہلے مجموعہ 'روشنی کے مینار (1958) میں شائع ہوا ان کی شہرت اور مقبولیت کا اہم سبب بنا۔

جیلانی بانو کا نام تقسیم ہند اور آزادی کے بعد امتیازی شناخت حاصل کرنے والے افسانہ نگاروں میں سرفہرست ہے۔ جیلانی بانو کی افسانہ نگاری کا آغاز ایک ایسے دور میں ہوا جب ترقی پسند تحریک روبہ زوال تھی اور اردو افسانہ نئے نئے موضوعات و اسالیب کی تلاش میں تھا۔ جدیدیت کے آثار بھی نظر آرہے تھے لیکن ان کی کوئی واضح شکل موجود نہیں تھی۔ فسادات سے متعلق بے شمار افسانے لکھے جا چکے تھے اور ان میں کسی نئے زاویے کی گنجائش بہت کم تھی۔ اسی طرح امن دوستی انسانیت اتحاد اور بھائی چارہ کے مسائل پر بھی بے شمار افسانے تخلیق کیے جا رہے تھے جیلانی بانو کا فکری رشتہ ان موضوعات سے کم ہی قائم ہو سکا تھا۔ انھوں نے زندگی اور معاشرت کو جذبات اور حسیات کا حصہ بنایا اور انہی خطوط پر افسانے کی بنیاد رکھنا چاہتی تھیں۔ اپنے پہلے افسانوی مجموعہ روشنی کے مینار کے دیباچے میں موضوعات کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

''یہ بڑی مایوس کن بات تھی کہ جب میں نے لکھنا شروع کیا تو ادب میں موضوع کچھ ختم سے ہو چکے تھے۔ یعنی وہ ایک خاص فضا نہیں تھی جب موضوع کا مینہ برستا ہے۔ افسانہ نگاروں اور شاعروں کی بن آتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم، 47 کا تہلکہ، حیدرآباد کا پولیس ایکشن اور تلنگانے کے نعرے، اب ہر طرف سناٹا چھا رہا تھا۔ بھیونڈی کانفرنس بھی ہو چکی تھی۔ یعنی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے اور ایک صبح اچانک مشہور ادیب بنے ہوئے جاگنے کے سارے مواقع نکل چکے تھے۔ البتہ امن کانفرنسوں کی دھوم مچی ہوئی تھی۔''

(روشنی کے مینار، ص 9-10)

موضوعات کی قلت کا جو شکوہ جیلانی بانو نے پیش کیا ہے اسے افسانہ نگاری کے نئے رجحان کے طور پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کی تحریر اس بات کی بھی گواہ ہے کہ ہنگامہ پسند ادب کی تخلیق اور قرات پر غبار چھانے لگا تھا اور تخلیق کار نئے موضوعات و مسائل کی تلاش میں تھا۔ ان مسائل کا تعلق انسانی زندگی کے خارج سے اس طرح نہیں تھا جس طرح اس سے پہلے نظر آرہا تھا۔ معاشرتی زندگی نئے زاویوں سے تخلیق کاروں پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ تخلیق کار نے باطن میں دیکھنے کی شروعات ضرور کر دی تھی لیکن مکمل طور پر وہ خود پسند نہیں ہوا تھا۔ جیلانی بانو نے اسی وقفے میں افسانہ نگاری کے لیے جن موضوعات کا انتخاب کیا وہ متوسط طبقے کی گھریلو زندگی، خواتین کے مسائل اور اقتصادی و معاشرتی تبدیلیوں سے پیدا شدہ حالات سے متعلق تھے۔

جیلانی بانو کے افسانوی مجموعوں میں، روشنی کے مینار، پرایا گھر، رات کے مسافر، یہ کون ہنسا، تریاگ، نئی عورت، سچ کے سوا، بات پھولوں کی، کن اور راستہ بند ہے شامل ہیں۔ اس مضمون میں مختلف حوالوں کے علاوہ ان کے آخری افسانوی مجموعہ ''راستہ بند ہے' کے افسانوں کا خصوصی جائزہ لیا گیا ہے۔

'راستہ بند ہے' جیلانی بانو کے دیگر مجموعوں سے کئی اعتبار سے مختلف ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں جیلانی بانو کے تخلیقی سفر کے تمام تجربات اور

رجحانات امتزاجی صورت میں نظر آتے ہیں۔ موضوعات اور زبان و اسلوب دونوں سطحوں پر اس مجموعے میں انفرادیت موجود ہے۔ یہ افسانے سیاسی شعور، نسائی لب ولہجہ اور سماجی نا انصافیوں کے خلاف صدائے احتجاج پر مشتمل ہیں۔ مجموعے میں ایسے افسانے بھی شامل ہیں جن کا مطالعہ وجودی نقطۂ نظر سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ ہیت وتکنیک اور زبان و اسلوب کی سطح پر کئی تجربات نظر آتے ہیں۔ بعض افسانے کہانی پن اور بیانیہ سے بھرپور، بعض علامتی انداز کے حامل اور بعض نئے تجربوں پر مشتمل ہیں۔ کچھ افسانوں کی زبان فکشن اور شاعری کی ٹوٹتی حد بندیوں کی مثال ہے۔ مثال کے طور پر مجموعے کا پہلا افسانہ ''کن'' ملاحظہ کریں:

''میرے اوپر ایٹمی ہتھیاروں کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ کیا ایک پل میں یہ دنیا مٹ جائے گی ؟/جھوٹ اور مایوسی کا اندھیرا پھیلا ہوا ہے۔/ میں سر اٹھائے آسمان کی طرف دیکھ رہی ہوں۔/کوئی وعدہ؟ کوئی معجزہ ؟/پھر ایک بار کن کی صدا کیوں نہیں آتی ؟ ننھی رمشا نے میرے ہاتھ سے قلم چھین لیا ہے۔/وہ سفید کاغذ پر جھکی کچھ لکھ رہی ہے۔ میں انتظار کر رہی ہوں۔/ کچھ تو لکھو کہ حرف چمک اٹھیں/کچھ تو بولو کہ روشنی ہو جائے۔'' (راستہ بند ہے، ص7)

جیلانی بانو کے اس افسانے کو نظم سے الگ کرنا مشکل ہے۔ لیکن یہ بھی واضح ہے کہ افسانے میں افسانوی صورت موجود ہے۔ یہاں جیلانی بانو کی عصری حسیت ایک ایسے کردار کی تشکیل کرتی ہے جو خوفزدہ بھی ہے اور پر امید بھی۔ امید اس بات کی کہ شاید خوف کے اس ماحول میں کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے جو اطمینان کی باعث ہو۔ تخلیق کار اس مصنوعی دنیا کی تخریبی ترقیوں سے خائف ہو کر حرف ''کن'' کا منتظر ہے۔ کن ایک ایسا لفظ ہے جس سے کائنات کی تخلیق کی گئی۔ علامہ اقبال نے کہا ہے: 'حاصل کن ہے یہ جہان خراب'۔ گویا ''کن'' خالق کائنات کا وہ جادوئی منتر ہے، جو پلک جھپکتے بیابان کو سبزہ زار میں بدلنے کی قوت رکھتا ہے۔ قرآن میں تخلیق کائنات کا راز'' کن فیکون'' میں مضمر بتایا گیا ہے۔ گویا ''کن'' تخلیق کا بنیادی راز ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے جیلانی بانو کا یہ افسانہ قابل غور ہے۔ اسے ہم تخلیق میں نظم ونثر کی یکتائی کے طور پر دیکھتے ہیں لیکن اس میں صنفی پیچیدگیاں بھی موجود ہیں۔

جیلانی بانو نے خواتین کے مسائل اور حیدرآبادی تہذیب کو اپنی تخلیقات میں خاص طور پر برتا ہے۔ حیدرآباد کی تہذیب سے متعلق ان کا ناول 'ایوان غزل' منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ اسی طرح عورتوں کے مسائل سے متعلق ان کا شاہکار افسانہ ''موم کی مریم'' بھی قابل ذکر ہے۔ موم کی مریم میں جیلانی بانو نے عورت کے نفسیاتی مسائل کو بے حد خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ اس افسانے کا بیانیہ بھی قابل ذکر ہے۔ افسانے کا بیشتر حصہ خود کلامی اور تنہائی کے لمحوں پر مشتمل ہے لیکن ہر جملہ گہرے نفسیاتی شعور کا پتہ دیتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس:

جیلانی بانو نے خواتین کے مسائل اور حیدرآبادی تہذیب کو اپنی تخلیقات میں خاص طور پر برتا ہے۔ حیدرآباد کی تہذیب سے متعلق ان کا ناول 'ایوان غزل' منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ اسی طرح عورتوں کے مسائل سے متعلق ان کا شاہکار افسانہ ''موم کی مریم'' بھی قابل ذکر ہے۔

''اس وقت بھی جب تمہارے سیاہ مستقبل کی طرح کمرے میں تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ تمہارے آنسو یوں چمک رہے ہیں۔ جیسے پر امید بجرنے دریا کی سطح پر چراغوں کی قطار چھوڑ دی ہو۔ میرے کمرے میں تمہارے آنسوؤں نے اجالے کی امید قائم کر رکھی ہے۔۔ہم مشرق کے مرد صدیوں سے اپنی عیش گاہوں میں تمہارے اشکوں سے چراغاں مناتے آئے ہیں''

یہاں خاتون کی موجودگی کا جمالیاتی پہلو بھی موجود ہے اور اس کے ساتھ کی جانے والی معاشرتی زیادتیوں کا اشاریہ بھی۔ راوی کے احساس اور اعتراف کی یہی کیفیت پورے افسانے پر چھائی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ زبان کی تخلیقی صورتوں کے جو نمونے اس افسانے میں موجود ہیں وہ جیلانی بانو کی فن کاری کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

افسانوی مجموعہ ''راستہ بند ہے'' میں عورتوں سے متعلق افسانوں میں اسے کس نے مارا، پردہ گرتا ہے،او کالے برقعے والی، اکیلا اور کل رات ہمارے گھر مرزا غالب اور عصمت چغتائی آئے تھے کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ افسانہ ''کل رات ہمارے گھر مرزا غالب اور عصمت چغتائی آئے تھے'' پہلی نظر میں ایک مزاحیہ افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس افسانے میں مزاح کے پس پردہ سنجیدہ مسائل کو جگہ دی گئی ہے۔ مثلاً غالب کا تصور نسواں یا عورت اور عشق کے تعلق سے غالب کے خیالات۔ افسانہ نگار نے اس باب میں غالب کے خیالات کو عصمت چغتائی کی زبانی بیان کیا ہے۔ عصمت چغتائی نام کے کردار کا اعتراض یہ ہے کہ غالب نے اپنی شاعری میں محبوب کی بے وفائی دکھا کر سب کی محبت سمیٹ لی ہے بس، حالانکہ وہ خود کہاں کسی کے محبوب بننے کے قابل تھے۔ عصمت اس بات کا اعتراف کرتی ہے کہ غالب لمبی کہانی کو ایک شعر میں پرو دینے کا ہنر جانتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ عورتوں سے متعلق اپنے تمام خیالات کا نہایت جوشیلے انداز میں اظہار کرتی ہے اور غالب خاموش رہتے ہیں۔ حقیقی سطح پر غالب جیسے حاضر جواب اور بذلہ سنج کی یہ خاموشی غیر یقینی ہے۔ لیکن افسانوی کردار ہونے کے سبب ہمیں یقین کرنا پڑتا ہے۔ جیلانی بانو نے اس افسانے میں غالب اور عصمت دونوں کو جنتی قرار دیا ہے۔ غالب کی بخشائش کا راز ان کی مشکل شاعری ہے جسے سن کر بہت سے لوگوں نے شعر کہنا بند کر دیا اور عوام بے کار کی باتیں سننے سے بچ گئے۔ جبکہ عصمت کو نارِ جہنم سے ان کے لحاف نے بچا لیا۔ افسانے کے اختتام پر نقادوں پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے جس میں یہ دونوں فن کار (غالب اور عصمت) نقادوں سے پہلو بچاتے نظر آتے ہیں۔ افسانے میں عصمت کی کچھ باتیں اس لیے غیر متعلق معلوم ہوتی ہیں کیوں کہ غالب کی شاعری میں عورت کی تعظیم کے کئی پہلو موجود ہیں جنھیں سمجھنے کی ضرورت ہے۔

مسائل نسواں سے متعلق جیلانی بانو کا دوسرا

افسانہ ''پردہ گرتا ہے'' ہے۔ یہ افسانہ خانگی زندگی میں عورتوں کی صورت حال کا جائزہ لیتا ہے۔ افسانے کو ایک اسٹیج ڈرامے کی روداد کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ ڈرامے کے کردار ہی اس افسانے میں شامل ہیں۔ ایک گڑیا کی شکل میں عورت کی تخلیق، پھر اس کا حرکت میں آنا، ایک لڑکے سے محبت ہونا اور پھر لڑکے کا اچانک غائب ہو جانا، فراق میں عورت کا تڑپنا، بچے کو جنم دینا، پالنا پوسنا اور پھر اچانک اسے بھی خود سے دور جاتا محسوس کرنا یہ وہ مسائل ہیں جو افسانے کا حصہ بن گئے ہیں۔ جیلانی بانو نے افسانے میں ایسی عورت کے مسائل بیان کیے ہیں جو ماں ہے۔ ایک ایسی ماں جسے شوہر کا ہجر بھی جھیلنا ہے اور پھر بیٹوں سے بھی محروم ہو جانا ہے۔ تخلیق کار کے نقطۂ نظر سے عورت کا یہ تصور ناقابل قبول ہے اور وہ اس کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔ اس افسانے میں جیلانی بانو کا بیانیہ ایک ڈرامے کو تخلیقی زبان عطا کرتے ہوئے دلچسپ انداز میں آگے بڑھاتا ہے۔

افسانہ ''او کالے برقعے والی لڑکی'' عورت کے تئیں روایتی سوچ پر ضرب کرتا ہے۔ اس افسانے میں عورت کو پردے کا پابند کرنے اور اس کی تعلیم کو دینی اور اخلاقی علوم تک محدود رکھنے کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ جیلانی بانو عورت کو سائنس، ادب اور سیاست کے میدان میں بھی آگے بڑھتی ہوئی دیکھنے کی خواہاں ہیں۔ عورت کی آزادانہ روش کو نشانہ بنانے پر وہ اکبر الہ آبادی کا بھی مذاق اڑانے سے نہیں چوکتیں اور ہر اس نظام پر چوٹ کرتی ہیں جو عورتوں پر پابندی عائد کرنا چاہتا ہے:

''او کالے برقعے والی لڑکی! / کالے حصار میں قید رہو۔ کالی نقاب میں منہ چھپالو۔ او پر مت دیکھو / اس کالی رات کا انت کہیں نہیں ہے۔ مگر اپنی آنکھیں کھلی رکھنا۔ / ان آنکھوں سے صرف ''بہشتی زیور پڑھنا ہے تمھیں۔ وفا، ایثار اور صبر کے سب سبق یاد رکھنا ہیں تمھیں۔ اگر وہ بے چارے تم پر پہلی نظر ڈال کر اپنی نگاہ نہیں جھکا سکے۔ / تو انھیں دوسری نگاہ ڈالنے کے عذاب سے بچاؤ۔ / اپنے چہرے پر کالی نقاب ڈال لو۔ / تمہارا چہرہ شاعروں فن کاروں کا موضوع سخن ہے۔ / تم نہیں ہو۔ / اس کتاب کی طرف ہاتھ مت بڑھانا۔ علم_ ادب_ سائنس اور سیاست؟ / اگر تم نے یہ کتاب کھولی تو / ایک ڈرامہ شروع ہو جائے گا۔ اور پھر یہ ڈرامہ دکھلائے گا کیا سین؟ / پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ / اس لیے۔ / گردن جھکا کر زمرد کا گلو بند دیکھو۔ / یہ تمہاری وفا، ایثار / اور رضا کا انعام ہے۔ کبھی کالی نقاب کو اٹھانے کی جرأت مت کرنا۔ / ورنہ / اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ جائے گا۔ / او کالے برقعے والی لڑکی!'' (راستہ بند ہے، ص 113-114)

موضوع سے صرف نظر اس افسانے کی ہیئت پر بھی سوال قائم ہوتا ہے کہ کیا اسے ایک مکمل افسانہ کہا جا سکتا ہے؟ اگر یہ تحریر افسانے کے زمرے میں داخل ہے تو پھر میرا جی، راشد، اختر الایمان، زبیر رضوی یا دیگر تخلیق کاروں کی حکایتی نظموں (سمندر کا بلاوا، کوزہ گر، ایک لڑکا، علی بن متقی رویا وغیرہ) کو افسانہ کیوں نہیں کہا جا سکتا۔ ایسی صورت حال میں افسانہ اور نظم کو ہیئت اور اسلوب کے تناظر میں روایتی سانچوں سے باہر نکل کر دیکھنے کی ضرورت ہے۔

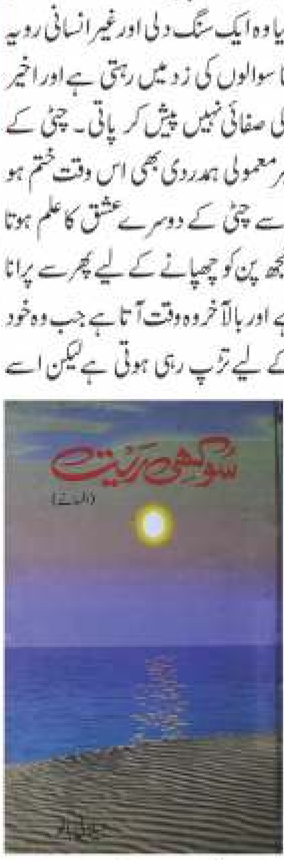

جیلانی بانو نے عورتوں کے مسائل کو دونوں زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ایک طرف جہاں عورتوں کے ساتھ کی جا رہی زیادتیوں کو نشانہ بنایا ہے وہیں دوسری طرف عورتوں کی جانب سے پیش آنے والے دل دوز واقعات کو بھی موضوع بنایا ہے۔ ان کا طویل افسانہ یا ناولٹ ''اکیلا'' اس کی مثال ہے۔ یہ ناولٹ ماں کی مامتا پر سوال قائم کرتا ہے اور سماج کے لاوارث بچوں کے مسائل کو اپنا موضوع بناتا ہے۔ جیلانی بانو کے مطابق عورتوں کا شادی سے قبل حاملہ ہونا اور پھر بچہ جننے کے بعد اسے سڑک پر چھوڑ آنا، ماں کی مامتا کو شرمسار کرنے کے مترادف ہے۔ ناولٹ کا نسوانی کردار چٹی ایک ایسی ہی لڑکی ہے، جو شادی سے قبل اجمل سے عشق کرتی تھی۔ وہ اس کے حسن و جمال کی دیوانی تھی اور نادانستہ طور پر اس کے بیٹے کو بھی اپنی کوکھ میں پال رہی تھی۔ اس نے یہ بات اجمل سے پوشیدہ رکھی۔ اجمل اسے چھوڑ کر پردیس چلا گیا۔ حاملہ ہونے کی خبر سن کر چٹی کی ماں اور چاچی نے عزت و ناموس کے نام پر جو کچھ کیا وہ ایک سنگ دلی اور غیر انسانی رویہ ہے۔ چٹی کی مامتا سوالوں کی زد میں رہتی ہے اور اخیر تک اپنے جرم کی صفائی نہیں پیش کر پاتی۔ چٹی کے ساتھ قاری کی غیر معمولی ہمدردی بھی اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب اسے چٹی کے دوسرے عشق کا علم ہوتا ہے۔ چٹی اپنے بانجھ پن کو چھپانے کے لیے پھر سے پرانا رویہ اختیار کرتی ہے اور بالآخر وہ وقت آتا ہے جب وہ خود کو ماں کہلانے کے لیے تڑپ رہی ہوتی ہے لیکن اسے ماں کہنے والا کوئی بچہ نصیب نہیں ہوتا۔ چٹی اپنے شوہر سے بھی نہایت ظالمانہ سلوک کرتی ہے۔ اور نتیجے میں پورا گھر تباہ ہو جاتا ہے۔ انیل ایک مقام پر کہتا ہے:

''ماں اور بچے کے درمیان محبت کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ ہر ماں مصلحت پسند ہوتی ہے۔ سماج کے تیور دیکھ کر بچے کو چاہتی ہے۔ کہیں میرا بچہ، مرا بچہ بھی۔۔۔۔''

(راستہ بند ہے، ص 144)

انیل کے یہ الفاظ مامتا پر سوالیہ نشان قائم کرتے ہیں۔ ناولٹ مختصر ہونے کے باوجود بہت سے اہم پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کا بیانیہ تین مختلف زاویوں سے تشکیل دیا گیا ہے۔ پہلا حصہ چٹی اور ملیشم کے مکالموں پر مشتمل ہے اور دوسرے حصے کا راوی خود انیل ہے جبکہ تیسرے حصے کا بیان انیل کے کسی قریبی دوست کی زبانی ہوتا ہے۔ ان تینوں حصوں میں بیچ کا حصہ اس اعتبار سے منفرد معلوم ہوتا ہے کہ اس میں آپ بیتی کا سا انداز پیدا ہو گیا ہے۔ جیلانی بانو کے اس

ناولٹ کی زبان نثری صلابت لیے ہوئے ہے اور وہ شاعرانہ اسلوب جو کہیں کہیں ان کے افسانوں پر نظم کا گمان پیدا کر دیتا ہے، یہاں اثر انداز نہیں ہوتا۔

خواتین کے مسائل کے علاوہ معاشرتی شعور اور عصری حسیت کی نمائندگی بھی جیلانی بانو کے افسانوں میں نظر آتی ہے۔ البتہ ان افسانوں میں ترقی پسند افسانہ نگاروں کی طرح نعرے بازی کے بجائے ایک گہرے انسانی سوز اور کرب کا احساس موجود ہے۔ 'راستہ بند ہے' میں ایسے کئی افسانے شامل ہیں جنھیں عصری حسیت کے نمائندہ افسانوں کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ افسانہ ''عباس نے کہا'' کا موضوع ظلم اور تشدد کے خلاف پیدا ہونے والی مزاحمت ہے۔ افسانے کا بیانیہ ایک ایسے رپورٹر کا بیانیہ ہے جو جائے واردات پر موجود ہے اور متاثر افراد سے وہاں کے حالات کے متعلق دریافت کر رہا ہے۔ جیلانی بانو نے تاریخ کے عظیم کرداروں کو اس افسانے میں ڈھال دیا ہے اور انھیں مخالف قوتوں کے مقابل زیادہ مستحکم ثابت کیا ہے۔ ظلم کے خلاف مزاحمت اور جواں مردی کے کئی نمونے افسانے کا حصہ ہیں۔

اسی طرح افسانہ ''موت کے بیج'' جوہری اسلحوں کی تباہ کاریوں کے اندیشے پر مبنی ہے۔ افسانے میں موجود بدلو کا کردار ایک غریب بچے کی نمائندگی کرتا ہے اور روشن میاں متمول خاندان کی۔ افسانہ نگار نے ان دونوں کے مابین مکالمہ سے جوہری ہتھیاروں کے نقصانات پر روشنی ڈالی ہے۔ بدلو کھیت کھلیان سے محبت کرتا ہے اور روشن میاں ایٹم بم کی ایجاد کو تکنیکی میدان میں انسان کی ترقی کے طور پر دیکھتا ہے۔ افسانہ نگار نے یہ نقطہ بھی واضح کر دیا ہے کہ تعمیری فکر کی پرورش کے لیے اعلی تعلیم سے زیادہ انسانی ہمدردی کا ہونا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بدلو جیسا ایک معمولی لڑکا روشن جیسے عظیم سائنسداں کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

افسانہ 'بھاگو بھاگو' تفریق کے نقصانات کو موضوع بناتا ہے۔ افسانے کی مرکزی کہانی داستان محبت ہے جو شدت پسند مذہبی طبقوں کی بدولت دردناک انجام کو پہنچتی ہے۔ افسانے میں موجود آشا ایک برہمن زادی اور سلطان ایک سید زادہ دو طبقوں کے مابین کشمکش کا استعارہ بن گئے ہیں۔ ان دونوں کی جنگلی جانوروں اور پرندوں سے مانوسیت یہ ثابت کرتی ہے کہ موجودہ انسانی معاشرہ کس قدر غیر محفوظ صورت اختیار کر چکا ہے۔ ایک چڑیا گھر میں سیاحت کے دوران جب آشا ایک انگریز جوڑے کو شیر کے متعلق یہ کہتے ہوئے سنتی ہے کہ شیر اس وقت تک حملہ نہیں کرتا جب تک کہ اسے انسانوں سے خطرہ نہ محسوس ہو، تو وہ شیر کا پنجرہ کھول کر اپنے بچوں سمیت اس میں داخل ہو جاتی ہے اور محسوس کرتی ہے کہ جیسے اس نے درندوں سے چھٹکارا پا لیا ہے۔ آشا کا انسانی سوسائٹی سے خوف زدہ ہو کر شیر کے پنجرے میں پناہ لینا انسانیت کے زوال کی المناک صورت حال کو واضح کرتا ہے۔ تخلیق کار نے انسانوں کے اندر پنپ رہی درندگی اور

> جیلانی بانو نے تاریخ کے عظیم کرداروں کو اس افسانے میں ڈھال دیا ہے اور انھیں مخالف قوتوں کے مقابل زیادہ مستحکم ثابت کیا ہے۔ ظلم کے خلاف مزاحمت اور جواں مردی کے کئی نمونے افسانے کا حصہ ہیں۔

جانوروں کی فطری امن پسندی کو اس افسانے کے ذریعے بیان کر دیا ہے۔ افسانے میں آشا کی ذہنی اور نفسیاتی صورت حال کو مکالموں کی صورت میں جس خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے وہ بھی قابل غور ہے۔

افسانہ ''ایک خلا باز کی رپورٹ'' ایک سائنس داں کی دنیا کے متعلق رپورٹ پر مبنی ہے۔ انکشاف کے بعد جب لوگ اس دنیا میں قدم رکھتے ہیں تو انھیں مختلف صورت حال نظر آتی ہے۔ اور وہ مایوس ہوتے ہیں۔ دنیا کا جو تصور ان کے ذہنوں میں موجود تھا وہ بکھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ماحولیاتی تبدیلیوں کو افسانے میں خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تخلیق کار نئی ایجادات سے خوش ضرور ہے لیکن ابھی اسے ان آلات کے متعلق تسلی نہیں ہے۔ افسانہ ''زو میں'' سیاسی رہنماؤں کی حرص و ہوس اور درندگی پر مبنی ہے۔ اس افسانے میں زو کے ایک خطرناک جانور کو جو کہ میٹھی بولی بول کر لوگوں کو اپنے قریب بلاتا ہے اور پھر ان پر حملہ کر دیتا ہے، ایک سیاسی لیڈر سے تشبیہ دی گئی ہے۔ افسانہ مختصر ہونے کے باوجود گہرا تاثر قائم کرتا ہے۔ ایک بچے کا اپنے اپنے والدین سے یہ سوال کہ ''ڈیڈی! وہ جنگل کی کون سی پارٹی کا لیڈر ہے'' قاری کے ذہن پر بجلی بن کر گرتا ہے اور اسے سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

افسانہ ''درشن کب دو گے؟'' میں جیلانی بانو نے کھوکھلی مذہبیت اور ریاکاری کو بے نقاب کیا ہے۔ یہ افسانہ ان سماج دشمن عناصر کی تشخیص کرتا ہے جو کبھی شرافت اور کبھی مذہب کا سہارا لے کر عام انسان کے ساتھ غداری کرتے ہیں۔ کہانی میں کئی کردار اہم ہیں۔ مثلاً مسز راشد، جو کہ ایک متمول بزنس مین کی بیوی ہے اور تخریبی ذہن رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ شیام کی ماں اور مولوی جو مذہبی انتہا پسند کرداروں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ البتہ حسن بانو اور میرا کا کردار ان کے برعکس ہے۔ حسن بانو مذہبی نہیں لیکن انسان دوست ضرور ہے۔ وہ معاشرے کی ہر خرابی پر بے اطمینانی کا اظہار کرتی ہے۔ افسانے میں ''میرا'' کا کردار بھی اہم ہے، جو مذہبی ریاکاری کے خلاف آواز بلند کرنے کی پاداش میں نشانہ بنتی ہے۔ یہ افسانہ ہماری معاشرتی زندگی کی نام نہاد مذہبیت پر سیاسی شیطنت کے غلبے کی دلدوز داستان ہے۔

افسانہ ''ایک شوٹنگ اسکرپٹ'' کا بیانیہ فلم شوٹنگ کی داستان پر مبنی ہے۔ جیلانی بانو نے اس افسانے میں سیاست کی خامیوں کو نشانہ بنایا ہے۔ ایکٹر آکاش اور ڈائرکٹر بھوشن کے درمیان گفتگو سے کئی اہم معاملات کا انکشاف ہوتا ہے۔ یہ افسانہ تخلیق کار کی عصری حسیت اور انسانی ہمدردی کا ثبوت ہے۔ اس کا مطالعہ کرتے ہوئے افسانہ نگار کی انسانی ہمدردی کے ساتھ سیاسی رہنماؤں کی موقع پرستی کا بھی علم ہوتا ہے۔

سماجی آگہی سے متعلق جیلانی بانو کا ایک اور اہم افسانہ ''ایک شہر بکاؤ ہے'' ہے۔ جیلانی بانو نے اس افسانے میں شہر کو ملک کا استعارہ بنا کر پیش کیا ہے۔ ایک شہر کے پس پردہ وہ پورے ملک کی صورت حال کو واضح کرنا چاہتی ہیں۔ افسانے کا اسلوب طنز و مزاح سے بھرپور ہے۔ جیلانی بانو کے طنز کا نشتر بہت کاٹ دار ہے۔ وہ طنزیہ پیرائے میں سیاسی حربوں کو

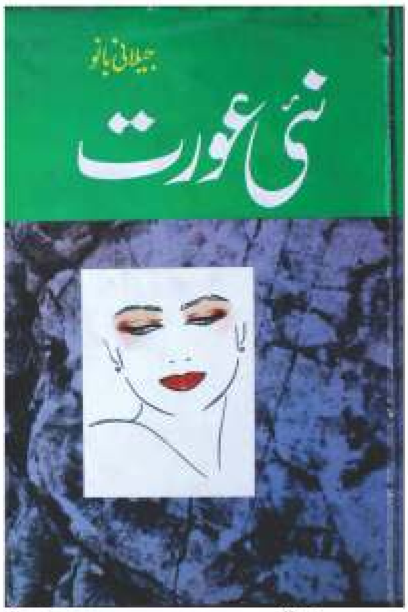

بے نقاب کرتی ہیں۔ افسانہ روایتی بیانیہ(کہانی، پلاٹ، کردار) تشکیل دینے کی بجائے راوی کی زبانی آگے بڑھتا ہے۔ البتہ کہیں کہیں مکالمے کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ افسانہ نگاری کا یہ انداز جیلانی بانو کے تخلیقی تجربات کا حصہ ہے۔

جیلانی بانو نے معاشرتی مسائل میں سیاسی ناہمواریوں کو ایک خاص طرح سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ملک کی سرپرستی کے لیے اس طبقے کا باشعور اور حساس ہونا بے حد ضروری ہے۔ اس سے متعلق ان کے کئی افسانے قابل ذکر ہیں۔ افسانہ ''آپ کا سواگت ہے منتری جی'' سیاسی رہنماؤں کے کھوکھلے وعدوں اور جھوٹی مذہب پرستی پر مبنی ہے۔ افسانے میں موجود عمر رسیدہ خاتون کئی اعتبار سے اہم ہے۔ اس کی عمر اس میدان میں تجربات اور مشاہدات کو بیان کرتی ہے۔ ترقیاتی کاموں کے دلاسے اور مذہبی مقامات کی زیارت اس کی نظر میں ایک تماشا بن چکے ہیں۔ اس کا یہ کہنا کہ ''منتری جی مندر کے اندر مت جائیے، آپ کے آنے کی خبر سن کر بھگوان مندر سے چلے گئے ہیں'' ایک گہرا طنز ہے، جو یہ واضح کرتا ہے کہ عوام اور خود مذہب بھی ان مشکوک کرداروں سے کتنا مختلف ہے۔ اسی طرح وہ افسانہ جسے اس مجموعے کا عنوان بنایا گیا ہے قابل ذکر ہے۔ افسانہ ''راستہ بند ہے'' سیاسی حربوں سے عوام کو ہونے والی دشواریوں کو اپنا موضوع بناتا ہے۔ افسانے میں ایک منسٹر کا قافلہ سڑک سے گزر رہا ہوتا ہے اور ہر طرف سے راستہ بند کر

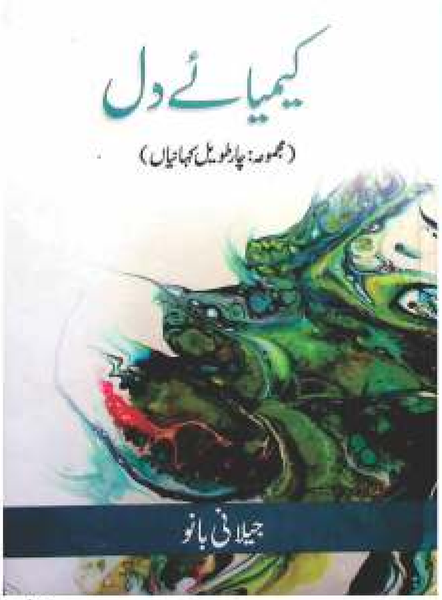

دیا جاتا ہے۔ راستہ بند ہونے کے سبب سڑک پر پھنسی عوام کو جس نوعیت کی دقتیں اٹھانی پڑتی ہیں، یہ افسانہ یکے بعد دیگرے انہیں بیان کرتا ہے۔ ان میں ایسے طلبا، بھی ہیں جنہیں وقت مقررہ پر امتحان گاہ پہنچنا ہے۔ بڑے بڑے فن کار ہیں، جن کا شو شروع ہونے کے قریب ہے۔ کسی کو کہیں پہنچنے کی ایمرجنسی ہے۔ کوئی بزرگ خاتون اہل وعیال پر کیے گئے ظلم کے خلاف انصاف طلب کرنے عدالت جارہی ہے۔ مگر ان سب کے لیے براستہ بند ہے۔ گویا راستے کا بند ہونا تمام سماجی حرکات اور انصاف کی راہوں کا مسدود ہو جانا ہے۔ اگر کوئی حد بندیوں سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے تو اس پر پولیس کی مار پڑتی ہے۔ یہ افسانہ ہمیں کرشن چندر کے افسانہ'' دو فرلانگ لمبی سڑک'' کی یاد دلاتا ہے۔ اگر چہ موضوع کے اعتبار سے دونوں مختلف ہیں مگر پس منظر ایک جیسا نظر آتا ہے۔ کرشن چندر نے سڑک کو ایک تخلیقی تجربے میں ڈھال دیا ہے جبکہ جیلانی بانو محض راہگیروں کو اپنا موضوع بناتی ہیں۔ یہاں راستہ کسی عینی شاہد کے طور پر نہیں بلکہ ایک ایسے محور کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جس کے رک جانے سے سماجی زندگی پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ ''راستہ بند ہے'' انصاف کی مسدود راہوں کا بھی استعارہ ہے۔

افسانہ'' گل نغمہ'' تقسیم ہند کے تناظر میں ہجر کے مسائل پر لکھا گیا ایک شاہکار افسانہ ہے۔ یہاں فن، تحریر اور موسیقی کا امتزاج نظر آتا ہے۔ افسانے میں موسیقی اور اس کے ریاض کو محور بنا کر کہانی تشکیل دی گئی ہے۔ کہانی میں سر اور راگ کا رشتہ حقیقی زندگی سے مربوط نظر آتا ہے۔ افسانے کے تمام الفاظ اوشا کی زندگی کا استعارہ ہیں۔ اوشا، نگی، موہن اور آفتاب کے گرد گھومتی اس کہانی میں ایک فن کار کی ازدواجی زندگی کے ساتھ عشق ومحبت کی حرارت بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔ اوشا اور آفتاب احمد کے درمیان موسیقی کی ریاضت کے درمیان جو محبت پنپ رہی تھی اس نے خود ایک موسیقی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ دوران ریاض آفتاب احمد کے ساتھ اوشا نے جن سروں کو چھوا تھا وہ آج تک اپنے خاوند موہن کے ساتھ وہاں نہیں پہنچ سکی تھی۔ سرحد کی لکیر دو فن کاروں کے مابین ایک دراڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کہانی کی تقسیم کا انکشاف بھی ہے۔ جیلانی بانو نے تقسیم ہند کے بعد دونوں ملکوں کے فن کار اور ان کے قدر دانوں کے درمیان پیدا ہوتی دوریوں کو اس افسانے کے ذریعہ بیان کر دیا ہے۔ افسانے کا بیانیہ راگ، غزل اور موسیقی کی مختلف اصطلاحات سے جس طرح تشکیل دیا گیا ہے اس سے جیلانی بانو کی فن کاری کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ کہنا بجا ہے کہ کسی راگ کو ساز پر ہم آہنگ کرنے کی کھوج ہی گل نغمہ ہے۔

افسانہ ''اسے کس نے مارا'' ایک لاوارث بھکارن کی دردانگیز کہانی ہے، جس کا موضوع مہذب معاشرے میں کم تر لوگوں کو حقیر سمجھنا اور نظر انداز کیا جانا ہے۔ افسانے میں موجود بھکارن بھوک سے بے حال

جیلانی بانو نے معاشرتی مسائل میں سیاسی ناہمواریوں کو ایک خاص طرح سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ملک کی سرپرستی کے لیے اس طبقے کا باشعور اور حساس ہونا بے حد ضروری ہے۔ اس سے متعلق ان کے کئی افسانے قابل ذکر ہیں۔

ہوکر دروازوں پر دستک دیتی اور پتھر مارتی ہے مگر لوگ اسے پاگل اور اچھوت سمجھ کر دھتکار دیتے ہیں۔ پروفیسر جو کہ تعلیم یافتہ اور مہذب طبقے کا نمائندہ ہے اسے اپنے گھر کے سامنے نہیں آنے دیتا اور برہمن جو کہ مذہب پرست اور بااخلاق طبقے کی نمائندگی کرتا ہے، بھکارن کو مندر کی چوکھٹ پر بھی بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ شہر کے اوباش لڑکے رات کی تاریکی میں اس کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں اور اسی کسمپرسی کی حالت میں اس کی موت ہو جاتی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ تفتیش میں اس کا کوئی مجرم قرار نہیں پاتا۔ ایک بزرگ خاتون اس کی لاش پر محض اس لیے آنسو بہاتی ہے کیوں کہ کوئی رونے والا نہیں۔ یہ بزرگ خاتون کون ہے؟ اس کی تعبیر مختلف زاویوں سے کی جا سکتی ہے۔ تخلیق کار کی ہمدردیاں بھکارن کے ساتھ ہیں اور اس کے انتقال پر اس کی روح ایک بزرگ خاتون کی صورت میں نوحہ کناں ہے۔ یہ انسانی ہمدردی کی اعلیٰ مثال ہے جو مہذب معاشرے پر نئے زاویے سے نظر ڈالنے پر مجبور کرتی ہے۔

جیلانی بانو نے معاشرتی مسائل کو موضوع بناتے ہوئے مرد اور خواتین کرداروں کے ساتھ بچوں کو بھی موضوع بنایا ہے۔ بچوں سے متعلق ان کا افسانہ 'جنت کی تلاش' ان کے نفسیاتی مسائل پر روشنی ڈالتا ہے۔ یہ افسانہ معصوم بچوں کے سوالات پر مبنی ایک دلچسپ افسانہ ہے۔ اس میں بچوں کے نفسیاتی شعور کے ساتھ روایتی طرز فکر کی بے معنویت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ افسانہ ہمارے قدیم طرز تعلیم پر بھی سوالیہ نشان قائم کرتا ہے اور تعلیم و تربیت کے نئے طریقوں پر غور کرنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ تخلیق کار کا خیال ہے کہ ایسا تعلیمی نظام جو بچوں کے ذہنی شکوک و شبہات دور کرنے اور غور و فکر کی صلاحیت پیدا کرنے سے قاصر ہو، بے سود ہے۔

جیلانی بانو نے جدید معاشرے میں پیدا ہونے والے افراد کے ذاتی مسائل پر بھی توجہ دی ہے۔ انھوں نے ذاتی مسائل کو کسی تحریک کے زیر اثر دیکھنے کے بجائے تجزیاتی طریق کار اپنایا ہے۔ ان کے افسانوں کا فرد کرب ذات کو معاشرہ سے مختلف محسوس نہیں کرتا بلکہ اسی کا ایک حصہ تصور کرتا ہے۔ اس نوعیت کے افسانوں میں 'ایک دوست کی ضرورت ہے' قابل ذکر ہے۔

افسانہ ''ایک دوست کی ضرورت ہے'' انسان کی داخلی تنہائی اور مخلص دوست کی تلاش پر مبنی ہے۔ یہ افسانہ معنوی وسعت کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اسے جدید معاشرے میں انسانوں کی بکھرتی امیدوں اور تمناؤں کا دلدوز بیانیہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار ہمارے معاشرے کے ان پریشان حال افراد کی نمائندگی کرتا ہے جو اپنی دولت و ثروت کے باوجود ایک

جیلانی بانو نے جدید معاشرے میں پیدا ہونے والے افراد کے ذاتی مسائل پر بھی توجہ دی ہے۔ انھوں نے ذاتی مسائل کو کسی تحریک کے زیر اثر دیکھنے کے بجائے تجزیاتی طریق کار اپنایا ہے۔ ان کے افسانوں کا فرد کرب ذات کو معاشرہ سے مختلف محسوس نہیں کرتا بلکہ اسی کا ایک حصہ تصور کرتا ہے۔ اس نوعیت کے افسانوں میں 'ایک دوست کی ضرورت ہے' قابل ذکر ہے۔

گھٹن بھری زندگی جینے پر مجبور ہیں۔ ایسے موقع پر صرف ایک دوست ہی کی نہیں بلکہ سچے انسان کی بھی تلاش شروع ہوجاتی ہے۔ معاشرتی زندگی میں انسانوں کے اندر پایا جانے والا تضاد اس افسانے کا بنیادی موضوع ہے جہاں انسان کی دو صورتیں نظر آتی ہیں۔ جیلانی بانو نے انسان کی داخلی اور خارجی دونوں کیفیات کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح افسانہ ''کیا ٹوٹ گیا'' شکست ذات کی کہانی ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ایک تخلیق کار ہے جو باطنی تنہائی اور شکست سے دوچار ہے۔ افسانے کا اسلوب شاعرانہ ہے اور نظم کا احساس پیدا کرتا ہے۔ اس افسانے کو بھی جیلانی بانو کے ان افسانوں میں شامل کیا جا سکتا ہے جن کی زبان نثر سے زیادہ نظم سے قریب معلوم ہوتی ہے۔

جیلانی بانو نے نئے مسائل کے اظہار کے لیے بعض افسانوں میں علامت کو بھی جگہ دی ہے۔ لیکن ان کی علامت کسی قسم کا ابہام پیدا نہیں کرتی۔ مثلاً ''اکیلا سمندر''۔ یہ ہیئت و اسلوب کے اعتبار سے جیلانی بانو کا ایک منفرد علامتی افسانہ ہے۔ اس میں سمندر ایک ایسے گواہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو انسان کے تمام کارناموں سے واقف ہے۔ اس کی وسعت لامحدود اور گہرائی بے کراں ہے، لوگ اسی سے ہیرے موتی نکالتے ہیں۔ وہ ان کے اسفار اور تباہیوں کا عینی شاہد ہے، مگر خاموش ہے۔ لوگ اس کی خاموشی کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کی گہرائیوں کو مت چھونا کہ اس کے اندر جوالامکھی دفن ہے۔ اتنی آگ رکھنے کے باوجود خاموش رہ پانا سمندر کے ہی بس کی بات ہے۔ تخلیق کار نے اس افسانے کے ذریعہ انسانی تخریب کاریوں اور فطرت کے مابین مکالمہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ انسانوں کو فطرت سے سیکھنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح افسانہ ''کاش'' انسان کی اپنے گرد و نواح سے مایوسی کی علامت ہے۔ یہ مختصر افسانہ گرد و پیش کے لوگوں سے اکتائے ہوئے ایک انسان کا نوحہ ہے جس میں اپنی سابقہ زندگی کا محاسبہ بھی ہے اور اس پر اظہار افسوس بھی۔ اسے بھی فطرت کی تلاش ہے اور وہیں سکون کی امید۔

مذکورہ بالا افسانوں کے جائزے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ جیلانی بانو کے افسانوں کے موضوعات کا دائرہ جتنا وسیع ہے، اسی طرح ہیئت و اسلوب کے تجربے بھی نظر آتے ہیں۔ ان کی تخلیقی زبان افسانے کی قرأت کو دلچسپ بناتی ہے۔ اس کے علاوہ نفسیاتی تجزیہ، جزئیات نگاری، ماحول سازی اور برمحل مکالمے افسانوں کو حقیقی دنیا سے قریب کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ افسانوں میں تخلیق کار کی موجودگی گراں نہیں گزرتی۔ یہ وہ امتیازات ہیں جو جیلانی بانو کے افسانوں کو منفرد ثابت کرتے ہیں۔

■

Dr. FaizanulHaque
H-99A, Jamia Nagar, Okhla,
New Delhi-110025
Email: faizanulhaque910@gmail.com
Mob. 8800297878

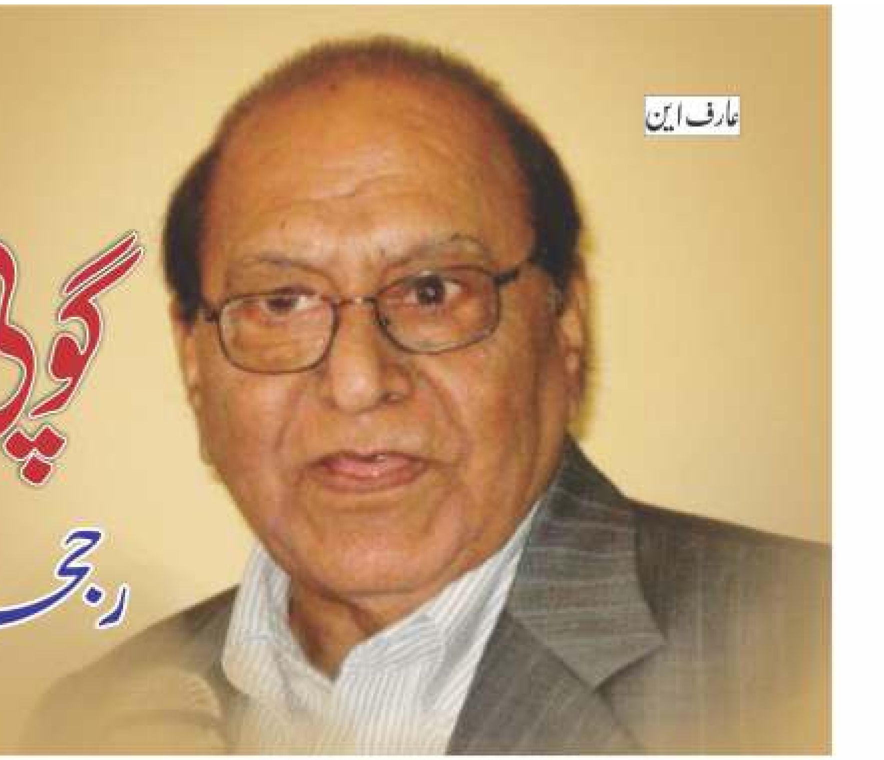

عارف امین

گوپی چند نارنگ

رجحان ساز ناقد

اردو تنقید کی تاریخ میں بیسویں صدی کا نصف آخر اور اکیسویں صدی کا آغاز ایک ایسی فکری تبدیلی کا شاہد رہا ہے جس نے ادب کو پرکھنے کے تمام روایتی پیمانے بدل دیے۔ اس تبدیلی کے مرکز میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی شخصیت بھی نظر آتی ہے، جنھوں نے اردو تنقید کو ایسی علمی اور فلسفیانہ بنیاد فراہم کی جو عالمی پس منظر میں بھی اہم ہے۔ یہ مضمون ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے اسی رجحان ساز کردار کا جائزہ پیش کرتا ہے۔ آج کے دور میں جب عالمی سطح پر ''تھیوری'' کی اہمیت بڑھ چکی ہے، نارنگ کا کام اردو کے طالب علموں اور نقادوں کے لیے ایک مشعلِ راہ ہے۔

اردو تنقید کا باقاعدہ آغاز حالی اور شبلی سے ہوا، لیکن بیسویں صدی میں اسے دو بڑے دبستانوں نے متاثر کیا۔ اول، ترقی پسند تحریک جس نے ادب کو سماجی مقصدیت، مارکسی فلسفے اور طبقاتی کشمکش کے ترازو میں تولا۔ ترقی پسند نقادوں کے ہاں متن سے زیادہ مصنف کے سماجی نظریات اور پیغام کی اہمیت تھی۔ دوم، جدیدیت کی لہر جس نے ترقی پسندی کے ''خارجی شور'' کے خلاف ردعمل کے طور پر جنم لیا۔ جدیدیت نے انفرادیت، داخلیت، علامت اور ابہام پر زور دیا۔ اگرچہ جدیدیت نے فن پارے کی ہیئت کی طرف توجہ دلائی، لیکن اس کے باوجود تنقید کا اسلوب زیادہ تر تاثراتی یا وجودی مباحث تک محدود رہا۔

شمس الرحمٰن فاروقی کے بقول:

''ترقی پسندوں نے ادب کو سماج کا تابع کر دیا تھا، جبکہ جدیدیت نے اسے فرد کی داخلی کائنات تک محدود پایا، لیکن ان دونوں کے درمیان فن پارے کی اپنی لسانی ساخت اور متن کی خودمختاری کے سوالات ہنوز تشنہ تھے۔''[1]

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی اردو تنقید میں آمد ایک ایسے ''لسانیاتی موڑ'' کی علامت ہے جس نے اردو ادب کو عالمی ادبی تھیوری سے جوڑ دیا۔ نارنگ صاحب کا بنیادی امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے لسانیات کو تنقید کی اساس بنایا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اردو تنقید میں کسی سائنسی طریقہ کار کی کمی ہے، جس کی وجہ سے ہم متن کی تہوں تک پہنچنے کے بجائے اس کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔

نارنگ نے اردو میں ساختیات، پس ساختیات اور مابعد جدیدیت کے نظریات کو نہ صرف متعارف کرایا بلکہ ان کا اطلاق کلاسیکی اور جدید اردو ادب پر کر کے دکھایا۔ ان کی آمد سے تنقید میں ''مصنف کی موت'' اور ''متن کی مرکزیت'' جیسے تصورات جڑ پکڑنے لگے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ خود اس تبدیلی کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ادبی تنقید محض تعریف یا برائی کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ متن کے اس لسانی نظام کو ڈی کوڈ Decode کرنے کا عمل ہے جس کے ذریعے معنی کی تخلیق ہوتی ہے۔ ہمیں دیکھنا ہوگا کہ زبان کس طرح متن کے اندر کام کرتی ہے۔''[2]

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی تنقیدی فکر کو سمجھنے کے لیے ان کے علمی سفر اور ان فکری محرکات کا مطالعہ ضروری ہے جنھوں نے انھیں ایک روایتی استاد سے بلند کر کے ایک بین الاقوامی سطح کا نظریہ ساز مفکر بنا دیا۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ 11 فروری 1931 کو دکی، بلوچستان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد دھرم چند نارنگ خود علم و ادب کے شائق تھے، جس کی وجہ سے علمی ذوق انھیں ورثے میں ملا۔ ان کی ابتدائی تعلیم بلوچستان اور پنجاب کے مختلف شہروں میں ہوئی۔ تقسیم ہند کے بعد وہ دہلی منتقل ہو گئے، جہاں ان کی علمی شخصیت کو جلا ملی۔

نارنگ صاحب نے دہلی یونیورسٹی سے 1954 میں اردو میں ایم۔ اے کیا اور پھر 1958 میں اسی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے تحقیقی مقالے کا موضوع ''اردو مثنویوں کے ہندوستانی قصے'' تھا، جو آج بھی اس موضوع پر ایک مستند حوالہ سمجھا جاتا ہے۔ اس ابتدائی کام نے ان کے اندر کلاسیکی ادب کی تفہیم اور ہندوستانی تہذیبی جڑوں کی تلاش کا مادہ پیدا کر دیا تھا۔

گوپی چند نارنگ کی علمی زندگی میں سب سے اہم موڑ 1960 کی دہائی میں آیا جب وہ بطور وزٹنگ پروفیسر امریکہ گئے۔ وہاں ان کا سابقہ جدید لسانیات کے ان نظریات سے ہوا جو اس وقت یورپ اور امریکہ میں علمی انقلاب برپا کر رہے تھے۔ نارنگ صاحب نے محسوس کیا کہ اردو میں تنقید کا اسلوب زیادہ تر سوانحی یا جذباتی ہے، جبکہ مغرب میں لسانیات کو ایک سائنسی اوزار کے طور پر استعمال کر کے متن کی تہوں کو کھولا جا رہا ہے۔ انھوں نے ایڈورڈ ساپیر، بلوم فیلڈ اور نوم چومسکی جیسے ماہرین لسانیات کا گہرا مطالعہ کیا۔ ان کا ایقان تھا کہ ادب کا خام مال ''زبان'' ہے، اس لیے زبان کے سائنسی مطالعے کے بغیر ادب کی فنی قدر پیمائی ممکن نہیں۔

گوپی چند نارنگ نے ساختیات کو ایک اوزار کے طور پر استعمال کر کے اردو تنقید کے جمود کو توڑ دیا۔ انھوں نے ثابت کیا کہ ادب کی تفہیم کے لیے زبان کے نظام کو سمجھنا ناگزیر ہے۔ ان کی کتاب نے نہ صرف نئے نظریات کو متعارف کرایا بلکہ اردو تنقید کو ایک نیا وقار اور عالمی تناظر عطا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں اردو میں ساختیاتی فکر کا بڑا نقیب اور رجحان ساز مفکر مانا جاتا ہے۔

وہ اپنے اس شغف کے بارے میں لکھتے ہیں:

''لسانیات نے مجھے وہ نظر دی جس سے میں لفظوں کے محض لغوی معنی نہیں بلکہ ان کے داخلی رشتوں اور اس نظام کو دیکھنے کے قابل ہوا جسے ہم 'ادبیت' کہتے ہیں۔3''

نارنگ صاحب کی فکر پر تین بڑے مغربی مفکرین کے اثرات نہایت گہرے ہیں، جنھوں نے ان کی کتاب ''ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات'' کے بنیادی تلازمات ترتیب دیے۔

فرڈینینڈ ڈی سوسیر: نارنگ نے سوسیر کے تصور زبان سے یہ سیکھا کہ زبان ایک خود مختار نظام ہے۔ سوسیر کے مطابق ''دال'' اور ''مدلول'' کا رشتہ اتفاقی ہوتا ہے۔ نارنگ نے اسی بنیاد پر اردو میں یہ نظریہ عام کیا کہ متن کے معنی مصنف کے تابع نہیں بلکہ زبان کے داخلی نظام کے تابع ہوتے ہیں۔

رولاں بارتھ: رولاں بارتھ کا مشہور نظریہ ''مصنف کی موت'' نارنگ کی فکر کا ایک اہم ستون بنا۔ انھوں نے بارتھ سے یہ سیکھا کہ ایک بار جب متن تخلیق ہو جائے تو مصنف کا رشتہ اس سے ختم ہو جاتا ہے اور قاری کی قرأت اس کے نئے معنی پیدا کرتی ہے۔ نارنگ نے نشانیات کے تصور کو اردو افسانے اور شاعری پر کامیابی سے منطبق کیا۔

ژاک دریدا: نارنگ کی مابعد ساختیاتی فکر پر ژاک دریدا کا اثر سب سے نمایاں ہے۔ دریدا کے ''ردِتشکیل'' کے نظریے نے نارنگ کو یہ سکھایا کہ متن کی کوئی ایک حتمی سچائی نہیں ہوتی۔

"There is nothing outside the text"

متن سے باہر کچھ بھی نہیں ہے۔ ''یعنی ہر چیز متن کی صورت میں موجود ہے اور معنی کی تلاش متن کے اندر ہی ہونی چاہیے۔ نارنگ نے دریدا کے اس نظریے کو اردو کے کلاسیکی شعرا بالخصوص غالب کے مطالعے میں استعمال کیا اور یہ ثابت کیا کہ غالب کے ہاں معنی کا جو تنوع ہے وہ دراصل ان کے کلام کی ''ردِتشکیلی'' نوعیت کا نتیجہ ہے۔

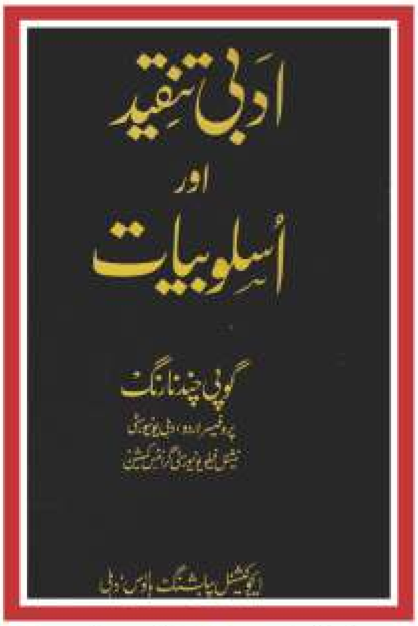

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا علمی سفر بلوچستان کی گلیوں سے شروع ہو کر امریکہ کی جدید درسگاہوں تک پھیلا ہوا ہے۔ ان کی فکری بنیادیں کلاسیکی اردو ادب میں پیوست ہیں لیکن ان کی نظر جدید لسانیات اور مغربی فلسفے پر تھی۔ انھوں نے سوسیر، بارتھ اور دریدا کے نظریات کو اردو کے مزاج میں اس طرح سمو دیا کہ وہ اجنبی محسوس نہیں ہوتے۔ یہی وہ فکری پس منظر تھا جس نے انھیں ''رجحان ساز مفکر'' کے منصب پر فائز کیا۔

اردو تنقید میں ''ساختیات'' کا تعارف محض ایک نئے نظریے کی آمد نہیں تھا بلکہ یہ ایک مکمل فکری انقلاب تھا۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اس نظریے کے ذریعے اردو ادب کو متن کی سائنسی اور معروضی تفہیم کا وہ طریقہ سکھایا جس سے اردو دنیا پہلے ناآشنا تھی۔

ساختیات کی بنیاد اس خیال پر ہے کہ کسی بھی چیز کی حقیقت اس کے انفرادی وجود میں نہیں بلکہ اس بڑے نظام میں چھپی ہوتی ہے جس کا وہ حصہ ہے۔ ادبی تناظر میں اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی فن پارہ اپنی ذات میں کوئی حتمی معنی نہیں رکھتا، بلکہ وہ زبان کے اس وسیع نظام کے تابع ہوتا ہے جس میں وہ تخلیق کیا گیا ہے۔

نارنگ صاحب کے نزدیک ساختیاتی تنقید کا مقصد یہ دیکھنا ہے کہ ایک شاعر یا ادیب نے زبان کے موجودہ نظام کو کس طرح برتا ہے اور اس کے متن کے اندر کون سے لسانی رشتے کام کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی کتاب ''ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات'' اردو تنقید کی تاریخ میں ایک موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب نے اردو میں پہلی بار ساختیات، نشانیات اور مابعد ساختیات کے پیچیدہ نظریات کو سہل زبان میں پیش کیا۔

نارنگ اس کتاب کی ضرورت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اردو تنقید طویل عرصے تک محض تاثراتی رہی یا پھر خارجی نظریات کی غلام تھی۔ ساختیات نے ہمیں متن کے 'جوہر' تک پہنچنے کا وہ راستہ دکھایا جو معروضی بھی ہے اور سائنسی بھی۔''4

اگرچہ نارنگ سے قبل کچھ نقادوں نے ساختیات کا ذکر کیا تھا، لیکن اسے ایک ''رجحان'' بنانے کا سہرا نارنگ ہی کے سر ہے۔ انھوں نے اس نظریے کا اطلاق عملی طور پر کر کے دکھایا۔ انھوں نے میر اور غالب کے کلام کا ساختیاتی مطالعہ پیش کیا اور بتایا کہ ان کی شاعری کی عظمت ان کے انوکھے لسانی نظام میں پوشیدہ ہے۔ پریم چند اور راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں کے ''بنیادی ڈھانچوں'' کو نمایاں کیا اور ثابت کیا کہ افسانہ محض کہانی نہیں بلکہ علامات کی ایک پیچیدہ ساخت ہے۔ ان کی اس کوشش سے اردو تنقید میں ''متن کی مرکزیت'' کا رجحان پیدا ہوا اور نقادوں نے مصنف کی سوانح یا اس کے سیاسی نظریات کے بجائے تحریر کے فنی محاسن پر توجہ دینا شروع کی۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اردو تنقید کو جس سب سے بڑے فکری موڑ سے روشناس کرایا، وہ مابعد جدیدیت کا تصور ہے۔ اگرچہ جدیدیت نے اردو ادب کو ہیئت اور اسلوب کے نئے تجربات دیے تھے، لیکن مابعد جدیدیت نے ان تمام ''مرکزوں'' کو چیلنج کیا جو فکر و نظر پر حاوی تھے۔

مابعد جدیدیت کا سب سے بنیادی اصول مرکزیت کا خاتمہ ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے یہ واضح کیا کہ انسانی فکر صدیوں سے کسی نہ کسی ''مرکز'' کی تلاش میں رہی ہے، چاہے وہ مذہب ہو، عقل ہو، یا کوئی سیاسی نظریہ۔ مابعد جدیدیت ان تمام ''عظیم بیانیوں'' پر سوال اٹھاتی ہے جو پوری کائنات کو ایک ہی چشمے سے دیکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

نارنگ صاحب نے اس فلسفے کو اردو ادب پر منطبق کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ ادب کو کسی ایک نظریے کا پابند کرنا اس کی تخلیقی آزادی کو سلب کرنے کے مترادف ہے۔ مرکزیت کی نفی کا مطلب یہ ہے کہ اب کوئی ایک سچائی حتمی نہیں، بلکہ سچائی کے کئی رنگ اور کئی زاویے ہو سکتے ہیں۔

تکثیریت مابعد جدیدیت کا وہ ستون ہے جس پر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے سب سے زیادہ زور دیا۔ تکثیریت کا مطلب ہے کہ ایک ہی وقت میں کئی متضاد حقیقتوں کا وجود تسلیم کیا جائے۔ نارنگ کے نزدیک ادب ایک ایسا میدان ہے جہاں معانی کی کثرت ہوتی ہے، اور قاری اپنی بصیرت کے مطابق متن سے مختلف معنی کشید کر سکتا ہے۔

نارنگ صاحب لکھتے ہیں:

''مابعد جدیدیت ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ کائنات بکھری ہوئی ہے اور اس بکھراؤ میں بھی ایک حسن ہے۔ ادب میں تکثیریت کا مطلب یہ ہے کہ ہم 'دوسرے' کے وجود اور اس کے سچ کا احترام کریں۔''[5]

اردو تنقید کا ایک بڑا حصہ نظریاتی کشمکش کا شکار رہا ہے۔ ترقی پسندوں نے ادب کو سماجی مقصدیت کا پابند کیا، جبکہ جدیدیت پسندوں نے اسے انفرادی داخلیت تک محدود کر دیا۔ نارنگ نے ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ''متن کی مرکزیت'' کا اصول پیش کیا۔ ان کے نزدیک متن کسی نظریے کا اشتہار نہیں ہوتا۔ جب ایک تخلیق کار کوئی فن پارہ تخلیق کرتا ہے، تو وہ اپنی نظریاتی وابستگیوں سے ماورا ہو کر زبان کے تخلیقی نظام میں داخل ہو جاتا ہے۔ مابعد جدید نقاد کا کام یہ نہیں کہ وہ مصنف کے سیاسی یا مذہبی خیالات کی تصدیق کرے، بلکہ یہ ہے کہ وہ متن کی داخلی ساخت اور اس کے اندر چھپے ہوئے معانی کے تنوع کو دریافت کرے۔

نارنگ نے واضح کیا کہ نظریاتی وابستگی اکثر نقاد کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتی ہے، جس سے وہ متن کے ان معانی کو نہیں دیکھ پاتا جو مصنف کے لاشعور سے برآمد ہوئے ہیں۔ نارنگ نے مابعد جدیدیت اور تکثیریت کے ذریعے اردو تنقید کو ایک وسیع اور کشادہ کینوس عطا کیا۔ انھوں نے مرکزیت کی نفی کر کے ادب کو نظریاتی جبر سے نجات دلائی اور یہ ثابت کیا کہ متن کی اہمیت اس کی ''ادبیت'' اور ''معانی کی کثرت'' میں ہے۔ ان کی اس فکر نے اردو میں مابعد جدید تنقید کی وہ بنیاد رکھی جس پر آج کی نئی تنقید کی عمارت کھڑی ہے۔

نارنگ نے اردو تنقید کو صرف نظریاتی بحثوں تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے ''اسلوبیات'' جیسے سائنسی طرز مطالعہ سے بھی روشناس کرایا۔ ان کا ماننا تھا کہ کسی بھی ادیب کی تخلیقی شخصیت کا اصل جوہر اس کے لفظوں کے استعمال اور جملوں کی ساخت میں چھپا ہوتا ہے۔ اسلوبیات ادبی تنقید کی وہ شاخ ہے جو لسانیاتی اصولوں کے تحت متن کے اسلوب کا تجزیہ کرتی ہے۔ نارنگ صاحب نے اس فن کو میر انیس کے مرثیوں پر منطبق کر کے ایک

نارنگ نے نقادوں کی ایک نسل تیار کی۔ آج اردو تنقید میں جو سائنسی لب ولہجہ اور نظریاتی گہرائی نظر آتی ہے، اس میں نارنگ کا کردار بھی اہم نظر آتا ہے۔ ناصر عباس نیر، شمیم حنفی، قدوس جاوید اور کئی دیگر معاصر نقادوں کے ہاں نارنگ کے قائم کردہ تنقیدی معیارات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ انھوں نے اردو تنقید کو وہ ''لغت'' فراہم کی جس کے بغیر آج کا ادبی مکالمہ ادھورا ہے۔

نئی راہ دکھائی۔ ان کی کتاب ''انیس اسلوبیاتی مطالعہ'' اس سلسلے کی ایک اہم تصنیف ہے۔ انھوں نے ثابت کیا کہ میر انیس کی عظمت محض ان کی جذبات نگاری میں نہیں، بلکہ ان کے لسانی شعور میں ہے۔ نارنگ نے انیس کے ہاں لفظوں کی تکرار، صوتی آہنگ، اور نحوی ساخت کا گہرا تجزیہ کیا۔ ان کے نزدیک انیس کا اسلوب ان کا ''تخلیقی'' اظہار ہے جہاں الفاظ ایک خاص ترتیب سے معنوی وسعت پیدا کرتے ہیں۔

فکشن کی تنقید میں نارنگ کا کام نہایت بنیادی ہے۔ ان کی کتاب "اردو افسانہ: روایت اور مسائل" نے افسانوی تنقید کو فنی باریکیوں کی طرف موڑ دیا۔ انھوں نے افسانے کو محض ایک ''کہانی'' کے طور پر نہیں بلکہ ایک ''علامتی ساخت'' کے طور پر دیکھا۔ انھوں نے پریم چند کی فنکاری کو نئے زاویوں سے پرکھا۔ اور بتایا کہ پریم چند صرف دیہاتی زندگی کے عکاس نہیں تھے بلکہ ان کا اسلوب زمینی جڑوں سے جڑا ہوا ایک طاقتور لسانی تجربہ تھا۔ اسی طرح راجندر سنگھ بیدی کے فن پر بات کرتے ہوئے نارنگ نے بیدی کے افسانوں میں موجود ''اساطیری'' اور ''نفسیاتی'' تہوں کو واضح کیا۔ ان کے نزدیک بیدی اردو فکشن کے وہ فنکار ہیں جن کے ہاں لسانی ساخت اور تہذیبی علامتیں ایک دوسرے میں پیوست ہیں۔

نارنگ نے نقادوں کی ایک نسل تیار کی۔ آج اردو تنقید میں جو سائنسی لب ولہجہ اور نظریاتی گہرائی نظر آتی ہے، اس میں نارنگ کا کردار بھی اہم نظر آتا ہے۔ ناصر عباس نیر، شمیم حنفی، قدوس جاوید اور کئی دیگر معاصر نقادوں کے ہاں نارنگ کے قائم کردہ تنقیدی معیارات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ انھوں نے اردو تنقید کو وہ ''لغت'' فراہم کی جس کے بغیر آج کا ادبی مکالمہ ادھورا ہے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ محض ایک نقاد نہیں تھے بلکہ اردو تنقید کے ایک ''پیراڈائم'' تھے۔ انھوں نے ساختیات، مابعد جدیدیت اور اسلوبیات کے ذریعے اردو ادب کو متن کی مرکزیت اور معنوی تکثیریت کا درس دیا۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مغرب کے جدید ترین نظریات کو اردو کی مشرقی اور کلاسیکی شعریات کے ساتھ ہم آہنگ کیا۔ اردو دنیا انھیں ایک ایسے رجحان ساز مفکر کے طور پر تسلیم کرتی ہے جس نے اردو ادب کو مختلف نظریات کی شمولیت سے ثروت مند کیا۔

حواشی

1 شمس الرحمن فاروقی۔ اردو تنقید کی تاریخ۔ (ترمیم شدہ ایڈیشن)۔ لکھنؤ: مکتبہ جامعہ، 1995۔ ص 212

2 گوپی چند نارنگ۔ ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات۔ دہلی: تعلیمی پبلشنگ ہاؤس، 1993۔ ص 18

3 گوپی چند نارنگ۔ ادبی تنقید اور اسلوبیات۔ دہلی: تعلیمی پبلشنگ ہاؤس، 1989۔ ص 24۔

4 گوپی چند نارنگ۔ ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات۔ دہلی: تعلیمی پبلشنگ ہاؤس، 1993۔ ص 42۔

5 گوپی چند نارنگ۔ مابعد جدیدیت: نظریاتی تناظر۔ دہلی: شاہد پبلی کیشنز، 2004۔ ص 58۔

■

Mr. Arif N
Research Scholar, Dept.of Urdu,
Sree Sankaracharya University of Sanskrit,
Regional Campus Koyilandi, Naduvathur P.O.,
Koyilandy, Kozhikode - 673 330,Kerala
Mob.: 918089810461
E-mail: arifn651@gmail.com

شخصیات

توفیق احمد چشتی امروہوی کی علم دوستی

سید مسعود حسن

یادش بخیر، 1987/88 کا زمانہ تھا۔ میں ان دنوں خدا بخش لائبریری میں بحیثیت ریسرچ فیلو لائبریری کے گیسٹ ہاؤس میں شعائر اللہ صاحب (رامپور) کے ہمراہ ایک کمرہ میں مقیم تھا۔ اس گیسٹ ہاؤس میں باہر سے آنے والے اسکالرس کا اکثر قیام رہتا اور ہم لوگوں کو ان سے ملاقات اور گفتگو کا موقع ملتا۔ وامق جونپوری، کیف بھوپالی، کلیم سہرامی اور دیگر مشاہیر سے ملاقاتیں اور باتیں ہوتیں۔ ان ہی دنوں پتہ چلا کہ امروہہ سے توفیق صاحب آنے والے ہیں۔ صبح ہی ان سے گیسٹ ہاؤس میں ملاقات ہوگئی۔ درمیانہ قد، قدرے فربہ بدن، گندمی رنگ، روشن چہرہ اور آنکھوں میں تلاش وجستجو کی چمک، ٹوپی قمیص پائجامہ میں ملبوس۔ یہ تھے توفیق احمد چشتی صاحب، بڑے تپاک سے ملے۔ سلام ودعا کے بعد ہم رخصت ہوکر لائبریری کی تیاری میں مشغول ہوگئے۔ کینٹین میں ناشتہ کے درمیان انھیں بھی تلاش کیا تو کیمپس میں موجود نہیں تھے۔ چند گھنٹوں بعد ملے۔ دریافت کرنے پر فرمایا کہ میں آپ کے شہر میں نوادر کی تلاش میں گھوم رہا تھا۔ آپ کے شہر کی خاک سے دو نوادر نکال لایا ہوں۔ ان میں ایک شاہی فرمان تھا اور دوسرا ایک تانبے کا کٹورا۔ ہم اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ جب اس کی قیمت بتائی تو اور حیرت ہوئی۔ توفیق صاحب اسے بھانپ گئے۔ برتن میں پانی منگواکر انھوں نے فرامین کو ڈبودیا اور چند منٹ بعد اسے واپس نکال کر فرمایا دیکھیے یہ مغلیہ فرمان ہے اور اسکی خوبی یہ ہے کہ اس سیاہی پر پانی اثر انداز نہیں ہوتا۔ تانبے کے کٹورے کی خصوصیت یہ بتائی کہ اس پر کندہ عبارت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اسے شاہ عالم ثانی کی تاج پوشی کے وقت بادشاہ کی نذر کیا گیا تھا۔ یہ کٹورا انھوں نے ایک حلوائی سے حاصل کیا تھا۔ یہ تھی میری توفیق صاحب سے پہلی ملاقات۔

ابتدائی تعلیم والدہ کی سرپرستی میں گھرپر ہوئی۔ اس کے بعدکی تعلیم مرکز تعلیم اسکول میں حاصل کی اورپھر آئی۔ایم انٹر کالج میں زیر تعلیم رہے۔ انھوں نے آبائی پیشہ کاشت کاری سے ہٹ کر علمی کاروبار میں قدم رکھا ۔امروھہ میں 10/اپریل 1959میں نیشنل بک ڈپو کے نام سے ایک ادارہ امرو ھہ کے گدڑی بازار میں قائم کیا جو ان کی کوششوں سے نوادرات کا ایک اہم مرکز بن گیا ہے۔ ہندوستان کے کتب خانے، میوزیم ان سے رجوع کر کے نوادر ات خریدتے اور اپنے ادارے کو ثروت مند بناتے۔

توفیق صاحب 11/دسمبر 1940 کو امروہہ کے محلہ بساون گنج میں پیدا ہوئے اور 9/اگست 2016 کو ان کی کتاب زندگی مکمل ہوگئی۔ درگاہ شاہ ولایت ان کی آخری آرام گاہ ہے۔

ابتدائی تعلیم والدہ کی سرپرستی میں گھر پر ہوئی۔ اس کے بعد کی تعلیم مرکز تعلیم اسکول میں حاصل کی اور پھر آئی۔ ایم انٹر کالج میں زیر تعلیم رہے۔ انھوں نے آبائی پیشہ کاشت کاری سے ہٹ کر علمی کاروبار میں قدم رکھا۔ امروہہ میں 10/اپریل 1959 میں نیشنل بک ڈپو کے نام سے ایک ادارہ امروہہ کے گدڑی بازار میں قائم کیا جو ان کی کوششوں سے نوادرات کا ایک اہم مرکز بن گیا ہے۔ ہندوستان کے کتب خانے، میوزیم ان سے رجوع کر کے نوادرات خریدتے اور اپنے ادارے کو ثروت مند بناتے۔ اس کے علاوہ اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز بھی ان کے ادارے میں آکر نہ صرف کتابیں خریدتے بلکہ معلومات بھی حاصل کرتے تھے۔ نیشنل بک ڈپو مخطوطات اور مطبوعات کے خزانے کے ساتھ

علمی مرکز بھی تھا۔ڈاکٹر شعائر اللہ خاں (رامپور) نے اسے روہیل کھنڈ میں مراجع کا سب سے عمدہ ذخیرہ بتایا ہے۔علامہ عبدالعزیز میمن نے افادات میمنی میں (اردو نامہ،ترقی اردو بورڈ، کراچی، شمارہ 31/41، 1970/ 1966) ایسے ہی ایک کتب فروش کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے بیان کیا ہے کہ دمشق میں احمد عبید کا مکتبہ تھا جو کتب فروشی کے ساتھ اہل علم کی ضرورتیں بھی پوری کرتا تھا۔

نیشنل آرکائیوز والے توفیق صاحب کے خصوصی خریدار تھے۔ان کے فروخت کیے گئے ایک ذخیرہ کا تعارف کراتے ہوئے جاتی رام گپتا نے ایک مضمون Printed Papers: Taufiq Ahmad Chishti Collections کے عنوان سے تحریر کیا تھا جو نیشنل آرکائیوز کے رسالے Indian Archives میں شائع ہوا تھا۔گپتا صاحب لکھتے ہیں کہ:

" Its consists of 155 documents in persian and Urdu.covering the period of 1684-1922 A.d.Most of the documents are attested and bear seals. It throws a flood of light on the political ,social and economic conditions obtaining in Uttar Pradesh"(July-Dec 1972 , P41-42)

ان کا کام چونکہ نوادر و مخطوطات کی خرید و فروخت کا تھا لہٰذا جب لائبریری آتے تو ملاقات ہوتی۔گفتگو سے اندازہ ہوا کہ مخطوطات اور نوادر پر گہری نظر رکھتے ہیں۔وہ گھوم گھوم کر علم کے موتی تلاش کرتے اور کتب خانوں اور عجائب خانوں کے ہاتھوں فروخت کر دیتے۔اس طرح یہ اثاثہ محفوظ ہو جاتا۔توفیق صاحب کے لیے یہ کاروبار ہی نہیں ایک مشن بھی تھا۔لہٰذا اس مشن میں جب مخطوطات یا دستاویزات ہاتھ آتے تو لائبریری کو مطلع کرتے یا خود تشریف لاتے۔مخطوطات کی خصوصیات پر ایک جامع نوٹ ضرور تحریر کرتے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کی انھوں نے اس پر کتنی تحقیق کی ہے۔مثلاً مثنوی عرفان بیدل (مرزا عبدالقادر بیدل) پر ان کا نوٹ ملاحظہ ہو:

'' مثنوی عرفان بیدل 1130ھ کا مکتوبہ ہے۔ لیکن حوض کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ 1130ھ سے قبل کتابت کیا گیا ہے۔مرزا عبدالقادر بیدل کا سال وفات 1133ھ ہے۔مرزا عبدالقادر بیدل کی صرف افغانستان ویب سائٹس پر ایک تصویر ہے۔اس کے علاوہ دوسری تصویر ہمارے نسخہ میں موجود ہے۔''

توفیق صاحب نے 2007 میں والیان بھوپال کی خط و کتابت کا تاریخی مواد حاصل کیا تھا جس میں بیگمات بھوپال، سید سلیمان ندوی، لارڈ کرزن اور نواب حمید اللہ خاں وغیرہ کے خطوط شامل تھے۔ان دستاویزات کی تحقیق کے بعد انھوں نے اس بات کی نشاندہی کی تھی کہ بھوپال پر لکھی گئی تاریخوں (تاریخ ریاست بھوپال، داستان بھوپال) میں ان دستاویزات کا ذکر موجود نہیں۔لہٰذا تواریخ بھوپال ان دساویزات کی روشنی میں ناقص رہ جاتی ہیں۔ان میں پروانہ جات و دیگر خطوط کا کوئی بھی ذکر نہیں۔

مثنوی عرفان بیدل 1130ھ کا مکتوبہ ہے۔لیکن حوض کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ 1130ھ سے قبل کتابت کیا گیا ہے۔مرزا عبدالقادر بیدل کا سال وفات 1133ھ ہے۔مرزا عبدالقادر بیدل کی صرف افغانستان ویب سائٹس پر ایک تصویر ہے۔اس کے علاوہ دوسری تصویر ہمارے نسخہ میں موجود ہے۔

'' قاطع برہان بخط غالب' کا نسخہ انھوں نے حیدر آباد سے 2013 میں دریافت کیا تھا۔ان دنوں پٹنہ آئے تو اس نسخے کی مجھ کو بھی زیارت کرائی تھی۔انھوں نے تذکرہ سرور (فارسی) کا ایک مخطوطہ بھی دریافت کیا تھا جو دو سو سال پرانا تھا۔توفیق صاحب نے اسے کانپور کے ایک غیر مسلم سے خطیر رقم کی ادائیگی کے بعد خریدا تھا۔ راجہ ناگ بھٹ (828) کی تانبے پر لکھی ہوئی دستاویز سنبھل سے کھوج نکالی جس سے سنبھل اور کنور کی قدیم تاریخ پر روشنی پڑتی ہے۔ان کے حاصل کردہ نوادرات نیشنل میوزیم، نئی دہلی، نیشنل آرکائیوز، الہ آباد میوزیم، خدابخش لائبریری وغیرہ میں محفوظ ہیں۔

توفیق صاحب نے یوں تو کئی نوادر مخطوطات خرید و فروخت کیے مگر جس مخطوطے کی دریافت سے شہرت حاصل ہوئی وہ '' دیوان غالب بخط غالب'' تھا۔غالب صدی (1969) کے موقع پر جس کی دریافت کا اعلان کیا گیا تھا۔اس نسخے کو انھوں نے بھوپال سے دریافت کیا۔اس سلسلہ میں بی بی سی کے مشہور براڈ کاسٹر رضا علی عابدی انکا انٹرویو لینے امروہہ تشریف لائے تھے۔یہ انٹرویو بی۔بی۔سی سے نشر کیا گیا اور پھر کتب خانہ کے نام سے شائع بھی ہوا۔توفیق صاحب نے اس کی جو تفصیل بیان کی ہے وہ درج ذیل ہے:

''ایک مخطوطہ نسخہ غالب بہ خط غالب 5 اپریل 1969 کو میں نے بھوپال سے گیارہ روپے کا خرید کیا تھا۔میں یہاں سے تقریباً سات آٹھ ہزار روپے کی پونجی لے کر بھوپال گیا وہاں جانے کے بعد وہاں کے کباڑیوں سے میری ملاقات ہوئی ایک کباڑی نے مجھ سے کہا کہ ہم آپ کو کتاب دلوائیں گے وہاں ایک پرانی کتابوں کا کاوباری ملا اس نے ہم کو اپنی کتابیں دکھائیں جب اس نے الماری کھولی تو بہت سی کتابیں تھیں دیوان غالب بھی نکلا اب ہم نے سب سے پہلے دیوان غالب پر ہاتھ نہیں رکھا بلکہ ہر کتاب کے بارے میں پوچھتے چلے گئے۔ یہ ہمارا تجارتی گر تھا اور آخر میں ہم نے ان سے پوچھا کہ اس کتاب کی کیا قیمت مانگتے ہیں۔انھوں نے اولاً پچیس روپے طلب کیے۔ ہوتے ہوتے دس روپے پر سودا ہوا اور ایک روپیہ انھوں نے اور لیا ہم سے (کتب خانہ۔رضا علی عابدی)

اس نسخے کی اہمیت کے پیش نظر انھوں نے درج ذیل اشتہار دہلی کے ایک اردو روزنامہ میں ۷/اپریل 1969 کو شائع کیا۔

''ہر خاص و عام کو اور حکومت بہار، خصوصا حاجی عبدالحمید صاحب ، مالک ہمدرد دواخانہ دہلی اور وہ ادارے جو غالب کے لٹریچر یا اس کی تحریر سے دلچسپی رکھتے ہوں یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ میرے پاس مرزا غالب کی خودنوشت بیاض ، غیر مطبوعہ موجود ہے۔اس کی خریداری کے لیے مجھ سے ملیں یا خط و کتابت کریں

نوٹ :اس بیاض کی قیمت کم سے کم چھ ہزار

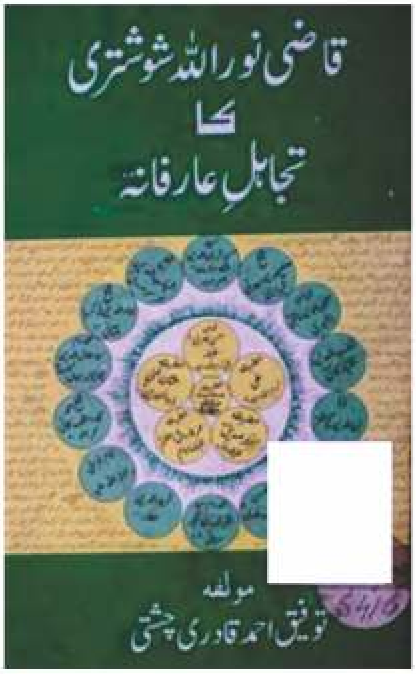

توفیق صاحب کتابوں کے تاجر کے ساتھ صاحب تصنیف بھی تھے۔قاضی نور اللہ شوشتری کا تجاہل عارفانہ اور ''حضرت سید شاہ شرف الدین حسن سہروردی واسطی کا مذہب سنی حنفی'' ان کی مطبوعہ کتابیں ہیں۔ان کے علاوہ دو کتابیں'' صوفیہ کادشمن کون'' اور ''اقوام ہندوستان کا ایک غائر مطالعہ'' زیر ترتیب تھیں۔

روپے ہوگی۔''

1969 میں غالب کی صد سالہ تقریبات منائی جارہی تھی۔یہ اطلاع عام ہوتے ہی دھوم مچ گئی۔غالبیات کے ماہرین متوجہ ہوئے۔پروفیسر غلام رسول مہر نے نقوش (لاہور) کے غالب نمبر میں لکھا ہے کہ جونسخہ پہلے مالک کے نزدیک محض پتھر کا ایک ٹکڑا تھا وہ دوسرے مالک کے ہاتھوں میں پہنچتے ہی کوہ نور بن گیا کیوں کہ وہ جوہری تھا یا جو جوہری ثابت ہوا۔پروفیسر نثار احمد فاروقی نے اس دریافت کے سلسلہ میں تحریر کیا ہے کہ

''اس دریافت کے سلسلہ میں مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ توفیق احمد صاحب نے اسے گوشہ گمنامی سے نکال کر اردو ادب پر عموماً اور غالب شناسوں پر خصوصاً عظیم احسان کیا ہے''

یہ نسخہ امتیاز علی عرشی اور ان کے صاحبزادے عرشی زادہ تک پہنچا۔اور دیوان غالب نسخہ عرشی کے نام سے شائع ہوگیا۔مگر اس کے بعد یہ نسخہ پر اسرار طور پر ایک بار پھر دریافت ہونے کے لیے گم ہوگیا۔اس کی پوری تفصیل رضا علی عابدی کی کتاب '' کتب خانہ'' میں بعنوان ''غالب کوئے ملامت میں'' درج ہے ۔جسے پڑھ کر حیرت بھی ہوتی ہے اور عبرت بھی۔

نوادر کی تلاش میں جب بہار کا سفر ہوتا تو پٹنہ آتے پھر یہاں سے دوسری جگہ کا سفر کرتے۔فون سے آنے کی اطلاع دیتے ۔ ملنے جاتا تو حاصل کیے گئے مخطوطات دکھاتے اور اس کی اہمیت بتاتے۔نوادرات کے حصول کے لیے آنے سے قبل مقامی اردو اخبارات میں اشتہارات دے کر ذاتی ذخیرے کے مالک کو متوجہ کرتے ۔مجھ سے بھی دریافت کرتے ۔ہمارے برادر عم سید آفتاب حسنین صاحب (گیا) کے پاس قرآن کا ایک قدیم قلمی نسخہ موجود تھا۔حسنین بھیا اس کی حفاظت کے سلسلہ میں فکر مند رہتے تھے۔انھیں یہ خدشہ تھا کہ کہیں یہ ضائع نہ ہو جائے۔مجھ سے اس کی حفاظت اور اس کی اہمیت کے بارے میں بات ہوتی رہتی تھی۔میں نے اس کا تذکرہ توفیق صاحب سے کیا تو وہ گیا پہنچ گئے۔قرآن کا نسخہ دیکھنے کے بعد انھوں نے خریداری کے لیے پیش کش بھی کی تھی مگر بات طے نہ ہو پائی۔

توفیق صاحب کتابوں کے تاجر کے ساتھ صاحب تصنیف بھی تھے۔قاضی نور اللہ شوشتری کا تجاہل عارفانہ اور ''حضرت سید شاہ شرف الدین حسن سہروردی واسطی کا مذہب سنی حنفی'' ان کی مطبوعہ کتابیں ہیں۔ان کے علاوہ دو کتابیں'' صوفیہ کادشمن کون'' اور ''اقوام ہندوستان کا ایک غائر مطالعہ'' زیر ترتیب تھیں (بحوالہ معارف اعظم گڑھ ستمبر 2016)۔

توفیق صاحب کو ان کی علمی خدمات کی بنا پر ''گوجر رتن'' ''مینار علم''اور'' امروہہ گورو'' سے نوازا جاچکا ہے۔1998 میں سابق وزیر اعظم چندر شیکھر کے ہاتھوں قومی ایوارڈ سے نوازے گئے۔

اس میدان میں مخطوطات ونوادر کے کاروباری تو آپ کو مل جائیں گے مگر ان جیسا صاحب نظر کم ملے گا۔ان کے قائم کردہ ادارے کی ذمہ داری اب ان کے صاحب زادوں پر آن پڑی ہے۔ ان کے ۳،۲ صاحبزادوں سے میری ملاقات رہی ہے۔ان میں انوار صمدانی توفیق صاحب کے ساتھ کئی بار پٹنہ تشریف لائے۔انھیں مخطوطہ شناسی کا ذوق وراثت میں ملا ہے۔

انوار صمدانی صاحب نے مخطوطہ کو بنیاد بنا کر کئی مضمون تحریر کیے ہیں۔ان میں ''دکھنی اردو کا گوہر آبدار مخطوطہ خزانہ عبادت (معارف ،اعظم گڑھ جنوری 2015) ''اصغر گونڈوی اور ان کا غیر مطبوعہ کلام (معارف، اعظم گڑھ ،ستمبر 2013) قاطع برہان بخط غالب (معارف ،اعظم گڑھ اگست 2013) قابل ذکر ہیں۔ قاطع برہان میں انھوں نے غالب کی تحریر کے سلسلہ میں جو تحقیق کی ہے وہ قابل تعریف ہے۔انھوں نے مخطوطہ کے طرز املا کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ یہ نسخہ بخط غالب ہے۔ان کے اس نتیجہ کی تائید پروفیسر شریف حسین قاسمی اور خلیق انجم نے بھی کی ہے۔مطالعہ غالب کے سلسلہ میں یہ دریافت یقیناً بیش قیمت اضافہ ہوگی۔انھوں نے بھوپال سے بدایوں کے صوفیا کا ایک غیر مطبوعہ تذکرہ ''طبقات الاولیا فی مدینۃ الاولیا مصنف شیخ سعدالدین بصیر(م 1221ھ) بھی دریافت کیا تھا۔اس مخطوطہ پر ان کا تفصیلی مضمون فکر و تحقیق (نئی دہلی)2019 میں شائع ہو چکا ہے نیز اس کا فارسی ترجمہ ایران کے رسالہ بساتین میں بھی طبع ہوا ہے۔

توفیق صاحب نے اپنی پوری زندگی علم کے موتی تلاش کرنے میں وقف کردی تھی۔وہ اس کام میں مشن کے طور پر لگے رہے۔ان کے انتقال کے بعد ہم ہی نہیں ان کی دریافت شدہ مخطوطات بھی سوگوار ہوں گے کہ ان کا غم گسار چلا گیا۔

توفیق صاحب کے انتقال کے بعد اب ان کی علمی وراثت کو انوار صمدانی صاحب سنبھالے ہوئے ہیں۔جو توفیق صاحب کے تربیت یافتہ ہیں اور جے این یو سے تعلیم یافتہ بھی۔آج بھی مخطوطات اور قدیم مطبوعات کے متلاشی ان سے مستفید ہوتے رہتے ہیں۔

■

Dr.Syed Masood Hasan
603-B, Tower C,Aligarh Green Apptt
Manzoor Garhi Bypass Road
Aligarh-202122
Mob: 9430245803

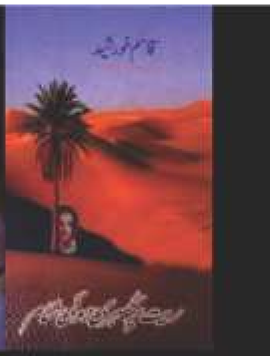

توقیر عالم

قاسم خورشید

حیات اور ادبی کارنامے

قاسم خورشید اردو زبان کے نامور ادیب، افسانہ نگار، مصور، ڈرامہ نویس، ناقد، براڈ کاسٹر، اور شاعر خوش نوا تھے۔ وہ ہمہ جہت اوصاف کے حامل انسان تھے۔ عصر حاضر میں ایسی کثیر الجہات شخصیت اردو دنیا میں خال خال ہی نظر آتی ہے۔ ان کی تحریروں اور نگارشات میں درد و الم، سماج اور معاشرے کی بے راہ روی کا دکھ، انسانی قدروں کا احترام، عصری شعور و آگہی کا پرتو اور خلوص و محبت کی ضوفشانی پائی جاتی ہے۔

ان کے اچانک انتقال سے اردو کی ادبی دنیا پر سناٹا چھا گیا۔ ان کی موت کسی ایک ادیب کی موت نہیں ہے بلکہ اردو اور ہندی ادب کے حسین سنگم کا ایک ساتھ بکھر جانا ہے۔

قاسم خورشید ایک شریف، دیندار اور پابند شریعت خانوادے کے چشم و چراغ تھے ان کی پیدائش، ضلع جہان آباد کے مردم خیز گاؤں ''کاکو'' میں 2 جولائی 1957 کو ہوئی تھی۔ صغر سنی ہی میں ان کے والد محترم سید غلام ربانی کا انتقال ہو گیا تھا اور وہ شفقت پدری سے محروم ہو گئے تھے۔ ان کی والدہ پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت کی غرض سے بچوں کو لے کر اپنی مائکے منتقل ہو گئیں اور انھوں نے بچوں کو اعلی اخلاقی تعلیمات سے سنوارنے اور سجانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ دادا نے اپنا دست شفقت دراز کیا۔ اپنے ہونہار پوتے کی ہر طرح مدد کی۔ ہر آن ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہے اور یتیمی کے رنج و غم کا احساس نہیں ہونے دیا۔ پٹنہ پہنچے تو یہاں خالہ زاد مظفر الجاوید نعیمی مددگار ثابت ہوئے۔

قاسم خورشید کو بچپن ہی سے مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا۔ لڑکپن کا زمانہ کھیل کود اور موج مستی کا زمانہ ہوتا ہے لیکن قاسم خورشید کو اپنے اور گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے کبھی ''پرل موٹرز'' میں کام کرنا پڑا۔ کبھی بس کے اسٹیل پرزوں کو پالش کرکے اسے چمکا کر اپنے گھر کو چمکانے اور روشن کرنے کی کوشش کرنی پڑی۔ جب اسکول سے تھکے ماندے واپس اپنے گھر آتے تو

قاسم خورشید ایک شریف، دیندار اور پابند شریعت خانوادے کے چشم و چراغ تھے ان کی پیدائش، ضلع جہان آباد کے مردم خیز گاؤں 'کاکو' میں 2 جولائی 1957 کو ہوئی تھی۔ صغرسنی ہی میں ان کے والد محترم سید غلام ربانی کا انتقال ہو گیا تھا اور وہ شفقت پدری سے محروم ہو گئے تھے۔

اسکول کی فیس اور کتاب، کاپی، قلم اور گھر کے اخراجات میں حصہ لینے کے لیے چھوٹے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے چلے جاتے۔ تعطیلات کے دنوں میں چھوٹا موٹا روزگار اختیار کر لیتے۔ ان سب تجربات نے ان کی شخصیت کو نکھارنے اور صیقل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ جدوجہد، کد و کاوش اور محنت و مشقت ان کی زندگی کا دوسرا نام بن گئی تھی لیکن ان سب رکاوٹوں اور پریشانیوں کے باوجود انھوں نے حصول علم کی جستجو کو ماند نہیں پڑنے دیا اور اعلی تعلیم حاصل کرنے کی جدوجہد کو جاری رکھا یہاں تک کہ انھوں نے آئی اے اورینٹل کالج سے، بی اے آنرز اور ایم اے پٹنہ یونیورسٹی سے کیا اور اسی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی اعلی ڈگری سے سرفراز ہوئے۔ ان کی تحقیق کا موضوع پریم چند کے ناول ''گئو دان'' کا ادبی احتساب تھا۔ یہ دشوار گزار سفر ان کی بلند ہمتی، حوصلہ مندی، اعلی جذبہ اور محنت و لگن کی روشن دلیل ہے۔ انھوں نے یہ ساری اعلی کامیابیاں اور کامرانیاں اپنی قابلیت، صلاحیت، ذہانت و فطانت اور بلند عزم و حوصلہ کی بنیاد پر حاصل کی تھیں۔ کہانی باگھ دادا ان کی آپ بیتی ہے۔ اس کہانی میں انھوں نے اپنے خاندان کی مفلسی اور محرومی کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے کہ قاری کو وہ اپنی داستان محسوس ہونے لگتی ہے۔ ان کی مقبول ترین کہانی ''باگھ دادا'' کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

''اس رات سبھی سو چکے تھے۔ میں نے دھیرے سے دروازہ کھولا۔ زوروں کی بھوک لگی ہوئی تھی۔ باگھ دادا کے مقبرے

پڑ گیا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ میں نے سرہانے ٹٹولنے کی کوشش کی۔ کچھ بھی نہیں ملا۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ آنکھوں میں آنسو رواں تھے۔ دیر تک یہ سلسلہ قائم رہا۔ میرے دل نے اس وقت باگھ دادا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا: آپ تو باگھ دادا ہیں۔ آپ نے تو آدم خور کو مار ڈالا تھا۔ بھوک ہمیں مار رہی ہے۔ کیا آپ اسے نہیں مار سکتے۔''

قاسم خورشید انتہائی خوش مزاج، خوش طبع اور مرنجا مرنج طبیعت کے انسان تھے۔ وہ جس مجلس اور محفل میں شریک ہوتے وہ محفل زعفران زار بن جاتی تھی۔ ان کے والہانہ بانکپن، دوستانہ مراسم اور روابط اور ان کی مسکراہٹوں اور قہقہوں کی بازگشت دیر تک حاضرین کے دلوں میں اضطرابی کیفیت پیدا کرتی رہے گی۔

قاسم خورشید متعدد اعلی سرکاری و غیر سرکاری عہدوں پر فائز رہے اور اپنی گراں قدر خدمات سے ان کو زینت بخشی۔ انھوں نے آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ رہ کر اپنے طرز تکلم اور حسن اسلوب سے سامعین کو مسحور کیا۔ دوردرشن پروگراموں کے ذریعے انھوں نے اپنی آواز کی رعنائیوں سے لوگوں کے دلوں کو خوش کیا۔ حکومت بہار کے ایس سی ای آر ٹی کے محکمہ سے ان کے گہرے اور دیرینہ مراسم اور تعلقات تھے۔ انھوں نے اس کے شعبہ زبان وادب میں طویل عرصہ تک گراں قدر خدمات انجام دیں۔ انھوں نے تعلیمی ٹیلی ویژن کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے فلم سازی، نصابی کتب کی تیاری اور تربیتی پروگراموں میں اہم رول ادا کیا۔ ان کی فلم کو جاپان فلم فیسٹیول میں شامل کیا گیا جو ایک بڑی کامیابی کی بات ہے جس سے عالمی سطح پر ان کو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ وہ پریم چند، میکسم گورکی اور نکولائی استرا ووسکی کے افکار و نظریات سے بہت متاثر تھے۔ وہ پریم چند کی حقیقت نگاری کے رسیا اور دلدادہ تھے۔ انھوں نے کہانیوں اور قصوں میں حقیقت نگاری پر خاص توجہ مرکوز کی ہے۔ ان کا اپنی کہانیوں کے سلسلے میں کہنا ہے کہ ''میں پورے اعتماد اور وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میری کہانیوں سے گزرتے ہوئے کوئی بھی حساس قاری اپنے احتساب کے دوران مجھے بھی ہمسفر بنانے کا شرف حاصل کرے گا'' ادبی اور تخلیقی نگارشات اور کاوشوں نے قومی اور بین الاقوامی سطح پر ان کی مقبولیت اور پذیرائی میں مزید اضافہ کیا تھا۔ انھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز بچوں کے ادب سے کیا اور پھر رفتہ رفتہ بالغوں کے لیے افسانے لکھنے لگے ان کے افسانے جلد ہی عوام وخواص میں مقبول ہوگئے اور انھوں نے اردو افسانہ نگاری میں اپنا مقام مضبوط کر لیا اس کے علاوہ وہ مشہور اور موقر ادبی رسالوں میں اپنی صلاحیتوں اور لیاقتوں کے جوہر دکھاتے رہے۔

قاسم خورشید اردو کے ممتاز افسانہ نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی افسانہ نگاری سے اردو ادب کو نئے افق سے آراستہ و پیراستہ کیا۔ انھوں نے زندگی کو حقیقی روپ میں دیکھا۔ ان کے افسانوں میں غریب و کمزور طبقوں کی سچی تصویریں ملتی ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری کی اہم خصوصیات حقیقت نگاری، سادہ اور اثر انگیز اسلوب تحریر، سماجی اور معاشرتی مسائل پر گہری اور عمیق نظر اور روزمرہ کی زندگی کے کرداروں کا عمیق مشاہدہ ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں معاشرتی حقیقتوں اور سچائیوں کو علامتی اسلوب میں پیش کرنے کی حتی المقدور سعی کی ہے اور انسانی کرداروں کا گہرا تجزیہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے معاشرے کی حقیقی زندگی کے واقعات اور مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا اور ان پر کھل کر گفتگو کی۔ ان کا اسلوب سادہ اور دلکش ہے جس میں وہ پیچیدہ اور الجھے ہوئے انسانی جذبات واحساسات اور سماجی حقیقتوں کو آسانی سے بیان کردیتے ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے معاشرتی تضادات اور مسائل کو نمایاں کیا اور اصلاحی پیغام دینے کی کوشش کی ہے اور یہی سماجی حقیقت نگاری ان کی اصل پہچان ہے۔ ان کی نثری تحریریں شگفتگی اور رواں اسلوب بیان کی وجہ سے دلچسپی اور شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ ان کے تین اہم افسانوی مجموعے 'پوسٹر'، 'ریت پر ٹھہری ہوئی شام' اور 'کینوس پر چہرے' ہیں۔ پوسٹر ان کا سب زیادہ پڑھا جانے والا افسانہ ہے۔ اسے توقع سے زیادہ مقبولیت اور پذیرائی حاصل ہوئی اور یہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں ہے۔ معاصر افسانے میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔

قاسم خورشید ایک اچھے اردو شاعر تھے۔ ان کو طالب علمی کے زمانے ہی میں شعر وشاعری سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ ان دنوں وہ ''جعفر'' یا ''کیو۔ کے جعفر'' کے نام سے شاعری کیا کرتے تھے۔ ابتدائی دور کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو اس میں فکر کی بلندی ،الفاظ وتعبیرات کی سجاوٹ و بناوٹ اور شاعری کی تمام خصوصیات کی پختہ کاری پورے طور پر نظر آتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

پھولوں کی خاموشی سے ظاہر یہ ہو رہا ہے
کہ اس چمن کا مالی پھر خار بو رہا ہے

آواز دے رہا ہے پورب سے پھر سویرا
اپنا شریر سورج دریا میں دھو رہا ہے

یہ تنکا زمیں پر سے اٹھ جائے گا
کہ چڑیا کہیں اپنا گھر بسانے کو ہے

انھوں نے نہایت آسان، سلیس مگر شستہ، شگفتہ اور عام فہم زبان میں شاعری کی ہے۔

قاسم خورشید اردو کے ممتاز افسانہ نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی افسانہ نگاری سے اردو ادب کو نئے افق سے آراستہ و پیراستہ کیا۔ انھوں نے زندگی کو حقیقی روپ میں دیکھا۔ ان کے افسانوں میں غریب وکمزور طبقوں کی سچی تصویریں ملتی ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری کی اہم خصوصیات حقیقت نگاری، سادہ اور اثر انگیز اسلوب تحریر، سماجی اور معاشرتی مسائل پر گہری اور عمیق نظر اور روزمرہ کی زندگی کے کرداروں کا عمیق مشاہدہ ہیں۔

رشتوں کا بازار ملے گا
جو چاہو کردار ملے گا

———

سکھ تیرے ساتھ رہیں گے
اور دکھ بیزار ملے گا

———

دل کی جب نادانی لکھنا
پیار، محبت، پانی لکھنا

———

بزم سے ان کی واپس آکر
دریا، آنکھ، روانی لکھنا

———

جب آنکھوں میں آنسو آئے
میری ایک کہانی لکھنا

ان کی شاعری میں ایک خاص فنی مہارت اور تہذیبی وثقافتی گہرائی پائی جاتی ہے۔انھوں نے اپنے کلام میں اردو شاعری کی روایات کو جدید انداز اور پیرائے میں پیش کیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے ادبی کارنامے شاعری کے لحاظ سے بھی کافی اہمیت ومعنویت کے حامل ہیں۔شاعری میں ان کے دو مجموعے منصۂ شہود پر آئے جن میں ایک کا نام 'تھکن بولتی ہے' اور دوسرا مجموعہ ''دل کی کتاب'' ہے۔پہلے مجموعے کا تعلق غم دوراں اور غم کائنات سے ہے جبکہ دوسرے مجموعے کا تعلق غم جاناں اور غم ذات سے ہے۔گزرتے وقت کے ساتھ ان کی شاعری میں عصری حسیت اور انسانی جذبات و احساسات کی عکاسی نے مرکزی حیثیت کا روپ اختیار کر لیا تھا۔

مجھے پھولوں سے،بادل سے ہوا سے چوٹ لگتی ہے
عجب عالم ہے اس دل کا،وفا سے چوٹ لگتی ہے

———

عشق میں اتنے تماشے ہیں کہ اے جان جگر
زندہ رہتے ہوئے مر کر نہیں دیکھا جاتا

———

خوشبوئیں دور سے احساس کرا دیتی ہیں
ہر کسی پھول کو چھو کر نہیں دیکھا جاتا

———

نیند سے ترک تعلق جو ہوا تیرے بعد
دن گزرتا ہے مگر رات کہاں ہوتی ہے

———

میں خوش ہوا تو آنکھ سے آنسو نکل پڑے
میری خوشی میں درد کا حصہ ضرور ہے

———

بہت سی خوبیاں مر جاتی ہیں زمانے میں
کسی کا عیب ہی اکثر نظر میں رہتا ہے

قاسم خورشید عہد حاضر کے اردو ڈراما نگاروں کی فہرست میں اہم ڈراما نگار شمار کیے جاتے تھے۔ان کو ڈراما نگاری اور اداکاری کا بے حد شوق تھا اور یہی شوق ان کو انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن (آئی پی ٹی اے) تک لے گیا۔بہار میں انھوں آئی پی ٹی اے کی از سر نو شروعات کی تھی۔غیر منقسم بہار کے جھریا، کتراس گڑھ

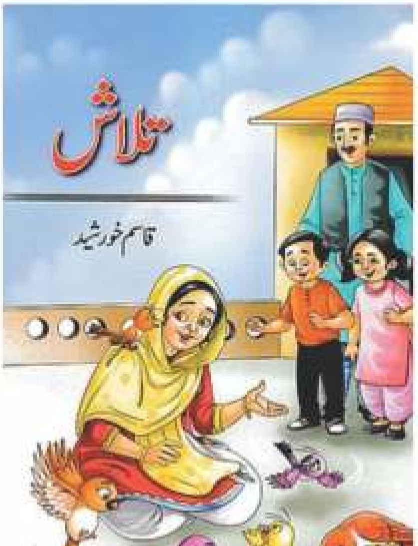

اور دھنباد کے مزدور طبقوں میں حقوق کی بازیابی کے لیے بیداری پیدا کرنے میں اہم رول ادا کیا تھا۔یہاں کے محنت کش مزدوروں میں بیداری لانے کے لیے نکڑ ناٹک بھی پیش کی تھی۔اس میں ہدایت کاری بھی تھی اور اداکاری بھی کی تھی اس کے علاوہ انھوں نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے ڈرامے، دستاویزی فلمیں اور فیچرس بھی لکھے تھے۔انھوں نے منٹو، پریم چند اور راجندر سنگھ بیدی کے معروف افسانوں کو ڈرامائی شکل دے کر اسٹیج کیا تھا۔ان کے متعدد افسانوں پر بنے ڈرامے اور ٹیلی فلمیں دوردرشن کے اسکرین کی زینت بنی تھیں۔تعلیم کے میدان میں بھی ان کی گراں قدر خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔بہار میں نصاب تعلیم کے لیے پہلے درجے سے بارہویں درجے کے طلبا و طالبات کے لیے نوزبانوں میں کتابیں تیار کرائی تھیں۔ان کی کوششوں کی وجہ سے نتیش حکومت نے مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم ولادت کو ''یوم تعلیم'' کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا تھا۔ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ بیک وقت شاعری،افسانہ نگاری اور ڈراما نگاری میں مصروف رہا کرتے تھے۔سب سے پہلے ان کی شہرت اور پہچان صنف افسانہ سے ہی ہوئی تھی۔ان کا پہلا افسانہ 1988 میں رسالہ 'زبان وادب' میں شائع ہوا تھا۔ان کے ڈرامے کا ایک مجموعہ ''تماشہ'' تنقیدی مضمون کا مجموعہ ''متن اور مکالمہ'' اور تحقیقی مقالہ ہیں۔تھکن بولتی ہے اور دل تو ہے بنجارہ یہ دونوں ان کی ہندی شاعری کے مجموعے ہیں۔اسی طرح ہندی میں ان کے چار افسانوی مجموعے 'تھار پر زندگی'، 'کوئی ہاتھ'، 'گنجا کی نیتی' اور 'کشن پور کی مسجد' ہیں۔ان کے منتخب افسانوں کا انگریزی میں ''ویوز'' کے عنوان سے ترجمہ بھی ہو چکا ہے جو کافی مقبول ہوا۔انھوں نے کیف عظیم آبادی کے کلام کو دیوناگری میں ''سنولائی دھوپ'' کے نام سے اور رضا نقوی واہی، مرزا کھونچ اور کریک بتیاوی کے ظریفانہ کلام کا انتخاب ہندی میں ''ٹوٹے ہوئے چہرے'' کے نام سے کیا۔ان کے افسانوں میں قدامت، روایت اور جدت کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے جو ان کو اپنے دیگر معاصرین سے ممیز وممتاز کرتا ہے۔ان کے افسانوں میں گاؤں، دیہات، کھیت کھلیان، کسان، مہاجن اور مزدور پیشہ طبقوں کی غربت وافلاس اور کسمپرسی ومتاجی کا بیانیہ ملتا ہے۔وہ اپنے ایک افسانے میں ایک غریب بوڑھے کسان کی حالت کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔''دن بھر بیلوں کے ساتھ ادھر ادھر گھومتا پھرتا۔شام کے وقت گھر آکر بیلوں کو کھونٹوں سے باندھ دیتا اور پھر اپنے لیے روٹی پکانے کی کوشش کرتا تو ہاتھ جلنے لگتا۔گرم پانی میں چاول ڈالتا تو آنکھوں سے کم دکھائی دینے کی وجہ سے پورا ہاتھ گرم پانی میں چلا جاتا اور وہ چیخ پڑتا لیکن اس کی چیخ سننے والا وہاں کوئی موجود نہیں ہوتا۔'' انھوں نے تقریباً نصف صدی سے زائد عرصے تک بھرپور ادبی زندگی گزاری تھی لیکن قدرت نے ان کو اولاد کی نعمت سے محروم رکھا تھا اس کمی کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے ایک بچی کو گود لے رکھا تھا لیکن اس بچی کی زندگی نے بھی وفا نہیں کی اور ایک بار پھر ان کی زندگی کا آنگن سونا ہو گیا۔بچی کی

قاسم خورشید صرف ایک کامیاب ڈراما نگار ہی نہیں تھے بلکہ ان کے اندر پیش کش اور اسٹیج کرافٹ کرنے کا مکمل شعور موجود تھا۔ ان کے ڈراموں میں عصری روح کا عنصر بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ جس ادب میں عصری روح کا عنصر موجود ہوتا ہے اس کی خوشبو گزرتے وقت کے ساتھ بڑھتی اور پھیلتی جاتی ہے اور مسام جاں کو معطر کرتی رہتی ہے۔

ناگہانی موت کا غم وہ اپنے ساتھ ہی لے کر اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔

وہ اس غم کے احساس کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

ایک بیٹی سے گھر روشن تھا میرے خواب کا
چھن گئیں خوشیاں مری اور آشیاں رہنے دیا

قاسم خورشید صرف ایک کامیاب ڈراما نگار ہی نہیں تھے بلکہ ان کے اندر پیش کش اور اسٹیج کرافٹ کرنے کا مکمل شعور موجود تھا۔ ان کے ڈراموں میں عصری روح کا عنصر بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ جس ادب میں عصری روح کا عنصر موجود ہوتا ہے اس کی خوشبو گزرتے وقت کے ساتھ بڑھتی اور پھیلتی جاتی ہے اور مسام جاں کو معطر کرتی رہتی ہے۔ انھوں نے اپنے ڈراموں میں ڈرامائی عناصر اور پیش کش کے جدید طریقہ کار کو بھی بہت خوبصورت انداز میں ہم آمیز کیا ہے۔ اس میدان میں انھوں نے عمر عزیز کا بڑا حصہ صرف کیا تھا۔ ان کو ڈراموں سے بہت گہری دلچسپی اور عمیق لگاؤ تھا۔ ان کو پریم چند کے افسانوں سے بڑا پریم تھا انھوں نے ان کے افسانے ''جیل'' کو اسٹیج پر پیش کیا تھا اور جب ''عید گاہ'' اور'' انگولا کی آواز'' جیسے ڈراموں کو ناظرین کے سامنے پیش کیا تھا تو لوگ ان کے ایکشن کو دیکھ کر دم بخود رہ گئے تھے اور داد و تحسین کی صداؤں سے پورا اسٹیج گونج اٹھا تھا۔ انھوں نے اپنے افکار و خیالات کے اظہار کے لیے قلم و قرطاس ہی کو ذریعہ کے طور پر استعمال نہیں کیا تھا بلکہ ڈرائنگ اور پینٹنگ کے ذریعہ بھی اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کی کوشش کی تھی اس وجہ سے وہ جدید تہذیب کے بہترین مصور شمار کیے جانے کے قابل ہیں ان کی اہم تصانیف میں متن اور مکالمہ (تنقید) پوسٹر (افسانہ) ریت پر ٹھہری ہوئی شام (افسانہ) کینوس پر چہرے (افسانہ) قانون ساز کاؤنسل میں اقلیت (صحافت) اسی طرح ہندی زبان میں تھکن بولتی ہے (شاعری) کشن پور کی مسجد (کہانی) کوئی ہاتھ (کہانی) تھار پر زندگی (کہانی) گنجا کی نیتی (کہانی) ڈرے آگے (کہانی) ٹوٹے ہوئے چہرے (شاعری) سنولائی دھوپ (شاعری) شامل ہیں۔ ان کی ایک کتاب تخلیقی تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے جس کا نام ''متن اور مکالمہ'' ہے۔ یہ کتاب ان کی تمام نگارشات میں نہایت اہمیت و معنویت کی حامل ہے۔ اس میں کل 28 مضامین ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ قاسم خورشید کے ارد گرد کسی ازم کا حصار نہیں۔ وہ آزادانہ طور پر اپنے ذوق کی روشنی میں ادبی تجزیے کے مشکل اور دشوار گزار مرحلے سے گزرتے رہتے ہیں۔ ان کو کسی رائج اسکول سے وابستگی عزیز نہیں ہے اس لیے ان کی تنقید میں مختلف رنگ پائے جاتے ہیں ۔ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ان کی تنقید ان کے ذہن و فکر کی خود مختاری کا پتہ دیتی ہے اور زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا

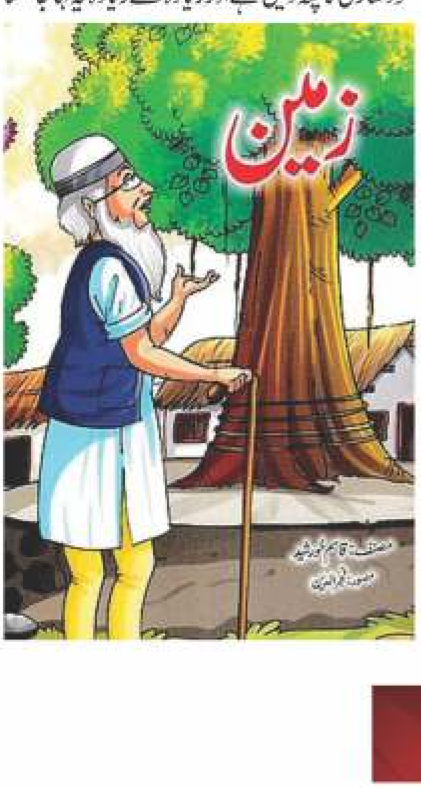

ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ کوئی بھی فن پارہ پڑھنے والوں پر تفہیم کا باب کھول دے۔ وہ شعری یا نثری مجموعے میں عیوب سے زیادہ محاسن تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس عمل میں ان کا ذاتی ذوق اور مطالعہ بھی رہنمائی کرتا ہے۔ ان کی کتاب ''متن و مکالمہ'' کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ان کی تنقیدی بصیرت کا اندازہ ہوگا کہ انھوں نے متن کے پس منظر میں جا کر متن کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ متن کے تجزیہ کا حق بھی اسی وقت ادا ہوسکتا ہے جب نقاد تخلیق کار کے ذہن میں اتر کر اپنا تجزیہ پیش کرے اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ادھر ادھر کی باتیں ہوں گی۔ تجزیہ کا حق ادا نہیں ہوسکے گا۔ ان کی ناقدانہ بصیرت اس اعتبار سے کافی اہمیت کی حامل ہے۔

ان کی محفلوں کی رعنائیاں، ان کے بلند قہقہے، دوستانہ انداز، بے پناہ خلوص، حوصلہ افزائی، محبت بھری شخصیت اور خوش مزاج طبیعت ہمیشہ دلوں میں زندہ رہیں گی۔ ان کی موت نے ادب کی دنیا کو گہرا صدمہ دیا ہے۔ مگر تخلیقات کی صورت میں وہ آج بھی ہم میں موجود ہیں اور اپنی خامہ فرسائی، تخلیقی بصیرت، فکری گہرائی اور بلند خیالی کے ذریعے نسلوں کے دلوں میں زندہ، تابندہ اور پائندہ رہیں گے۔ ان کی یادیں فکری بصیرت، انسانی ہمدردی، اخلاقی عظمت اور اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں ان کی بے لوث خدمت ہمیشہ ادبی دنیا کے افق پر تاباں اور درخشاں رہے گی۔ ان کا قلمی اور تخلیقی سرمایہ قاری کے دلوں کو جھنجھوڑتا اور برانگیختہ کرتا رہے گا اور ان کو یہ احساس و شعور دلاتا رہے گا کہ اصل فنکار وہی ہوتا ہے جو اپنی ذات کے حصار سے نکل کر لوگوں کے دلوں میں اتر جائے اور ان کو اپنا اسیر بنالے۔ اب یہ عظیم فنکار ہمارے درمیان نہیں رہے۔ وہ وہاں پہنچ گئے جہاں ہر ذی روح کو پہنچنا ہے اور وہاں پہنچ جانے کے بعد کسی کو واپس نہیں آنا ہے۔ اللہ رب ذوالجلال ان کے درجات بلند فرمائے اور اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

■

Dr. Md. Tauquir Alam
A/12, "Taj Enclave", Station Road,
Phulwari Sharif, Patna (Bihar)
Pin-801505
Mob.:9934688876
E-mail: proftauqiralam@gmail.com

صابر رضا رہبر

ملک کی تعمیر و ترقی میں اردو صحافت کا کردار

ہندوستان کی سماجی، سیاسی، ثقافتی اور معاشی ترقی میں اردو صحافت کا انقلابی وتاریخی کردار رہا ہے۔ اردو ہندوستان کی ایک اہم زبان ہے۔ یہ زبان اپنی توانا، ادبی اور صحافتی روایت اورفطری لسانی شیرینی کے سبب مختلف طبقات کے درمیان ربط باہم کا موثر ذریعہ سمجھی گئی۔ تحریک آزادی سے لے کر عہد جدید تک اردو صحافت نے عوام کی آواز کو بلند کرنے، سیاسی، سماجی اور تعلیمی شعور کو بیدار کرنے کے ساتھ ساتھ قومی ترقی میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔

برصغیر میں اردو صحافت کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ یہ نہ صرف سماجی اور سیاسی اصلاحات کا اہم ذریعہ رہی ہیں بلکہ اس نے ملک کو آزادی کا پروانہ دلانے میں بھی انقلابی رول ادا کیا ہے۔ سرسید احمد خان کے رسالے تہذیب الاخلاق اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے تعلیمی بیداری اور سماجی اصلاحات کو فروغ دیا۔ تحریک آزادی کے دوران مولوی محمد باقر کے دہلی اردو اخبار، مولانا ابوالکلام آزاد کے رسائل الہلال اور البلاغ اور مولوی ظفر علی خان کا زمیندار کے علاوہ صادق الاخبار، سراج الاخبار، قیصر الاخبار، اودھ اخبار، تاریخ بغاوت ہند، منشور محمدی، اردوئے معلی، خم خانہ ہند، پیسہ اخبار، تیج، پرتاپ، ملاپ، ہندوستان، انقلاب اور قومی آواز جیسے اخبارات نے برطانوی راج کے خلاف عوام کو متحد کیا۔ ان اخبارات نے نہ صرف سیاسی شعور کو اجاگر کیا بلکہ ہندوستانی شناخت اور اتحاد کو بھی مستحکم کیا۔ تحریک آزادی کو مہمیز کرنے میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں، مولوی محمد باقر، مولوی جمیل الدین، منشی نول کشور، ڈاکٹر مکند لال، مولانا حسرت موہانی اور منشی محبوب عالم جیسے صحافیوں کے نام ناقابل فراموش تسلیم کیے جاتے ہیں۔

آزادی کے بعد اردو صحافت نے ہندوستان کی نئی قومی شناخت کی تشکیل میں بھی قدم قدم پر اپنی ذمہ داری کا عملی ثبوت پیش کیا۔ قومی آواز، روزنامہ انقلاب اور ہماری زبان نے ہندوستان کے متنوع معاشرے میں اردو بولنے والے طبقات کی نمائندگی کی اور ان کے مسائل کو پوری بے باکی کے ساتھ اجاگر کیا۔

دراصل صحافت کا کلیدی اور اہم کام ترسیل کے ساتھ رائے عامہ ہموار کرنا ہے اور یہ اتنا اہم اور چیلنجز سے بھرا ہے کہ ذرا سی دیر میں حالات کا نہ صرف رخ موڑا جاسکتا ہے بلکہ سیاسی وسماجی جغرافیہ کا منظرنامہ بھی تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

گلوبلائزیشن کے دور میں صحافت ایک بڑی طاقت میں تبدیل ہوچکی ہے۔ صارفیت نے اس کے بال و پر کو کھلا آسمان عطا کر دیا ہے۔ ایسے میں صحافت کا منفی استعمال بہت نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے جبکہ اس کا مثبت کردار قومی رہنمائی اور رائے عامہ کی تعمیر و تشکیل میں خضر راہ ثابت ہوسکتا ہے کیونکہ اس کا اثر براہ راست قوم پر پڑتا ہے۔ صحافی سماج کا ایک اہم رکن اور صحافت اس کی اہم ضرورت ہے۔ ذرائع ابلاغ کے سہارے ناقابل تسخیر میدان سر کیے جاسکتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کے بقول ''صحافت ایک عظیم مشن ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو تازہ ترین خبروں سے آگاہ کیا جائے۔ عصر حاضر کے واقعات کی تشریح کی جائے اوران کا پس منظر واضح کیا جائے، تاکہ رائے عامہ کی تشکیل کا راستہ صاف ہو۔ صحافت رائے عامہ کی ترجمان اور عکاس ہوتی ہے اور رائے عامہ کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتی ہے، عوام کی خدمت اس کا مقدس فریضہ ہے۔ اس لیے صحافت معاشرے کے ایک اہم ادارے کی حیثیت رکھتی ہے۔''

ترقی یافتہ ملکوں نے ذرائع ابلاغ کا منفی استعمال کر کے کیسے لوگوں کے ذہن ودماغ کو مسخر اور عوام کی سوچ وفکر کا نہ صرف سوتا خشک کر دیا بلکہ انھیں اپنی نگاہوں میں بے وقعت بھی بنادیا۔ اس نے میڈیا کے سہارے ہر چمکتی شے کو سونا سمجھنے کی سوچ کو پروان چڑھانے کی حماقت کی۔ اس کی ایک مثال سید عبدالسلام زبنی کی کتاب اسلامی صحافت سے پیش ہے:

''ترقی پسند ممالک نے پسماندہ اور غریب قوموں کو ذہنی غلامی میں مبتلا کر کے ان کا استحصال کیا اور ان کی تہذیبی اور قومی روایات، نظریہ زندگی اور اقتدار حیات کو خود ان کی اپنی نظر میں بے وقعت بنا کر رکھ دیا اور اس طرح اس خطرناک ہتھیار سے وہ کام لیا جو بڑی سے بڑی فوجی قوت کے استعمال سے بھی ممکن نہ تھا۔''

(اسلامی صحافت، صفحہ:32)

اردو صحافت نے قومی شعور، سیاسی بصیرت، ثقافتی بیداری، تعلیمی اور سماجی اصلاحات میں ناقابل فراموش کردار ادا کیا ہے جس کی ایک جھلک پیش کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

قومی شعور: اردو صحافت نے ہندوستان میں قومی شعور کو بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اخبارات اور رسائل عوام تک معلومات پہنچانے کا ایک اہم ذریعہ رہے ہیں۔ خاص طور پر دیہی علاقوں اور اردو بولنے والی آبادی کے درمیان، جہاں دیگر زبانوں کے میڈیا کی رسائی محدود تھی، اردو صحافت نے پل کا کردار ادا کیا۔ مثال کے طور پر، اردو اخبارات نے تعلیم، صحت، اور خواتین کے حقوق جیسے اہم موضوعات پر مضامین شائع کر کے سماجی بیداری کو فروغ دیا۔ اردو صحافت نے ہندوستان کی کثیر لسانی اور کثیر ثقافتی شناخت کو بھی اجاگر کیا۔ اس نے ہندوستان کے مختلف طبقات، بالخصوص مسلم اقلیت کو قومی دھارے سے جوڑنے میں مدد کی۔ اردو اخبارات نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی، سیکولرزم، اور قومی یکجہتی کے پیغامات کو فروغ دیا، جو ہندوستان جیسے متنوع ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے ناگزیر ہے۔

سیاسی کردار: اردو صحافت نے ہندوستان کی سیاسی ترقی کی سمت متعین کرنے میں ایک رہنما کردار نبھایا ہے۔ اس نے حکومت کی پالیسیوں کے تجزیہ و تنقید اور سیاسی مباحثے کو استحکام بخشنے کے علاوہ دو قدم آگے بڑھ کر عوامی حقوق کی حفاظت کی زمام سنبھالی ہے۔ آزادی کے بعد جب ہندوستان اپنے جمہوری اداروں کو مضبوط کر رہا تھا، اردو اخبارات نے سیاسی جماعتوں اور لیڈروں کی کارکردگی پر نظر رکھی اور بدعنوانیوں کو بے نقاب کیا۔ اردو صحافت نے اقلیتوں کو درپیش مسائل مثلاً تعلیمی پسماندگی، معاشی عدم مساوات، اور سماجی امتیازی سلوک کو اجاگر کر کے ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے آواز بلند کی۔ اس کی مثال حساس مسائل کے دوران اردو صحافت نے معتدل آواز کو فروغ دیا اور فرقہ وارانہ کشیدگی کو کم کرنے کی کوشش کی۔

ثقافتی کردار: اردو صحافت نے ہندوستان کی ثقافتی ترقی میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ اردو زبان اپنی شاعری، ادب، اور بھرپور ثقافتی ورثے کے لیے مشہور ہے۔ اردو اخبارات اور رسائل نے ادبی تحریروں، شاعری، اور ثقافتی تقریبات کو فروغ دیا، جس سے ہندوستان کی مشترکہ

> اردو صحافت نے ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کو بھی اجاگر کیا، جو کہ ہندوستان کی کثیر ثقافتی شناخت کی علامت ہے۔ اس نے مختلف مذاہب اور ثقافتوں کے درمیان ہم آہنگی کو فروغ دینے کے لیے مضامین، کہانیاں، اور رپورٹس شائع کیں۔

ثقافتی شناخت کو تقویت ملی۔ رسائل جیسے کہ شاعر، فنون، اور ساقی نے اردو ادب کو زندہ رکھا اور نئے لکھنے والوں کے لیے پلیٹ فارم فراہم کیا۔

اردو صحافت نے ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کو بھی اجاگر کیا، جو کہ ہندوستان کی کثیر ثقافتی شناخت کی علامت ہے۔ اس نے مختلف مذاہب اور ثقافتوں کے درمیان ہم آہنگی کو فروغ دینے کے لیے مضامین، کہانیاں، اور رپورٹس شائع کیں۔

تعلیمی اور سماجی اصلاحات: اردو صحافت نے ہندوستان میں تعلیمی اور سماجی اصلاحات کو فروغ دینے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ سر سید احمد خان سے لے کر آج تک، اردو صحافت نے تعلیم کی اہمیت پر زور دیا اور پسماندہ طبقات کو تعلیمی مواقع فراہم کرنے کی وکالت کی۔ اردو اخبارات نے خواتین کی تعلیم، صحت کے مسائل، اور سماجی برائیوں جیسے کہ جہیز اور بچوں کی شادی کے خلاف مہم چلائی۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو صحافت کی تاریخ محض خبروں کی ترسیل تک محدود نہیں، بلکہ یہ برصغیر پاک و ہند میں تعلیمی بیداری اور سماجی اصلاحات کی ایک طاقتور تحریک رہی ہے۔ انیسویں صدی کے آغاز سے ہی، جب اردو صحافت نے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا شروع کیا، اس کا بنیادی مقصد معاشرے کی فکری آبیاری اور پسماندہ طبقات کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا تھا۔ اس سلسلے میں 'جام جہاں نما' سے شروع ہونے والا سفر جب دہلی اردو اخبار اور پھر سر سید احمد خان کے 'تہذیب الاخلاق' تک پہنچا تو اردو صحافت ایک باقاعدہ تعلیمی مشن بن گئی۔ سر سید احمد خان نے صحافت کو وہ ہتھیار بنایا جس کے ذریعے مسلمانوں میں جدید علوم کی اہمیت اجاگر کی گئی اور فرسودہ رسومات کے خلاف ایک علمی جنگ لڑی گئی۔ ان کے رسالے نے نہ صرف طرزِ تحریر میں سادگی پیدا کی بلکہ معاشرے کو یہ باور کرایا کہ تعلیم کے بغیر عزتِ نفس اور سیاسی بقا ممکن نہیں ہے۔ سماجی اصلاحات کے میدان میں اردو صحافت کا کردار ایک 'مصلح' کا رہا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے 'الہلال' اور 'البلاغ' نے جہاں سیاسی شعور بیدار کیا، وہاں اخلاقی اور سماجی اصلاح کو بھی دین کا لازمی جزو قرار دیا۔ اسی طرح مولانا ظفر علی خان کے 'زمیندار' نے کسانوں اور مزدوروں کے حقوق کی بات کر کے صحافت کو عوامی مسائل سے جوڑ دیا۔ ان اخبارات نے صرف مسائل کی نشاندہی نہیں کی بلکہ معاشرے کے سامنے ایک ایسا آئینہ رکھا جس میں وہ اپنی کوتاہیاں دیکھ سکیں۔ خواتین کی تعلیم کے حوالے سے 'خاتون' اور 'عصمت' جیسے رسائل نے جو کردار ادا کیا، اس نے مسلم گھرانوں میں تعلیمی انقلاب کی بنیاد رکھی اور خواتین کو سماجی دھارے میں شامل ہونے کا حوصلہ دیا۔ جدید دور میں بھی اردو صحافت اپنی ان روایات کو برقرار رکھنے کی کوشش کر رہی ہے، اگرچہ اب اسے ڈیجیٹل میڈیا اور کمرشیلزم کے چیلنجز کا سامنا ہے۔ آج بھی اردو اخبارات میں تعلیمی صفحات، ادبی گوشے اور سماجی کالموں کے ذریعے نئی نسل کی ذہنی تربیت کا کام جاری ہے۔ اردو صحافت نے ہمیشہ یہ ثابت کیا ہے کہ زبان صرف رابطے کا ذریعہ نہیں بلکہ یہ تہذیب کی محافظ اور سماج کی تعمیرِ نو کا آلہ ہوتی ہے۔ تعلیمی اداروں کا قیام ہو یا سماجی برائیوں کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنا، اردو صحافت نے ہر دور میں ایک ذمہ دار استاد اور ایک نڈر مصلح کا کردار ادا کیا ہے۔ اس تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق اردو صحافت اپنے معیار کو بلند کرے اور ٹیکنالوجی کے دور میں بھی اپنے اصلاحی مقصد کو اوجھل نہ ہونے دے۔

ماحولیاتی تحفظ: ہندوستان اپنی جغرافیائی وسعت اور

حیاتیاتی تنوع (Biodiversity) کے باعث ماحولیاتی تبدیلیوں کے اثرات کے حوالے سے دنیا کے حساس ترین ممالک میں شامل ہے۔ یہاں صحافت محض ایک پیشہ نہیں بلکہ ایک سماجی مشن رہی ہے اس نے ہمالیہ کی چوٹیوں سے لے کر بحیرۂ عرب کے ساحلوں تک ماحولیاتی بقا کی جنگیں لڑی ہیں۔ ہندوستان میں ماحولیاتی صحافت کی جڑیں 1970 اور 1980 کی دہائی کی عوامی تحریکوں میں پیوست ہیں۔ ماحولیاتی تحفظ کے لیے چھیڑی گئی چپکو تحریک کو قومی اور بین الاقوامی سطح پر شناخت دلانے میں ہندوستانی میڈیا کا بڑا ہاتھ تھا۔ صحافیوں نے بتایا کہ کس طرح مقامی خواتین درختوں سے لپٹ کر جنگلات کو بچا رہی ہیں۔ بھوپال گیس سانحہ (1984) کے بعد صحافت نے 'صنعتی حفاظت' اور کارپوریٹ جوابدہی کے تصور کو جنم دیا۔ میڈیا نے سائنسی رپورٹس کے ذریعے ثابت کیا کہ کس طرح غفلت نے ہزاروں جانیں لیں۔ فضائی آلودگی نے شہری زندگی کو جہنم بنادیا ہے۔ دہلی، ممبئی اور کانپور جیسے شہروں میں ایئر کوالٹی انڈیکس (AQI) کو روزانہ کی سرخی بنانا صحافت کا بڑا کارنامہ ہے۔ میڈیا نے اسے محض ایک موسمیاتی تبدیلی نہیں بلکہ 'ہیلتھ ایمرجنسی' کے طور پر پیش کیا، جس کے نتیجے میں حکومت کو برقی گاڑیوں (EVs) کی پالیسی اور پبلک ٹرانسپورٹ میں اصلاحات لانی پڑیں۔

آبی بحران اور دریاؤں کے تحفظ کے لیے بھی اردو صحافت نے صدائے احتجاج بلند کرنے اور عوامی بیداری لانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہندوستان میں گنگا، جمنا اور کاویری جیسے دریاؤں کی حالت زار پر 'انویسٹیگیٹو رپورٹنگ' نے بڑے اثرات مرتب کیے ہیں۔ صحافیوں نے سیوریج ٹریٹمنٹ پلانٹس (STPs) کی ناکامی کو بے نقاب کیا، جس سے 'نمامی گنگے' جیسے میگا پروجیکٹس کی شفافیت بڑھی۔ اتراکھنڈ میں زمین دھنسنے کے واقعات ہوں یا کیرالہ کے سیلاب، صحافت نے 'غیر پائیدار ترقی' (Unplanned Development) کے خطرات کو سائنسی بنیادوں پر اجاگر کیا۔ میڈیا نے واضح کیا کہ پہاڑوں میں ڈیموں کی بھرمار اور ساحلوں پر کنکریٹ کی تعمیرات فطرت کے خلاف جنگ ہے۔

ہندوستان میں نیشنل گرین ٹریبونل (NGT) اور صحافت کے درمیان ایک مضبوط رشتہ ہے۔ اکثر صحافتی رپورٹ کو بنیاد بنا کر پبلک انٹرسٹ لٹیگیشن (PIL) کے توسط سے سپریم کورٹ یا ہائی کورٹ میں مفاد عامہ کی عرضیاں دائر کی جاتی ہیں، جس کے دوررس نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ کئی بار عدالت عظمیٰ نے مفاد عامہ کے تحت دائر کی گئی عرضیوں کی سنجیدگی کے ساتھ سماعت کی اور سخت احکامات صادر کیے ہیں۔ اسی طرح ہندوستانی صحافیوں نے RTI کا بھرپور استعمال کر کے جنگلات کی زمین کی غیر قانونی منتقلی اور صنعتی آلودگی کے چھپے ہوئے اعداد و شمار عوامی سطح پر لائے۔ جدید دور میں صحافت کے ڈھانچے میں تبدیلی آئی ہے۔ اب گرافکس اور سیٹلائٹ تصاویر کے ذریعے جنگلات کی کٹائی اور گلیشیرز کے پگھلنے کو زیادہ موثر انداز میں دکھایا جاتا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ صحافت صرف 'تباہی کی خبریں' نہ دے، بلکہ حل بھی تجویز کرے۔ اردو صحافت روایتی علم (Traditional Wisdo m) جیسے بارش کے پانی کو ذخیرہ کرنے کے پرانے طریقوں کو فروغ دینے کے لیے عوامی بیداری میں مضبوط پیش رفت کرے اور شمسی توانائی اور متبادل ایندھن کے کامیاب ماڈل کو اجاگر کرے۔ علاقائی زبانوں میں سائنسی معلومات فراہم کرنا بھی عصر حاضر کا اہم تقاضا ہے تاکہ کسان اور دیہی آبادی بااختیار بن سکے۔ ہندوستان میں ماحولیاتی تحفظ کے لیے صحافت ایک 'اخلاقی قطب نما' کی حیثیت رکھتی ہے اور اس میں اردو صحافت بھی پیچھے نہیں ہے۔ اگرچہ چیلنجز بڑے ہیں، لیکن ہندوستانی صحافیوں کی جرأت اور ٹیکنالوجی کے امتزاج نے ماحولیات کو ملک کے سیاسی اور سماجی ایجنڈے کا لازمی حصہ بنادیا ہے۔ اب یہ جدوجہد محض کاغذ تک محدود نہیں بلکہ زمین پر تبدیلی کا پیش خیمہ ہے۔

چیلنجز اور جدید دور: آج کے ڈیجیٹل دور میں، اردو صحافت کو کئی چیلنجز کا سامنا ہے۔ پرنٹ میڈیا کی مقبولیت میں کمی، مالی مسائل، اور ڈیجیٹل میڈیا کی بہتات سے اردو اخبارات کے لیے نئی مشکلات پیدا ہوگئی ہیں۔ تاہم، بہت سے اردو اخبارات اور پورٹل مثلاً انقلاب، سیاست، اور اردو نیوز نے ڈیجیٹل پلیٹ فارمز پر اپنی موجودگی کو مضبوط کیا ہے۔ سوشل میڈیا نے اردو صحافت کو نئی زندگی دی ہے، جس سے یہ زیادہ وسیع پیمانے پر پھیل رہی ہے لیکن وہیں دوسری طرف جھوٹی خبروں، پروپیگنڈے، اور سنسنی خیزی کے رجحانات نے اردو صحافت کے معیار پر سوالات اٹھانے شروع کردیے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی بہت سے اردو صحافی اور ادارے معیاری صحافت کے اصولوں پر قائم ہیں اور سماجی بہتری کے لیے کام کر رہے ہیں۔

اردو صحافت ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں ایک اہم ستون کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نے نہ صرف سیاسی اور سماجی شعور کو بیدار کیا بلکہ ثقافتی ورثے کو محفوظ رکھنے اور تعلیمی اصلاحات کو فروغ دینے میں بھی اپنا غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔ اگرچہ جدید دور میں چیلنجز موجود ہیں لیکن اردو صحافت کی اہمیت ناقابل انکار ہے۔ اگر اردو صحافت اپنے معیار کو برقرار رکھتے ہوئے ڈیجیٹل دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوجائے، تو یہ ہندوستان کی ترقی میں اپنا کردار مزید موثر طریقے سے ادا کرسکتی ہے۔

■

> اردو صحافت ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں ایک اہم ستون کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نے نہ صرف سیاسی اور سماجی شعور کو بیدار کیا بلکہ ثقافتی ورثے کو محفوظ رکھنے اور تعلیمی اصلاحات کو فروغ دینے میں بھی اپنا غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔ اگرچہ جدید دور میں چیلنجز موجود ہیں لیکن اردو صحافت کی اہمیت ناقابل انکار ہے۔ اگر اردو صحافت اپنے معیار کو برقرار رکھتے ہوئے ڈیجیٹل دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوجائے، تو یہ ہندوستان کی ترقی میں اپنا کردار مزید موثر طریقے سے ادا کرسکتی ہے۔

Dr. Sabir Raza Rahbar
Assistant Professor BNMV Sahugadh
Madhepura-852113
Mob.: 8804542020
E-mail: sabirrahbar10@gmail.com

محمد کیف حبیب اللہ

ہندوستان میں اردو صحافت

عہد رفتہ سے ڈیجیٹل انقلاب تک

اردو صحافت محض خبر رسانی کا ذریعہ نہیں بلکہ برصغیر کی تہذیبی اور سیاسی تاریخ کا ایک متحرک باب ہے۔ اس نے نہ صرف سماج کی اصلاح کی بلکہ جمہوریت کے استحکام میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ ابلاغ عامہ کے مختلف ذرائع، اخبارات، رسائل، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اب ڈیجیٹل میڈیا، نے اردو صحافت کو ہر دور میں نئے امکانات اور نئے چیلنجز فراہم کیے ہیں۔ بدلتے ہوئے عہد میں اردو صحافت آج ایک ایسے موڑ پر کھڑی ہے جہاں ایک طرف طباعتی صحافت کے زوال کا سامنا ہے تو دوسری طرف ڈیجیٹل میڈیا کے ذریعے عالمی سطح پر اپنی رسائی بڑھانے کے بے شمار مواقع موجود ہیں۔

ہندوستان میں اردو صحافت کا باقاعدہ آغاز 1822 میں کلکتہ سے شائع ہونے والے پہلے اردو اخبار ''جام جہاں نما'' سے ہوا۔ یہ اخبار دراصل فارسی زبان میں شائع ہوتا تھا، بعد میں اس کا اردو ایڈیشن جاری کیا گیا، جس نے اردو صحافت کی بنیاد رکھی۔ انیسویں صدی میں جب طباعت کی صنعت نے ترقی کی تو اردو صحافت نے بھی تیزی سے فروغ پایا۔ اس دور میں اخبارات محض خبریں فراہم کرنے کا ذریعہ نہیں تھے بلکہ یہ عوامی شعور کی تربیت، سماجی اصلاح اور سیاسی آگہی کے اہم مراکز بن گئے۔

انیسویں صدی کے وسط، خصوصاً 1850 کی دہائی سے لے کر 1947 تک اردو صحافت کا سنہری دور کہا جا سکتا ہے۔ اس عرصے میں اردو اخبارات نے برطانوی سامراج کے خلاف عوامی رائے ہموار کی، سیاسی شعور کو بیدار کیا اور آزادی کی جدوجہد کو فکری بنیاد فراہم کی۔ اردو صحافت نے زبان وادب کے ساتھ ساتھ سیاست، معاشرت اور تعلیم کے میدان میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔

1857 کی جنگِ آزادی اردو صحافت کی تاریخ کا ایک اہم سنگِ میل ہے۔ اس دور میں اردو اخبارات نے ہندوستانیوں کو انگریز حکومت کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنے میں مؤثر کردار ادا کیا۔ ''صدق الاخبار''، ''دہلی اردو اخبار''، ''ہندوستان''، ''سراج الاخبار'' اور دیگر اخبارات نے حق گوئی، جرات مندی اور قومی حمیت کا مظاہرہ کیا۔ ان اخبارات نے نہ صرف عوام کو ظلم وجبر کے خلاف آواز اٹھانے کی ترغیب دی بلکہ قومی تشخص اور آزادی کے تصور کو بھی مضبوط کیا۔

جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد جب پورے ملک میں مایوسی اور خوف کی فضا قائم تھی، اردو صحافت نے مضامین، اداریوں اور شاعری کے ذریعے عوام کے حوصلے بلند کیے۔ اس دور میں اردو اخبارات نے شکست خوردہ قوم کو نئی امید، تازگی اور فکری استقامت عطا کی۔

اردو صحافت کی تاریخ میں سرسید احمد خان کا نام نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے جاری کردہ رسالے ''تہذیب الاخلاق'' نے اصلاحِ معاشرہ کی ایک مضبوط بنیاد رکھی۔ اس رسالے کا مقصد مسلمانوں میں جدید تعلیم، سائنسی سوچ اور سماجی اصلاح کا شعور پیدا کرنا تھا۔ تہذیب الاخلاق نے مذہب، سیاست، سماج اور ادب پر گہرے اثرات مرتب کیے اور اردو صحافت کو ایک فکری اور اصلاحی سمت عطا کی۔

انیسویں اور بیسویں صدی کے اوائل میں اردو صحافت پورے برصغیر میں پھیل چکی تھی۔ شمالی ہندوستان، دکن، بنگال اور پنجاب میں اردو اخبارات بڑی تعداد میں شائع ہو رہے تھے۔ اس دور کے معروف اخبارات میں ''زمیندار''، ''ہمدرد''، ''الہلال''، ''البلاغ'' اور دیگر شامل ہیں۔ ان اخبارات نے نہ صرف سیاسی بیداری پیدا کی بلکہ اردو زبان وادب کے فروغ میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

1947 کی تقسیمِ ہند اردو صحافت کے لیے ایک شدید دھچکا ثابت ہوئی۔ تقسیم کے وقت ہندوستان میں تقریباً 415 اردو اخبارات شائع ہو رہے تھے، جن میں روزنامے، ہفت روزہ، پندرہ روزہ اور ماہنامے شامل تھے۔ تقسیم کے بعد 70 اخبارات کے مالکان پاکستان منتقل ہو گئے، جس کے نتیجے میں ہندوستان میں اردو اخبارات کی تعداد گھٹ کر 345 رہ گئی۔

آزادی کے بعد ہندوستان نے ایک سیکولر ریاست کے طور پر خود کو منظم کیا اور اردو صحافت نے بھی نئے سیاسی وسماجی حالات میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کی۔ اس دور میں ''پرتاب''، ''ملاپ''، ''ہند سماچار''، ''آزاد ہند'' اور ''آزاد'' جیسے اخبارات سامنے آئے، جنھوں نے اردو صحافت کے وقار کو برقرار رکھا اور اسے نئی شناخت دی۔

آزادی کے بعد اردو صحافت نے شدید سیاسی، سماجی اور لسانی چیلنجوں کے باوجود اپنی بقا کی جدوجہد جاری رکھی۔ تقسیم ہند کے بعد اردو زبان کو سرکاری سرپرستی

کم ملنے لگی، مگر اس کے باوجود ملک کے مختلف شہروں۔ خصوصاً دہلی، لکھنؤ، پٹنہ، ممبئی اور حیدرآباد۔ سے اردو اخبارات اور رسائل کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہا۔

ابتدائی برسوں میں اردو اخبارات کی تعداد اور اثر پذیری کم ہوئی اور وہ ملکی اخبارات کی فہرست میں چوتھے نمبر پر چلے گئے، مگر جلد ہی قارئین کی دلچسپی اور ادبی وابستگی کی وجہ سے تیسرے مقام تک پہنچ گئے۔ اسی دوران ادبی صحافت نے بھی تیزی سے ترقی کی اور 1960 سے 2000 تک درجنوں اہم ادبی رسائل منظر عام پر آئے جنھوں نے اردو زبان وادب کی روایت کو زندہ رکھا۔

اپریل 1956 میں جمنا داس اختر نے ہفت روزہ ''سویرا'' جاری کیا، جو بعد میں روزنامہ کی صورت اختیار کرگیا۔ اس اخبار نے سماجی اور ادبی موضوعات کو جگہ دے کر سنجیدہ قاری کا ایک طبقہ پیدا کیا۔ اس دور میں اردو صحافت نے بتدریج خود کو مستحکم کیا۔ اگرچہ وسائل محدود تھے، مگر لکھنؤ، دہلی اور پٹنہ سے کئی اخبارات نکلے۔ ادبی رسائل کی اشاعت میں بھی اضافہ ہوا، جنھوں نے ترقی پسند فکر، جدید نظم ونثر اور تنقیدی رجحانات کو فروغ دیا۔

سلامت علی مہندی کی ادارت میں نکلنے والے ہفتہ وار ''بنیاد'' اور ہفتہ وار ''عوام'' نے دہلی میں سنسنی خیز صحافت کی طرح ڈالی اور اسکی پیروی ہفت روزہ ''نئی دنیا'' نے کی، جسکا آغاز 1973 میں ہوا تھا۔ عبدالوحید صدیقی اسکے بانی ایڈیٹر تھے۔ سال 1978 میں ہی نئی دہلی سے جاوید حبیب کی ادارت میں شایع ہونے والا ہفتہ وار ''ہجوم'' نے اپنا ایک منفرد مقام بنایا۔ لیکن اسکی اشاعت بھی چند برسوں تک ہی جاری رہی۔ اگر یہ اخبار رہتا تو دہلی میں ہفتہ واری صحافت کا مزاج اور انداز طے کرتا۔

سنہ 1980 میں دہلی سے عشرت علی صدیقی کی ادارت میں روزنامہ ''قومی آواز'' کی اشاعت شروع ہوئی۔ یہ اخبار دراصل اس صحافتی روایت کا تسلسل تھا جس کی بنیاد پنڈت جواہر لال نہرو نے 1945 میں لکھنؤ سے نیشنل ہیرالڈ (انگریزی)، نوجوان (ہندی) اور قومی آواز (اردو) کی صورت میں رکھی تھی۔ دہلی ایڈیشن نے اردو صحافت میں سیاسی سنجیدگی اور قومی بیانیے کو مضبوط کیا۔

سنہ 1985 میں دہلی سے روزنامہ ''فیصل جدید'' جاری ہوا۔ یہ اخبار زیادہ تر جذباتی اور سنسنی خیز انداز تحریر کی وجہ سے سنجیدہ صحافتی معیار قائم نہ رکھ سکا، مگر ایک عرصے تک قارئین کی توجہ حاصل کرتا رہا۔ خاص طور پر اس وقت جب قومی آواز کی اشاعت متاثر ہوئی۔ ممبئی کے مقبول عام اردو روزنامہ ''انقلاب'' نے 1986 میں دہلی ایڈیشن نکالا، مگر یہ تجربہ زیادہ عرصہ کامیاب نہ رہ سکا اور چند ماہ بعد بند ہوگیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دہلی کی اردو صحافت میں مقابلہ سخت تھا اور مالی استحکام ایک بڑا مسئلہ تھا۔

جون 1992 اردو صحافت میں ایک اہم سنگ میل ثابت ہوا جب یونائیٹڈ نیوز آف انڈیا (UNI) نے اردو کی پہلی ٹیلی پرنٹر نیوز سروس شروع کی۔ اس اقدام سے پورے ملک کے اردو اخبارات کو خبروں کے ترجمے کے بھاری بوجھ سے نجات ملی اور قومی و بین الاقوامی خبروں تک فوری رسائی ممکن ہوئی۔ یہ پیش رفت اردو صحافت کی پیشہ ورانہ ترقی میں نہایت اہم تھی۔

1999 میں نئی دہلی سے سہارا انڈیا گروپ نے اردو روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' جاری کیا (جو اس سے قبل ہفت روزہ تھا)۔ یہ اخبار اپنی رنگین اور معیاری طباعت کی وجہ سے جلد مقبول ہوا۔ اگرچہ سنجیدہ قارئین نے اداریہ اور زبان کے معیار پر تنقید بھی کی، لیکن جدید طباعتی انداز اور بڑے میڈیا ہاؤس کی پشت پناہی نے اسے اردو صحافت میں ایک نمایاں مقام دلایا۔ 21ویں صدی میں ٹیکنالوجی نے اسے نئے امکانات دیے، مگر بقا کی جدوجہد اب بھی جاری ہے۔ آج کی اردو صحافت روایت اور جدت کے سنگم پر کھڑی ہے اردو اخبارات نے آزادی کے بعد بھی سماجی مسائل، اقلیتی حقوق، جمہوری اقدار اور قومی یکجہتی کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ تاہم وسائل کی کمی اور بدلتے ہوئے میڈیا منظرنامے نے اردو صحافت کو مسلسل چیلنجز سے دوچار رکھا۔

ابلاغ عامہ کسی بھی معاشرے میں معلومات، خیالات اور نظریات کی ترسیل کا بنیادی ذریعہ ہوتا ہے۔ اردو صحافت نے ابلاغ عامہ کے ایک طاقت ور وسیلے کے طور پر عوامی رائے سازی میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ اخبارات اور رسائل کے ذریعے اردو صحافت نے نہ صرف معلومات فراہم کیں بلکہ عوام کی فکری اور ذہنی تربیت بھی کی۔

اکیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی اردو صحافت کو شدید چیلنجز کا سامنا کرنا پڑا۔ اردو اخبارات کی اشاعت میں بتدریج کمی واقع ہوئی، حتیٰ کہ ان ریاستوں میں بھی جہاں اردو صحافت کبھی مضبوط تھی۔ نئی نسل کی دلچسپی طباعتی صحافت سے کم ہوتی جارہی ہے اور لوگ تیزی سے ڈیجیٹل میڈیا کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ڈیجیٹل میڈیا اردو صحافت کا مستقبل ہے۔ انٹرنیٹ، اسمارٹ فون اور سوشل میڈیا نے اردو صحافت کو عالمی سطح پر پہنچنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ آن لائن اخبارات، ای۔ پیپر، نیوز پورٹلز، یوٹیوب چینلز اور سوشل میڈیا پلیٹ فارمز نے اردو صحافت کو نئی زندگی بخشی ہے۔

روزنامہ ''سیاست'' نے 30 اکتوبر 2004 کو اپنا ای۔ پیپر لانچ کر کے اردو صحافت میں ڈیجیٹل دور کا آغاز کیا۔ اس کے بعد انقلاب، ہندسماچار، کشمیر عظمیٰ اور دیگر اخبارات بھی ڈیجیٹل پلیٹ فارمز پر فعال ہوگئے۔

آج اردو صحافت صرف اخبارات تک محدود نہیں رہی بلکہ بی بی سی اردو، نیوز18 اردو، ڈی ڈی اردو اور متعدد یوٹیوب چینلز کے ذریعے عالمی سطح پر اپنی موجودگی درج کرا رہی ہے۔ یہ پلیٹ فارمز ویڈیو، آڈیو اور تحریری مواد کے ذریعے اردو زبان کو نئی نسل سے جوڑ رہے ہیں اور ابلاغ عامہ کے نئے امکانات پیدا کر رہے ہیں۔

صحافت محض ایک نظریاتی خدمت نہیں بلکہ ایک باقاعدہ صنعت بھی ہے۔ اس کے تین بنیادی ستون ہیں: انتظامیہ، اشاعت اور تجارت۔ طباعتی اخبارات کا سب سے بڑا ذریعہ آمدنی اشتہارات ہوتے ہیں، مگر موجودہ دور میں پرنٹ اشتہارات کی افادیت کم ہو چکی ہے۔ اس کے برعکس ڈیجیٹل پلیٹ فارمز پر اشتہارات اور سبسکرپشن ماڈل زیادہ مؤثر ثابت ہو رہے ہیں۔

اردو صحافت کے زوال کی کئی وجوہات ہیں، جن میں تقسیم ہند کے بعد اردو کو ایک مخصوص برادری سے جوڑ دینا، اردو تعلیم کی کمزوری، مالی وسائل کی کمی، حکومتی عدم توجہی، پیشہ ورانہ تربیت کے اداروں کا فقدان اور معیار مواد میں کمی شامل ہیں۔

ان تمام مشکلات کے باوجود اردو صحافت کا مستقبل مکمل طور پر تاریک نہیں۔ ڈیجیٹل میڈیا، سوشل نیٹ ورکنگ، پوڈکاسٹ، ویب جرنلزم اور موبائل ایپلی کیشنز اردو صحافت کے لیے نئے دروازے کھول رہی ہیں۔ اگر اردو صحافت جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہو جائے، تربیت یافتہ صحافی تیار کیے جائیں اور معیاری

مواد پر توجہ دی جائے تو اردو صحافت ایک بار پھر اپنے وقار کو بحال کرسکتی ہے۔

ابلاغ عامہ کسی بھی معاشرے کی فکری تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ یہ محض اطلاعات کی ترسیل کا ذریعہ نہیں بلکہ اقدار، نظریات اور سماجی رویوں کی تشکیل کا مؤثر نظام ہے۔ ہندوستان جیسے کثیر لسانی اور کثیر تہذیبی معاشرے میں ابلاغ عامہ کی ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اردو صحافت نے اس تناظر میں ہمیشہ ایک پل کا کردار ادا کیا ہے، جو مختلف تہذیبوں، مذاہب اور سماجی طبقات کو باہم جوڑتا رہا ہے۔ اردو کی نرم اور شیریں زبان نے اختلافات کو کم کرنے، ہم آہنگی پیدا کرنے اور قومی یکجہتی کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

اردو صحافت کا امتیاز یہ رہا ہے کہ اس نے خبر کے ساتھ ساتھ فکر کو بھی جگہ دی۔ اداریے، کالم، فیچر اور ادبی مضامین اردو اخبارات کا لازمی حصہ رہے ہیں، جن کے ذریعے قارئین کی ذہنی تربیت کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو صحافت محض اطلاعاتی صحافت نہیں بلکہ فکری صحافت کی روایت کی امین رہی ہے۔

زبان کسی بھی قوم کی تہذیبی شناخت کی بنیاد ہوتی ہے۔ اردو زبان نے ہندوستان میں مختلف تہذیبی عناصر کو سمو کر ایک مشترکہ تہذیب کو جنم دیا۔ اردو صحافت نے اس تہذیبی ورثے کو محفوظ رکھنے اور آگے بڑھانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اردو اخبارات میں شائع ہونے والے ادبی صفحات، افسانے، نظمیں اور تنقیدی مضامین نے اردو ادب کو عوامی سطح پر مقبول بنایا۔

اردو صحافت نے زبان کو محض خواص تک محدود نہیں رہنے دیا بلکہ عوامی سطح پر اسے زندہ اور متحرک رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو زبان آج بھی اپنے تمام تر مسائل کے باوجود زندہ ہے اور نئے ذرائع ابلاغ کے ذریعے نئی نسل تک پہنچ رہی ہے۔

جمہوریت کی بقا کے لیے آزاد، ذمہ دار اور باخبر صحافت ناگزیر ہے۔ اردو صحافت نے ہندوستان میں جمہوری اقدار کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ آزادی سے قبل اردو اخبارات نے استعماری نظام کے خلاف عوامی رائے ہموار کی، جبکہ آزادی کے بعد جمہوری اداروں، آئین، شہری حقوق اور سماجی انصاف کے موضوعات پر مسلسل آواز اٹھائی۔

اردو صحافت نے ہمیشہ اقتدار کے ایوانوں سے سوال پوچھنے کی روایت کو زندہ رکھا۔ اگرچہ اس راستے میں اسے بندشوں، سنسرشپ اور معاشی دباؤ کا سامنا بھی کرنا پڑا، لیکن اس کے باوجود اردو صحافت نے اپنی حق گوئی اور جرات کو برقرار رکھا۔

تعلیم کسی بھی معاشرے کی ترقی کی بنیاد ہوتی ہے۔ اردو صحافت نے تعلیمی شعور کی بیداری میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ اخبارات اور رسائل کے ذریعے تعلیم کی اہمیت، تعلیمی اصلاحات، نصابی مسائل اور نئی تعلیمی پالیسیوں پر بحث کی گئی۔ خاص طور پر مسلمانوں میں جدید تعلیم کے فروغ میں اردو صحافت کا کردار ناقابلِ فراموش ہے۔

سرسید احمد خان کی اصلاحی تحریک ہو یا بعد کے تعلیمی مباحث، اردو صحافت ہمیشہ تعلیم اور ترقی کے درمیان تعلق کو واضح کرتی رہی ہے۔ آج بھی ڈیجیٹل اردو پلیٹ فارمز تعلیمی مواد، لیکچرز اور معلوماتی پروگراموں کے ذریعے تعلیمی شعور کو فروغ دے رہے ہیں۔

اردو صحافت میں خواتین کا کردار بھی اہم رہا ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں خواتین کے لیے مخصوص اردو رسائل منظرِ عام پر آئے، جنھوں نے خواتین کے حقوق، تعلیم اور سماجی مسائل کو اجاگر کیا۔ ان رسائل نے خواتین کو اظہار رائے کا پلیٹ فارم فراہم کیا اور انھیں سماجی دھارے میں شامل ہونے کا موقع دیا۔

آج کے ڈیجیٹل دور میں خواتین صحافی اور بلاگرز اردو صحافت کو نئے موضوعات اور نئے زاویے عطا کر رہی ہیں، جس سے اردو میڈیا کا دائرہ مزید وسیع ہو رہا ہے۔

اردو صحافت اور سیاست کا تعلق ہمیشہ گہرا رہا ہے۔ اردو اخبارات نے سیاسی شعور کی آبیاری کے ساتھ ساتھ سماجی مسائل جیسے غربت، بے روزگاری، فرقہ واریت اور عدم مساوات کو بھی اجاگر کیا۔ اردو صحافت نے عوام اور حکومت کے درمیان ایک رابطے کا کردار ادا کیا اور سماج کی آواز اقتدار تک پہنچائی۔

ڈیجیٹل میڈیا کے فروغ کے ساتھ ڈیجیٹل خواندگی ایک اہم مسئلہ بن چکی ہے۔ اردو صحافت کے لیے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف ڈیجیٹل پلیٹ فارمز پر موجود ہو بلکہ قارئین کو ڈیجیٹل ذرائع کے استعمال کی تربیت بھی فراہم کرے۔ آسان زبان، سادہ انٹرفیس اور معیاری مواد اردو ڈیجیٹل صحافت کی کامیابی کی ضمانت ہیں۔

عالمی سطح پر اردو صحافت کی رسائی پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ چکی ہے۔ خلیجی ممالک، یورپ، امریکہ اور آسٹریلیا میں مقیم اردو داں طبقہ نہ صرف اپنی زبان و ثقافت سے جڑا ہوا ہے بلکہ اردو اخبارات، رسائل، ویب پورٹلز، یوٹیوب چینلز اور سوشل میڈیا پلیٹ فارمز کے ذریعے عالمی حالات و مسائل سے بھی باخبر رہتا ہے۔ ہجرت اور عالمگیریت کے اس دور میں اردو صحافت نے سرحدوں سے ماورا ہو کر ایک مشترکہ فکری اور تہذیبی رابطے کا کردار ادا کیا ہے۔

ڈیجیٹل میڈیا کی ترقی نے اردو صحافت کو عالمی سطح پر نئی توانائی بخشی ہے۔ آن لائن اخبارات، ای پیپرز، پوڈ کاسٹس اور سوشل میڈیا نے اردو صحافت کو وقت اور مقام کی قید سے آزاد کر دیا ہے۔ اب ایک خبر یا تجزیہ بیک وقت ہندوستان، پاکستان، مشرقِ وسطیٰ، یورپ اور امریکہ میں پڑھے اور سنے جا سکتے ہیں۔ اس عالمگیری رسائی نے اردو صحافت کو بین الاقوامی مکالمے کا مؤثر ذریعہ بنا دیا ہے۔

عالمی تناظر میں اردو صحافت کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ یہ بیرونِ ملک مقیم اردو داں افراد کے مسائل، شناخت اور ثقافتی تشخص کو اجاگر کرتی ہے۔ مہاجرین کے سماجی، تعلیمی اور معاشی مسائل، اسلاموفوبیا، اقلیتی حقوق، بین الثقافتی ہم آہنگی اور عالمی امن جیسے موضوعات اردو صحافت میں نمایاں طور پر زیرِ بحث آتے ہیں۔ اس طرح اردو صحافت نہ صرف خبر رسانی کا فریضہ انجام دیتی ہے بلکہ عالمی سطح پر امن، رواداری اور باہمی احترام کے فروغ میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔

مزید برآں، عالمی اردو صحافت نے مختلف ممالک کے صحافیوں، ادیبوں اور دانشوروں کو ایک دوسرے سے جوڑنے میں بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ بین الاقوامی کانفرنسیں، آن لائن مذاکرے اور مشترکہ صحافتی منصوبے اردو صحافت کو ایک عالمی فکری تحریک کی صورت دے رہے ہیں۔ یوں اردو صحافت عالمی منظرنامے میں اپنی شناخت مستحکم کرتے ہوئے ایک ذمہ دار، باخبر اور امن پسند میڈیا کے طور پر ابھر رہی ہے۔

■

Md. Kaif Habibullah
B-57, 1st Floor Back side, Toker No.7, Shaheen Bagh, Okhla, New Delhi -110025
Mob. 9871184132
Email: advent.kaif@gmail.com

شہپر شریف

شریف احمد قریشی کی فرہنگ نویسی

زبان، ادب اور ثقافت کی زندہ میراث

ادب کی دنیا میں ایسے افراد بہت کم ہوتے ہیں جو اپنی تمام علمی وفکری صلاحیتیں محض اپنی زبان، معاشرے اور اپنی تہذیب کے تحفظ وفروغ کے لیے وقف کر دیں۔ اردو زبان کی تاریخ میں ڈاکٹر شریف احمد قریشی کا شمار انھی نادر وکمیاب شخصیات میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی زندگی کا قیمتی سرمایہ اس زبان کی خدمت میں صرف کر دیا۔ وہ نہ صرف ایک جید محقق، عالمانہ بصیرت رکھنے والے لسانیات داں، اور صاحب ذوق استاد تھے بلکہ اردو تہذیب وثقافت کے ایک ایسے پاسبان بھی تھے جنھوں نے زبان کے عام و خاص پہلوؤں کو اپنی تحقیق کی روشنی میں زندہ جاوید بنا دیا۔ ڈاکٹر شریف احمد قریشی کا علمی سفر اس وقت شروع ہوا جب اردو تحقیق میں شعری رجحانات کو فوقیت حاصل تھی اور نثری ادب کے دقیق پہلو نسبتاً نظر انداز کیے جا رہے تھے۔ انھوں نے اس عمومی دھارے سے الگ ہو کر فرہنگ نویسی جیسے محنت طلب، مگر بے حد ضروری میدان کا انتخاب کیا۔ وہ میدان جہاں تحقیق کے ساتھ زبان، محاورے، کہاوت اور عوامی فکر کی تہذیبی گہرائیوں کا بھی مطالعہ درکار ہوتا ہے۔ انھوں نے نہ صرف اس راستے کو چنا بلکہ اپنی شبانہ روز محنت سے اس میں وہ چراغ روشن کیے جنھوں نے اردو لغت نگاری کو ایک نئی جہت عطا کی۔ فرہنگ نویسی بظاہر محض الفاظ کے معنی و مفاہیم کا تعین ہے مگر دراصل یہ زبان کی روح تک رسائی کا فن ہے اور ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے اسے صرف فن نہیں، ایک علمی مشن کے طور پر نبھایا۔ ان کی تحریروں میں علم کا وقار، زبان کی سادگی اور فکر کی گہرائی ایک ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ انھوں نے کہاوتوں، محاورات اور عوامی اظہار کی چھوٹی چھوٹی اکائیوں کو ایک بڑے ثقافتی و ادبی سیاق میں رکھ کر ان کی معنوی پرتیں

> فرہنگ نویسی بظاہر محض الفاظ کے معنی ومفاہیم کا تعین ہے مگر دراصل یہ زبان کی روح تک رسائی کا فن ہے اور ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے اسے صرف فن نہیں، ایک علمی مشن کے طور پر نبھایا۔

وا کیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابیں جیسے ''کہاوتیں اور ان کا حکایتی و تلمیحی پس منظر''، ''کہاوت کتھا کوش''، ''کہاوت اور حکایت''، ''اردو کہاوتیں'' وغیرہ صرف فرہنگیں نہیں بلکہ اردو تہذیبی تاریخ کے معتبر دستاویزات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر شریف احمد قریشی کا کارنامہ اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ انھوں نے اپنی تحقیقی سرگرمیوں کو محض کتب خانوں یا علمی نشستوں تک محدود نہیں رکھا بلکہ زبان کے عوامی مزاج کو براہ راست اپنی تحقیق میں شامل کیا۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ کہاوت یا محاورہ محض الفاظ کا کھیل نہیں بلکہ قوم کے اجتماعی شعور، اس کی نفسیات اور اس کی دانش عامہ کی عکاسی کرتا ہے۔ انھوں نے اردو فرہنگ نویسی کو بین اللسانی رخ دیتے ہوئے ہندی رسم الخط میں بھی کام کیا تاکہ دونوں زبانوں کے لسانی اور تہذیبی تقارب کو نئی معنویت دی جا سکے۔ یہی علمی وسعت اور فکری تنوع انھیں محض ایک محقق نہیں بلکہ لسانی مورخ کے درجے پر فائز کرتا ہے۔

اردو زبان کی وسعت، رنگا رنگی اور تہذیبی تنوع میں اگر کوئی وصف سب سے نمایاں ہے تو وہ اس کے الفاظ کا وہ سرمایہ ہے جو صدیوں سے مختلف زبانوں اور بولیوں کے امتزاج سے تشکیل پایا ہے۔ اس ذخیرے کو علمی بنیادوں پر محفوظ کرنے اور اس کے تہذیبی پس منظر کو سمجھنے کا کارنامہ جن اہل علم نے انجام دیا ان میں ڈاکٹر شریف احمد قریشی کا نام نہایت وقعت رکھتا ہے۔

اردو دنیا میں ڈاکٹر شریف احمد قریشی کا نام نہایت احترام، وقار اور علمی عظمت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ وہ ایک ایسے محقق، مدون، لغت نگار اور استاد کامل ہیں جنھوں نے اپنی علمی بصیرت، تحقیقی جستجو اور لسانی شعور کے

ذریعے اردو ادب میں ایک منفرد اور نمایاں مقام حاصل کیا۔ اردو ادب کے اس روشن ستارے کی پیدائش 15 جولائی 1953 بروز بدھ مطابق 4 ذی القعدہ 1372ھ کو قصبہ گھاٹم پور، ضلع کان پور میں ہوئی۔ آغاز ہی سے ان میں علم و ادب کا شوق اور زبان کی لطافتوں کو سمجھنے کا سلیقہ نمایاں تھا۔ یہ ذوق علم انھیں تدریجاً تدریس اور تحقیق کے میدان تک لے آیا۔ ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے اپنی تدریسی خدمات گورنمنٹ رضا پوسٹ گریجویٹ کالج، رام پور کے شعبہ اردو میں انجام دیں اور طویل عرصہ تک وہاں ایسوسی ایٹ پروفیسر کے طور پر علمی فرائض سرانجام دیتے رہے۔ اپنے اخلاص، علمی دیانت اور تعلیمی محنت کے باعث وہ اپنے رفقا اور طلبا دونوں میں یکساں طور پر محبوب و محترم رہے۔ اسی ادارے سے وہ باعزت طور پر سبکدوش ہوئے۔ ڈاکٹر شریف احمد قریشی صاحب کا علمی سرمایہ نہایت وسیع ہے۔ اب تک ان کی تین درجن سے زیادہ کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں تحقیق، تنقید، لغت نگاری، تذکرہ نگاری اور ادبی تجزیے جیسے متنوع موضوعات شامل ہیں۔ خصوصاً فرہنگ نویسی کے میدان میں ان کے کارنامے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے کہاوتوں، محاوروں، تلمیحات اور ضرب الامثال پر مبنی ایسی فرہنگیں مرتب کی ہیں جو ان کی لسانی مہارت، محققانہ نگاہ اور تخلیقی بصیرت کی عکاس ہیں۔ ڈاکٹر شریف احمد قریشی کا شمار ان اہل قلم میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو لغت نویسی کو محض الفاظ کے مجموعے کی حد تک نہیں رکھا بلکہ اسے تہذیبی، ثقافتی اور فکری حوالوں سے ایک زندہ اور فعال علم کے طور پر متعارف کرایا۔ ان کی تصانیف نہ صرف محققین کے لیے ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں بلکہ زبان و ادب کے ہر طالب علم کے لیے ایک علمی رہنما کی مانند ہیں۔ تحقیقی بصیرت، لسانی شعور اور علمی جستجو کے باعث ان کا نام نہایت احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ انھوں نے فرہنگ سازی کے میدان میں نمایاں اور وقیع کارنامے انجام دیے ہیں۔ انھوں نے اردو فرہنگ نویسی کو محض لغت نویسی کی سطح سے بلند کر کے لسانی و تہذیبی تحقیق کی منزل عطا کی۔ ان کی تین نادر تصانیف ''فرہنگ روح نظیر''، ''فرہنگ نظیر'' اور ''تلمیحات نظیر اکبر آ کبر آبادی'' نہ صرف نظیر اکبر آبادی کی شاعری کو سمجھنے کی کنجی ہیں بلکہ اردو لسانیات کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

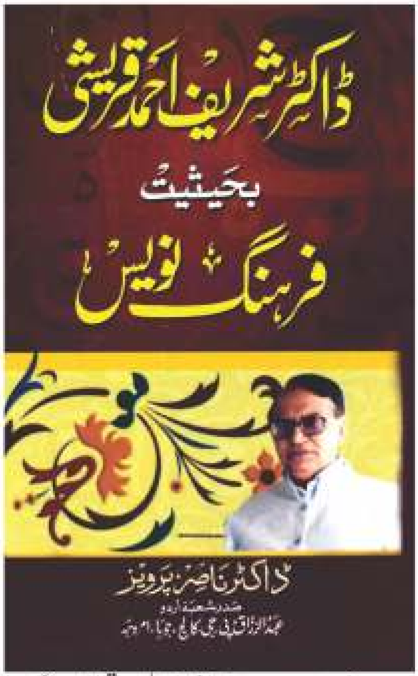

ڈاکٹر شریف احمد قریشی کی علمی و تحقیقی زندگی کا آغاز ''فرہنگ روح نظیر'' سے ہوتا ہے جو ان کے ایم. فل. کا تحقیقی مقالہ تھا۔ یہ مقالہ انھوں نے جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی میں پروفیسر نصیر احمد خاں کی زیر نگرانی مکمل کیا۔ اس کی علمی عظمت کا اندازہ اس وقت کے معروف شاعر اور ممتحن معین احسن جذبی کے اس تبصرے سے لگایا جا سکتا ہے جس میں انھوں نے فرمایا تھا کہ: ''اس مقالے پر ایم فل نہیں بلکہ پی ایچ ڈی. کی ڈگری دی جانی چاہیے۔'' یہ جملہ دراصل اس فرہنگ کی قدر و قیمت کا سب سے بڑا اعتراف ہے۔ یہ کتاب مخمور اکبر آبادی کے مرتبہ مجموعہ ''روح نظیر'' (1978) پر مبنی ہے جس کے کلام سے ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے تقریباً 4000 اہم الفاظ، محاورات، اصطلاحات نہایت باریک بینی سے اخذ کیے۔ انھوں نے الفاظ کے محض معنی بیان نہیں کیے بلکہ ان کے استعمالی پہلو، امثال، اور لسانی پس منظر کو بھی واضح کیا جس سے نظیر کی زبان کی تہذیبی و عوامی روح سامنے آتی ہے۔ اس فرہنگ میں ترکی، پنجابی، مارواڑی، عبرانی، ہندی اور سنسکرت کے الفاظ کے ساتھ ساتھ تیراکی، میلوں ٹھیلوں، کھیل تماشوں، زیورات اور رسوم ہند سے متعلق اصطلاحات بھی شامل کی گئیں۔ یوں ''فرہنگ روح نظیر'' صرف ایک لغت نہیں بلکہ اردو زبان کے عوامی اور تہذیبی محاورے کا آئینہ بن گئی۔ ڈاکٹر شریف احمد قریشی کی دوسری تصنیف ''فرہنگ نظیر'' ان کے تحقیقی سفر کا نقطہ عروج ہے۔ یہ کتاب ان کی پی ایچ ڈی. کے دوران مکمل ہوئی اور بلاشبہ اردو فرہنگیات کا ایک جامع اور معیاری کارنامہ ہے۔ یہ فرہنگ نظیر اکبر آبادی کے تمام اردو کلام پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے مختلف مستند نسخوں کلیات نظیر (مرتبہ عبدالباری آسی و اشرف علی)، کلیات نظیر (اظہر راہی)، گلزار نظیر (سلیم جعفر) اور روح نظیر (مخمور اکبر آبادی) کا تقابلی مطالعہ کیا اور کلام نظیر میں پائے جانے والے متعدد اختلافات، تغیرات اور لفظی املا کو علمی دلائل کے ساتھ درست کیا۔ ڈاکٹر شریف احمد قریشی نظیر کے کلام کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''نظیر کے کلام کا ایسا کوئی نسخہ طبع نہیں ہوا جو غلطیوں سے پاک ہو۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ نظیر نے چھوٹے چھوٹے مضمون پر مفصل طبع آزمائی کی اور اپنی وارفتہ مزاجی کے باعث کبھی اپنے کلام کو جمع یا مرتب کرنے کی کوشش نہیں کی، نہ جانے کتنا کلام فرمائشوں پر لکھ کر دے دیا۔ اس کے پاس فقیر یا گداگر آئے اور صدائیں لگانے کے لیے اشعار لکھوا کر لے گئے۔ دکاندار اور خوانچے والے، آواز لگا کر سامان بیچنے کے لیے اپنی اپنی فرمائشوں کے مطابق کلام لکھوا کر لے گئے۔ پتہ نہیں، اس نے اپنا کتنا

شریف احمد قریشی نے اردو فرہنگ نویسی کو محض لغت نویسی کی سطح سے بلند کر کے لسانی و تہذیبی تحقیق کی منزل عطا کی۔ ان کی تین نادر تصانیف ''فرہنگ روح نظیر''، ''فرہنگ نظیر'' اور ''تلمیحات نظیر اکبر آ کبر آبادی'' نہ صرف نظیر اکبر آبادی کی شاعری کو سمجھنے کی کنجی ہیں بلکہ اردو لسانیات کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

کلام لوگوں کو بخش دیا اور کتنا ضائع ہو گیا۔ ان کے شاگردوں اور مرتبین کو جیسا ہاتھ لگا ویسا مرتب کر دیا اور کچھ غلطیاں تو کاتبوں کی ستم ظریفیوں کے باعث رونما ہوئیں۔''[1]

اس میں کوئی شک نہیں کہ نظیر کا مکمل کلام محفوظ نہیں رہ سکا اور پبلشروں نے جو کلام نظیر کے نام سے شائع کیا، اسے زیادہ تر تبدیلی الفاظ کے ساتھ شائع کر دیا۔ ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے نظیر کے کلام کے مطالعے میں ایک نہایت دقیق اور سنجیدہ علمی کاوش کو انجام دیا۔ نظیر کے کلام کی اصل تدوین اور حفاظت ایک مشکل کام تھا کیونکہ ان کا کلام منتشر تھا اور اکثر ضائع ہو چکا تھا۔ کئی مرتبہ فرمائشوں کے تحت اشعار لکھے گئے یا شاگردوں اور مرتبین نے مختلف انداز سے اس میں رد و بدل کیا۔ اس کے نتیجے میں مختلف نسخوں میں اختلافات پیدا ہو گئے اور اصل متن کی درستگی متاثر ہوئی۔ اس علمی چیلنج کا مقابلہ کرتے ہوئے ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے مختلف مرتبہ نسخوں کا مفصل تقابلی مطالعہ کیا جن میں کلیات نظیر، گلزار نظیر اور روح نظیر شامل تھے۔ انھوں نے ہر شعر اور مصرعے کے مضمون، معنی اور وزن کو مدنظر رکھتے ہوئے درستگی کی کوشش کی۔ جہاں کہیں الفاظ یا جملوں میں تضاد تھا وہاں انھوں نے مستند دلائل پیش کیے اور ثابت کرنے کی کوشش کی کون سا لفظ یا فقرہ اصل متن کے مطابق درست ہے۔ اس تحقیق کے نتیجے میں فرہنگ نظیر میں شامل اشعار کی مستند تدوین اور تشریح ممکن ہوئی۔ اس سے قاری کو نہ صرف لغوی معنی کی تفہیم ہوئی بلکہ کلام کے ادبی، تاریخی اور سماجی پس منظر سے بھی روشناس ہونے کا موقع ملا۔ اس کتاب میں تقریباً 7000 الفاظ، محاورات، اصطلاحات، کہاوتیں اور ضرب الامثال شامل ہیں جن کے مفاہیم و مطالب کو لسانی، ثقافتی اور معنوی سیاق کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے بعض ایسے الفاظ بھی شامل کیے جو کسی لغت میں موجود نہ تھے، ان کے معنی انھوں نے اہل زبان سے براہ راست استفسار اور تحقیقی تتبع کے ذریعے متعین کیے۔ ''فرہنگ نظیر'' کی ترتیب میں ایک غیر معمولی خوبی یہ ہے کہ اس میں نظیر کی شاعری سے وابستہ چرند و پرند، پھل، پھول، زیورات، کپڑے، تیوہاروں، میلوں ٹھیلوں اور پیشہ ورانہ اصطلاحات کو ایک مربوط نظام کے تحت پیش کیا گیا ہے۔ یوں یہ کتاب اردو کی موضوعاتی اور ثقافتی لغت کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ''فرہنگ نظیر'' کے بغیر نظیر کے کلام کو پوری معنویت کے ساتھ سمجھنا ممکن نہیں۔ یہ کتاب ایک طرف لسانی تحقیق کا شاہکار ہے تو دوسری جانب فرہنگ نگاری کے فن کا عملی نمونہ۔ نظیر اکبرآبادی کے کلام کا ایک اہم پہلو ان کی تلمیحات و اشاراتی نظام ہے۔ ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے اس میدان میں بھی ایک منفرد علمی خدمت انجام دیتے ہوئے ''تلمیحات نظیر اکبرآبادی مع شخصیات'' کے عنوان سے ایک ایسی کتاب مرتب کی جو اپنے موضوع کے اعتبار سے اردو ادب میں منفرد اور وقیع مثال ہے۔ اس کتاب میں نظیر کے اشعار میں موجود دیومالائی، مذہبی، تاریخی اور ثقافتی

تلمیحات کی تشریح نہایت تحقیق اور حوالہ جاتی استناد کے ساتھ کی گئی ہے۔ ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے فارسی، عربی، ترکی اور ہندی ماخذات سے مدد لے کر ہر تلمیح کا وقوع محل، تاریخی پس منظر اور معنوی جہت واضح کی ہے۔ یہ کتاب ان کے گہرے مطالعے اور تلمیحی شعور کی آئینہ دار ہے۔ اس میں تلمیحات کے ساتھ ساتھ متعلقہ شخصیات، واقعات اور اصطلاحات کی تفصیل بھی شامل ہے۔ جس سے نظیر کے اشعار کے معنی ایک نئے تناظر میں کھلتے ہیں۔ یوں یہ تصنیف صرف ایک وضاحتی کتاب نہیں بلکہ اردو شاعری کی تلمیحی لغت کے طور پر اپنی مثال آپ ہے۔ ڈاکٹر شریف احمد قریشی کی یہ تینوں تصانیف فرہنگ روح نظیر، فرہنگ نظیر، اور تلمیحات نظیر اکبرآبادی اردو زبان کے لسانی سرمائے کی حفاظت کے ساتھ ساتھ نظیر اکبرآبادی کی شاعری کی تفہیم کے لیے ناگزیر حوالہ جات بن چکی ہیں۔ انھوں نے فرہنگ نویسی کو محض الفاظ کے معنی تک محدود نہیں رکھا بلکہ ہر لفظ کو اس کے سماجی، تہذیبی اور معنوی تناظر میں دیکھا۔

اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ شعر و شاعری کو غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے۔ صدیوں سے تخلیقی اظہار کا یہ پہلو اردو ادبی روایت کا بنیادی ستون رہا ہے مگر اس کے برعکس نثر کے شاہکاروں کی تدوین، تجزیہ اور لسانی مطالعہ کو عموماً ثانوی حیثیت دی گئی۔ ایسے ماحول میں جب نثر پر سنجیدہ اور منظم علمی کام کی روایت کمزور پڑ رہی تھی تب ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے نہایت فکری بصیرت، جرأت تحقیق اور علمی اخلاص کے ساتھ ایک ایسا قدم اٹھایا جس نے اردو تحقیق کو نئی جہت عطا کی۔ انھوں نے پہلی مرتبہ پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ضخیم، دلکش اور شہرہ آفاق ناول ''فسانہ آزاد'' کو اپنی تحقیقی کاوش کا موضوع بنایا۔ وہ ناول جو اردو نثر کی داستانوی روایت، تہذیبی تنوع اور لسانی رنگارنگی کا درخشاں استعارہ ہے۔ اس عظیم الشان تصنیف پر انھوں نے عمرانی اور لسانی نقطہ نظر سے ایسا عالمانہ تجزیہ پیش کیا جو اردو تحقیق کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی میں پی ایچ ڈی ڈگری کے لیے قلم بند کی گئی ان کی فرہنگ ''فرہنگ فسانہ آزاد اور اس کا عمرانی و لسانی مطالعہ'' اپنی نوعیت کے اعتبار سے نہ صرف ایک غیر معمولی تحقیقی دستاویز ہے بلکہ اردو لسانیات اور تنقید میں ایک نئی روایت کی بنیاد بھی رکھتی ہے۔

یہ تصنیف محض لغوی توضیحات یا لسانی نکات کا مجموعہ نہیں بلکہ اردو نثر کی ساخت، اس کے تہذیبی و فکری پس منظر اور سماجی معنویت کا ہمہ گیر مطالعہ ہے۔ ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے اس فرہنگ کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ اردو ادب کی تخلیقی اساس میں نہ صرف فنی حسن بلکہ معاشرتی شعور، عوامی زبان کی سادگی اور ہندوستانی تہذیب کی روح شامل ہے۔ ان کی یہ تحقیق کئی غلط فہمیوں کا ازالہ کرتی ہے اور اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ اردو زبان کی بنیاد ہندو اور مسلم تہذیبوں کے حسین امتزاج پر قائم ہے۔ ڈاکٹر شریف احمد قریشی کا امتیاز یہ ہے کہ وہ ہر علمی موضوع کا انتخاب زندہ شعور اور تازہ زاویہ نظر کے ساتھ کرتے ہیں۔ وہ فرسودہ یا بار بار دہرائے گئے مباحث سے گریز کرتے ہوئے ہمیشہ ایسے علمی گوشوں کو موضوع بناتے ہیں جو اردو کے علمی

سرمایے میں حقیقی اضافہ کا باعث ہوں۔ ان کے نزدیک تحقیق محض تعلیمی ضرورت نہیں بلکہ ادبی فریضہ اور قومی خدمت ہے۔اس طرح ''فرہنگ فسانہ آزاد اور اس کا عمرانی ولسانی مطالعہ'' نہ صرف ان کی علمی بصیرت، گہری زبان دانی اور تنقیدی فہم کا مظہر ہے بلکہ اردو تحقیق میں ایک نئے دور کا آغاز بھی ہے،ایک ایسا دور جس میں نثرفہمی کو لسانی، تہذیبی اور فکری سطحوں پر نئے انداز میں سمجھنے کی روایت قائم ہوئی۔ ڈاکٹر شریف احمد قریشی کی یہ کاوش اردو اسکالروں کے لیے رہنما چراغ کی حیثیت رکھتی ہے جو آنے والے زمانے تک علمی دنیا کو روشنی فراہم کرتی رہے گی۔

اگرچہ انشانے ''رانی کیتکی کی کہانی'' تخلیق کرتے وقت اس التزام کا خاص خیال رکھا کہ نہ صرف عربی اور فارسی کے الفاظ استعمال نہ ہوں بلکہ مشکل اور غیر عام الفاظ سے بھی پرہیز کیا جائے تاہم ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے اپنی باریک بینی، ژرف نگاہی اور تحقیقی مہارت کے سبب اس میں بھی بہت سے نادر الفاظ، محاورات اور لائق تشریح حوالہ جات تلاش کر کے پیش کیے۔ان کی یہ کاوش کہانی کے ہر لفظ اور محاورے کو اس کے اصلی معنوی اور لسانی پس منظر کے ساتھ بیان کرتی ہے اور قاری کو اصل متن کے حسن سے روشناس کراتی ہے۔ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے اپنی تحقیق اور علمی بصیرت سے اس داستان کی فرہنگ مرتب کی۔ انھوں نے نہ صرف اس زمانے کے الفاظ کے معانی اور استعمال کو واضح کیا بلکہ متن کو من وعن نقل کر کے قاری کے لیے اصل لسانی حسن کو برقرار رکھا۔ فرہنگ میں الفاظ، محاورات اور اصطلاحات کی تفصیل فراہم کی گئی، جس سے یہ کتاب ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت اختیار کر گئی۔ ڈاکٹر شریف کی محنت نے یہ ممکن بنایا کہ اب قاری نہ صرف کہانی کو سمجھے بلکہ اس کے لسانی، ثقافتی اور تاریخی پس منظر سے بھی بخوبی واقف ہو۔زبان کے تناظر میں ''رانی کیتکی کی کہانی'' کی نوعیت پر کافی بحث ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر شریف احمد کے مطابق اگر یہ داستان اردو رسم الخط میں لکھی جائے تو اردو کہلائے گی اور اگر دیوناگری میں تو ہندی۔ انشا نے اس میں جادو ٹونے، میلوں ٹھیلوں، رسومات، موسیقی، رقص، اور دیگر سرگرمیوں کے مخصوص الفاظ استعمال کیے جن کے صحیح معنی انھوں نے باریک بینی سے درج کیے۔ اس تحقیق سے قاری کو

اس دور کی معاشرتی اور تہذیبی صورتِ حال کا واضح نقشہ بھی حاصل ہوتا ہے۔ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے نہ صرف لفظی تحقیق کی بلکہ نادر اور متروک الفاظ و اصطلاحات کے حقیقی معنی بھی اجاگر کیے۔ ان کے تجزیے اور حوالہ جاتی توضیحات کی بدولت کہانی کے فنی و تخلیقی حسن کے ساتھ ساتھ اس کا سماجی وتہذیبی پس منظر بھی سمجھنا آسان ہوگیا۔فرہنگ میں آلات موسیقی، راگ و راگنی، زمینی و بحری سواری، محل و مکانات اور رقاصوں و مغنیوں کے ناموں اور ان کی تفصیل کو بھی دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا جو اس کتاب کو نہ صرف لسانی بلکہ تہذیبی حوالہ بھی بناتا ہے۔یوں کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر شریف احمد قریشی کی فرہنگ نے ''رانی کیتکی کی کہانی'' کے لفظی حسن اور معنوی گہرائی کو اجاگر کیا اور اس کے تاریخی، سماجی اور ثقافتی پس منظر کو روشن کر کے اردو و ہندی ادب میں ایک قابلِ قدر تحقیقی حوالہ فراہم کیا۔ یہ فرہنگ نہ صرف انشا کی داستان کو سمجھنے کے لیے ناگزیر ہے بلکہ ادب کے محققین کے لیے بھی ایک منفرد اور قیمتی کارنامہ ہے۔ڈاکٹر حسن احمد نظامی (سابق چیرمین فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ) اپنے ایک مضمون بعنوان ''رانی کیتکی کی کہانی کی فرہنگ: مختصر جائزہ'' میں رقم طراز ہیں:

''ڈاکٹر قریشی فرہنگ اور لغت سے متعلق جتنے کام کر چکے ہیں اس کے لحاظ سے اگر ان کو دور حاضر کا 'بابائے فرہنگ' کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اردو اور ہندی زبانوں پر یکساں عبور حاصل ہونے کے سبب ان فرہنگوں میں الفاظ، محاورات، ضرب الامثال اور یہاں تک کہ متروکات کا ایک خاصہ ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ انھوں نے فرہنگ روح نظیر، فرہنگ نظیر، فرہنگ فسانہ آزاد اور اس کا عمرانی لسانیاتی مطالعہ، کہاوتیں اور ان کا حکایتی و تلمیحی پس منظر، کہاوت کتھا کوش (ہندی) اور تلمیحات نظیر اکبرآبادی لکھ کر اپنا نام ماہرین فرہنگیات یا Lexicographists میں درج کرالیا ہے۔''

ڈاکٹر حسن احمد نظامی صاحب کا عطا کردہ خطاب ادبی حلقوں میں اس قدر مقبول ومشہور ہوا کہ اب ڈاکٹر شریف احمد قریشی کو ''بابائے فرہنگ'' کے لقب سے یاد کیا جانے لگا ہے۔ڈاکٹر شریف نے رجب علی بیگ سرور کی شہرہ آفاق کتاب فسانہ عجائب کی فرہنگ سازی کا کام سرانجام دیا ہے۔

''فسانہ عجائب'' کی عبارت مقفیٰ ومسجیٰ اور انتہائی پرتکلف وپیچیدہ ہے۔تشبیہ، استعارے، قافیہ پیمائی اور دیگر صنعت کے استعمال کے ذریعہ عبارت کو صناعی، رنگینی، رعنائی اور دلکشی سے ہموار کیا گیا ہے۔ سرور آسان اور عام فہم عبارت پر بھی قدرت رکھتے تھے مگر اہل لکھنؤ اور خود سرور اسے کسرِ شان تصور کرتے تھے۔ رعایتِ الفاظ، صنائع لفظی ومعنوی، مصنوعی تراکیب، پیچیدہ فقروں، عربی اور فارسی زبانوں کے الفاظ کی کثرت اور قافیہ پیمائی کے سبب ''فسانہ عجائب'' آورد اور تصنع کے اعتبار سے تو ایک بہترین نمونہ قرار دی جا سکتی ہے مگر اس کی زبان اس قدر بوجھل اور دقیق ہو گئی ہے کہ جسے عہدِ حاضر کے عام قارئین وطلبا سمجھنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔ جس کے متعلق ڈاکٹر شریف احمد قریشی اس طرح رقم طراز ہیں:

''شادی بیاہ کے پرانے رسوم و رواج متروک ہوگئے ہیں۔ بازاروں میں سودا بیچنے والوں کی بولیاں گم ہوگئی ہیں۔عورتوں کے قدیم زیورات، گہنوں اور ان کی ملبوسات کے نام مفقود ہو گئے ہیں۔قدیم کھیل تماشوں اور عیش وعشرت کی محفلوں سے اب کسی کا لگاؤ نہیں رہا۔ چوسر، گنجفہ وغیرہ کا شوق بھی کنارہ کیا ہے؟ طوائفوں کی تہذیب خاک میں مل گئی ہے اور ان کے کوٹھے نہ جانے کب کے ویران ہو چکے ہیں۔ کسبیاں اور ڈومنیاں خدا جانے کہاں روپوش ہوگئی ہیں۔ بھانڈ بھگتیے، ہیجڑے، فھدے اور مُرچڑے اپنی قسمت کو رو بیٹھے ہیں۔ پتنگ بازی، بٹیر بازی، مرغ بازی، کبوتر بازی اور نہ جانے

کتنی بازیاں کب کی مات کھا چکی ہیں۔ فقیر، ٹھگ، دلّال، کنجڑے بھٹیارے، حلوائی، نانبائی اور میلے ٹھیلے والے اپنی پرانی بولیوں اور اصطلاحوں کو بھول چکے ہیں۔ نہ جانے ایسے کتنے الفاظ ہیں جن کا چلن ختم سا ہو گیا ہے اور نہ جانے کتنی اصطلاحیں متروک ہو چکی ہیں۔ اردو زبان و ادب کی ان مخصوص بولیوں اور اصطلاحوں کو یکجا کر کے محفوظ کرنا ہماری اہم ذمہ داری ہے۔ ''فسانۂ عجائب'' جابجا ایسے فقروں اور اصطلاحوں سے بھری پڑی ہے جنھیں ہم بھول گئے ہیں یا بھولتے جا رہے ہیں جو ہماری تہذیب کی بنیادیں ہیں۔ ''فسانۂ عجائب'' کی فرہنگ مرتب ہونے سے مخصوص الفاظ، محاورات، روزمرہ، ضرب الامثال اور مخصوص بولیوں کا ایک خزینہ محفوظ ہو جائے گا اور یہ فرہنگ اردو زبان و ادب کے لیے کئی طرح سے اہمیت کی حامل ہوگی۔'' 3

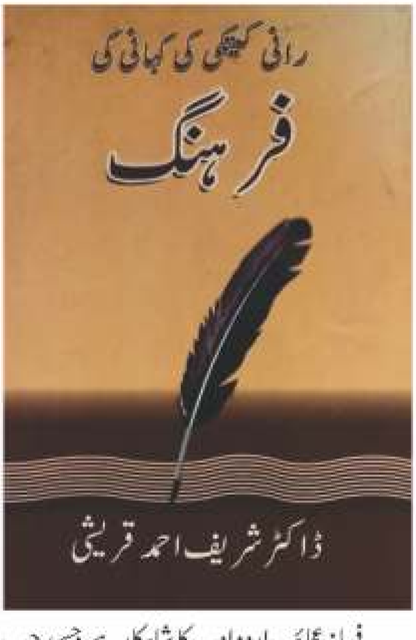

فسانۂ عجائب اردو ادب کا شاہکار ہے جسے رجب علی بیگ سرور نے تصنیف کیا ہے۔ ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے ''فرہنگ فسانۂ عجائب'' کی تمام عبارت کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے دقیق الفاظ و تراکیب، اصطلاحات، محاورات، ضرب الامثال، تلمیحات وغیرہ کی فہرست سازی کے بعد ان کا اندراج بہ اعتبار حروفِ تہجی اور تلفظ کی صحت کا خیال رکھتے ہوئے کیا ہے۔ انھوں نے ہر لفظ کے معنی و مفاہیم اسناد و شواہد کے ساتھ تحریر کیے ہیں۔ جن الفاظ و اصطلاحات کی صراحت کے لیے مختلف لغات اور فرہنگیں ناکافی ثابت ہوئی ہیں ان کے لیے انھوں نے اساتذہ اور ماہرین فن سے رابطہ قائم کر کے ان کے مفاہیم تک پہنچنے کی کوشش کی ہے یا پھر سیاق و سباق کی روشنی میں تحریر کیے ہیں۔ صحیح معانی و مفاہیم تک رسائی حاصل کرنے کے لیے انھوں نے رجب علی بیگ سرور کی دیگر تخلیقات اور ان کے عہد کی متعدد کتب کا نہایت گہرائی و گیرائی سے مطالعہ بھی کیا ہے۔

ڈاکٹر شریف قریشی نے ''رانی کیتکی کی کہانی'' اور 'فسانۂ عجائب'' کی فرہنگیں مرتب کر کے ایک ادبی و لسانی ضرورت کی تکمیل کی ہے۔ انھوں نے یہ فرہنگیں اس لیے بھی مرتب کی ہیں کہ اردو کی بیشتر کتب لغات اور فرہنگوں پر شعری سرمایہ کا اثر دورِ قدیم سے دورِ حاضر تک برقرار ہے۔ کسی لفظ یا محاورے وغیرہ کے معنی یا مفہوم کے لیے عام طور پر بطور سند شعرا ہی کے کلام کو پیش کیا جاتا ہے۔ شعرا کے کلام پر مبنی فرہنگوں کی تعداد کی بہ نسبت نثر نگاروں کی تخلیقات سے متعلق فرہنگیں برائے نام نظر آئیں گی۔ کیا اس حقیقت سے انکار ممکن ہے کہ تمام شعری نگارشات میں اب تک ایسے بے شمار الفاظ استعمال نہیں کیے گئے ہیں جنھیں نثری فن پاروں میں استعمال کیا جا چکا ہے۔

ڈاکٹر شریف احمد نے کہاوتوں، محاورات اور ضرب الامثال پر مبنی متعدد فرہنگیں مرتب کی ہیں جو ان کی علمی بصیرت، تحقیقی ژرف نگاہی اور لسانی ذوق کی آئینہ دار ہیں۔ ان کی اس سلسلے کی اہم اور قابلِ قدر تصنیفات میں ''کہاوتیں اور ان کا حکایتی و تلمیحی پس منظر''، ''کہاوت اور حکایت''، ''اردو کہاوتیں'' اور ''کہاوت کتھا کوش'' (دیوناگری رسم الخط میں) خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ ان کتب نے فرہنگ نویسی کے میدان میں ایک نیا معیار قائم کیا ہے۔

ڈاکٹر شریف احمد قریشی کا تحقیقی رجحان ہمیشہ ایسے موضوعات کی طرف رہا ہے جو نہایت خشک، محنت طلب اور عرق ریزی کے متقاضی ہوتے ہیں۔ ان موضوعات پر عام طور پر پہلے سے زیادہ مواد دستیاب نہیں ہوتا، مگر انھوں نے اپنی علمی بصیرت اور مستقل مزاجی کے بل پر ان میں بھی تحقیق کے روشن دریچے کھول دیے۔ اردو ادب میں عموماً شاعری پر تنقید و تحقیق زیادہ ہوئی جب کہ نثر کے مختلف اصناف کو وہ توجہ کم حاصل ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔ شریف احمد قریشی نے نثر کے اسی نظر انداز شدہ شعبے کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور اس میں اپنی محنت و مطالعے سے ایک نئی جہت پیدا کی۔ ایک استاد کی حیثیت سے شریف احمد قریشی تدریسی تقاضوں سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کی تصنیفات میں طلبا و محققین کی رہنمائی کے لیے وافر مواد موجود ہے۔ وہ ہمیشہ یہ خیال رکھتے ہیں کہ ان کی کتابوں سے کم علم یا ابتدائی سطح کے طالب علم بھی بھرپور استفادہ کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں سادگی، روانی اور شفاف اسلوب کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان کی زبان میں غیر ضروری پیچیدگی نہیں بلکہ وضاحت اور شائستگی ہے جو ان کی تصانیف کو دوسرے محققین سے منفرد مقام عطا کرتی ہے۔

ڈاکٹر شریف احمد قریشی کا امتیاز یہ ہے کہ چاہے وہ کہاوتوں کے تاریخی و حکایتی پس منظر پر لکھیں یا فرہنگ کا خالص علمی مقدمہ تحریر کریں، ان کے بیان کی تفہیم کے لیے کسی دوسری لغت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ان کی زبان خود وضاحتی ہے اور یہی ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ ان کی متعدد فرہنگیں محاورات، کہاوتوں اور حکایتوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں سب سے پہلی قابلِ ذکر کتاب ''کہاوتیں اور ان کا حکایتی و تلمیحی پس منظر'' ہے جو خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کا پیش لفظ اس وقت کے ڈائرکٹر، محمد ضیاء الدین انصاری نے تحریر کیا ہے۔ کتاب میں تقریباً 500 کہاوتیں اپنے تلمیحی اور حکایتی پس منظر کے ساتھ شامل کی گئی ہیں جو اردو کہاوتوں کے ماخذ، تاریخی بنیاد اور معنوی جہتوں کو نہایت عمدگی سے واضح کرتی ہیں۔ اسی سلسلے کی دوسری اہم تصنیف ''کہاوت کتھا کوش'' ہے جو دیوناگری رسم الخط میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں 600 سے زائد کہاوتیں ان کی متعلقہ حکایات کے ساتھ درج ہیں۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں لسانی مطالعے کو بھی یکجا کرنے کی کوشش کی، جو ان کے بین اللسانی شعور کی دلیل ہے۔ اسی سلسلے کی ان کی تیسری اہم کتاب ''کہاوت اور حکایت'' ہے جس میں تقریباً 1500 سے زائد کہاوتیں اور حکایتیں نہایت ترتیب اور خوبصورتی سے پیش کی گئی ہیں۔ ہر کہاوت کے ساتھ اس کی تاریخی یا ادبی حکایت کا حوالہ دیا گیا ہے جس سے یہ کتاب اردو محاوراتی ادب کے مطالعے کے لیے ایک مکمل دستاویز بن جاتی ہے۔ شریف احمد کی ایک اور اہم تحقیقی کاوش ''اردو کہاوتوں کی جامع فرہنگ'' ہے جو ان کا ڈی لٹ کا ضخیم مقالہ ہے۔ یہ ان کی زندگی کا ایک بڑا کارنامہ

ہے جس میں کئی ہزار کہاوتوں کو یکجا کیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ فرہنگ تاحال غیر مطبوعہ ہے مگر اپنی نوعیت کے اعتبار سے اردو لغت نویسی میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں شامل مواد، محنت اور ترتیب نے اردو کہاوتوں کے تحقیقی سرمائے میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا ہے۔ آئندہ جب اردو کی معیاری لغات تیار کی جائیں گی تو یہ فرہنگ ان کے لیے ایک لازمی ماخذ کی حیثیت رکھے گی۔ ڈاکٹر شریف احمد قریشی کا یہ کارنامہ نہ صرف موجودہ محققین بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی مشعل راہ ہے۔ جب زبان میں نئے الفاظ داخل ہوں گے اور پرانے محاورے و کہاوتیں ماضی کی چیز بن جائیں گی، تب قاری ان کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے شریف احمد کی فرہنگوں کا سہارا ضرور لے گا۔ ان فرہنگوں کے مختلف ایڈیشن ہندوستان، پاکستان، انگلینڈ اور امریکہ وغیرہ کے معروف اداروں سے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ''کہاوتیں اور ان کا حکایتی و تلمیحی پس منظر'' کا ایڈیشن دارالنوادر پبلی کیشن، لاہور سے جب کہ ''اردو کہاوتیں'' کے ایڈیشن بک کارنر، جہلم اور فرید بک ڈپو، اردو بازار، کراچی سے شائع ہوئے ہیں۔ ان اشاعتوں سے ڈاکٹر شریف احمد کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے فرہنگ نویسی کے میدان میں اردو زبان کو ایک نئی جہت عطا کی ہے۔ ان کی تحقیقی کاوشیں محض الفاظ کی تشریح نہیں بلکہ ایک تہذیب، ایک طرز فکر اور ایک تاریخی ورثے کی حفاظت بھی ہیں۔ ان کی تحریریں آئندہ نسلوں کے لیے نہ صرف لسانی سرمایہ ہیں بلکہ اردو زبان کی علمی بنیادوں کو مستحکم کرنے والا باپہ فخر کارنامہ بھی ہیں۔

ڈاکٹر شریف احمد قریشی کو ہائر ایجوکیشن اتر پردیش سرکار کے اعلیٰ اعزاز ''شلاکھ شری'' سے 2011 میں نوازا گیا، اس کے علاوہ آٹھ مرتبہ اتر پردیش اردو اکادمی اور تین بار بہار اردو اکادمی کے ذریعہ انعامات و اسناد توصیف سے بھی انھیں نوازا جا چکا ہے۔ انھیں آل انڈیا میر اکیڈمی لکھنؤ نے بھی 1997 میں ''میر ایوارڈ'' سے سرفراز کیا تھا۔ ان کے علاوہ بھی انھیں سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری اکیڈمیوں، انجمنوں اور سوسائٹیوں کے ذریعہ تقریباً بیس مرتبہ انعامات و اعزازات یا اسناد توصیف سے بھی نوازا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر شریف احمد قریشی کی مورخہ 28 دسمبر 2023 بروز جمعرات مطابق 14 جمادی الثانی 1445ھ کو صبح تقریباً 5 بجے دہلی کے میکس اسپتال میں مختصر علالت کے بعد وفات ہوگئی۔

ڈاکٹر شریف نے محض علمی اسناد یا تصانیف کی تعداد بڑھانے کے لیے قلم نہیں اٹھایا بلکہ ان کا ہر کام ایک سنجیدہ فکری شعور اور ادبی مقصدیت کا مظہر ہے۔ ان کی تحریری اور تحقیقی کاوشوں کے پیچھے شہرت یا نمود و نمائش نہیں بلکہ اردو زبان و ادب کی خدمت، اس کے فروغ اور فکری سرمائے کی تکمیل کا جذبہ کارفرما رہا ہے۔ ایسے وقت میں جب ادبی تحقیق اکثر سطحی رجحانات کی نذر ہو رہی تھی، ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے نہایت بصیرت مندی کے ساتھ فرہنگ سازی جیسے محنت طلب اور دقیق علمی میدان کا انتخاب کیا۔ یہ وہ راستہ ہے جو نہ صرف گہرے مطالعے اور مضبوط علمی پس منظر کا متقاضی

ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے فرہنگ نویسی کو محض ایک تحقیقی موضوع نہیں بلکہ اپنا ادبی فریضہ اور قومی خدمت سمجھ کرانجام دیا۔ ان کی محنت، اخلاص اور علمی گہرائی نے اس فن کو ایک نئی جہت عطا کی ہے ۔ ان کی تصانیف اردو ادب میں ایک روشن اور پائیدار اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ہے بلکہ صبر، استقامت اور زبان کے ذوق و اسرار سے گہری وابستگی بھی چاہتا ہے۔ ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے اس پرخار راہ کو خندہ پیشانی، خلوص اور بشاشت کے ساتھ اختیار کیا اور اس میں اپنی زندگی کا بہترین وقت صرف کیا۔ ان کی فرہنگی کاوشیں محض لغوی یا لسانی مجموعے نہیں بلکہ اردو تہذیب، محاوراتی ثقافت اور عوامی دانش کی آئینہ دار ہیں۔ ان کے یہاں کہاوتوں اور تلمیحات کی ترتیب میں نہ صرف زبان کی نفاست اور تہذیبی شعور جلوہ گر ہے بلکہ ان کی علمی دیانت اور تحقیقی بصیرت بھی پوری آب و تاب سے سامنے آتی ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے فرہنگ نویسی کو محض ایک تحقیقی موضوع نہیں بلکہ اپنا ادبی فریضہ اور قومی خدمت سمجھ کر انجام دیا۔ ان کی محنت، اخلاص اور علمی گہرائی نے اس فن کو ایک نئی جہت عطا کی ہے۔ ان کی تصانیف اردو ادب میں ایک روشن اور پائیدار اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

شریف کی علمی و تحقیقی زندگی اس بات کا ثبوت ہے کہ جب علم خلوص کے ساتھ جڑ جائے تو وہ محض کاغذی ریکارڈ نہیں رہتا بلکہ ایک زندہ ورثہ بن جاتا ہے۔ ان کی تصانیف میں نہ صرف زبان کی روح بولتی ہے بلکہ اردو تہذیب کی سانسیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ انھوں نے فرہنگ نویسی کو الفاظ کے معنی لکھنے سے بلند کر کے تاریخ تہذیب کے مطالعے میں بدل دیا۔ ایک ایسا مطالعہ جس کے ہر صفحے پر محنت، اخلاص، اور لسانی شعور کی روشنی جھلکتی ہے۔ ان کے کام نے یہ ثابت کیا کہ زبان محض رابطے کا وسیلہ نہیں بلکہ قوم کے فکری مزاج کا مظہر ہے۔ جب ہم اردو کہاوتوں، محاورات یا عوامی حکایات کو پڑھتے ہیں تو دراصل ہم اپنے ماضی کی ذہنی تصویر دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ شریف نے ان تصویروں کو نہایت نفاست کے ساتھ محفوظ کیا۔ یہی ان کی علمی میراث کا سب سے قیمتی پہلو ہے کہ انھوں نے صرف اردو کے الفاظ نہیں سنبھالے بلکہ اردو کے احساسات، خیالات اور ثقافتی شعور کو بھی ابدی زندگی بخشی۔ ان کی وفات اگرچہ اردو دنیا کے لیے ایک گہرا صدمہ تھی مگر ان کی تصانیف آج بھی ان کی موجودگی کا احساس دلاتی ہیں۔ ان کے قلم سے نکلے ہوئے ہر صفحے میں ایک استاد کی رہنمائی، ایک محقق کی باریک بینی اور ایک عاشق اردو کی محبت جھلکتی ہے۔ آج جب زبانوں کے تیزی سے بدلتے ہوئے منظرنامے میں اردو اپنی شناخت کے لیے جدوجہد کر رہی ہے، ڈاکٹر شریف احمد قریشی جیسے علما کی علمی وراثت اس کے لیے روشنی کا مینار ہے۔ درحقیقت انھوں نے ہمیں یہ سبق دیا کہ زبان کی خدمت صرف تصنیف سے نہیں بلکہ ذمہ داری، احساس اور عشق سے کی جاتی ہے۔ ان کا نام آنے والے زمانوں میں اردو فرہنگ نویسی کے امام، اردو تحقیق کے معمار اور لسانی بصیرت کے پیکر کے طور پر ہمیشہ تابناک اور زندہ جاوید رہے گا۔

حواشی

1. فرہنگ نظیر، شریف احمد قریشی، 1991، ص 27
2. ڈاکٹر شریف احمد قریشی کا ایک اہم ''رانی کیتکی کی کہانی'' کی فرہنگ سازی ہے۔
3. فرہنگ فسانۂ عجائب، ڈاکٹر شریف احمد قریشی، 2018، صفحہ 39 تا 40

■

Dr. Shahpar Shareef
Deptt. of Urdu, School of Humanities,
Uttarakhand Open University,
Haldwani,(Nainital)263139
Mob.: 9027690292
E-mail: sshareef@uou.ac.in

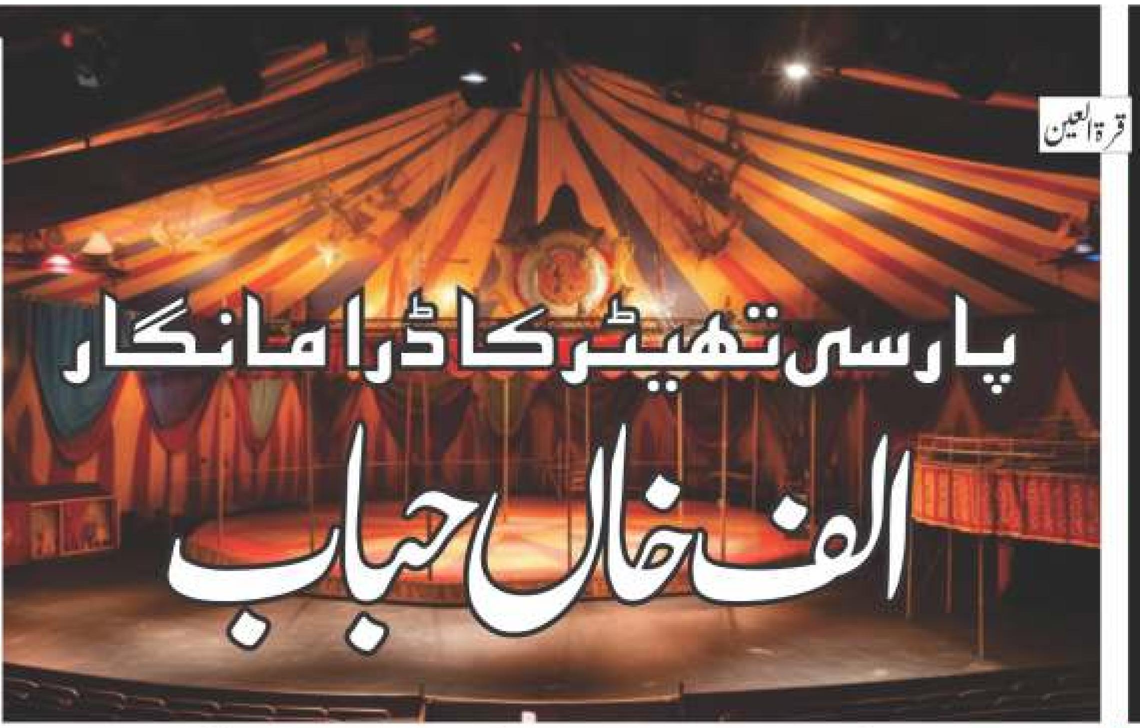

پارسی تھیٹر کا ڈراما نگار
الف خاں حباب

قرۃ العین

محمد الف خاں حباب ایک ایسے گمنام اور غیر معروف ڈراما نگار ہیں جن کے بارے میں بہت کم معلومات دستیاب ہیں۔ حتیٰ کہ معروف مصنفین، جیسے ناٹک ساگر اور رام بابو سکسینہ نے بھی ان کا ذکر نہیں کیا۔ وہ اردو کے ابتدائی دور کے ڈراما نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں اور ان کا زمانہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل پر محیط ہے۔ محمد الف خاں حباب اوریجنل تھیٹریکل کمپنی سے وابستہ تھے اور اسی کے لیے ڈرامے تحریر کرتے تھے۔ یہ کمپنی 1870 میں قائم ہوئی تھی اور یہ پہلی باضابطہ کمپنی تھی جس نے اردو ڈراما اسٹیج کرنے کا آغاز کیا۔ باوجود اس کے کہ وہ اردو ڈرامے کے ابتدائی معماروں میں شامل تھے، مگر ڈرامے کی تاریخ لکھنے والوں نے انھیں نظر انداز کر دیا اور ان کا ذکر کہیں بھی نمایاں طور پر نہیں ملتا۔ البتہ، سید محمد حسن نے رسالہ آج کل میں ان پر ایک مضمون تحریر کیا، جس کی بدولت ان کی زندگی کے بعض اہم پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ محمد حسن لکھتے ہیں:

محمد الف خاں حباب کی پیدائش کے متعلق کوئی مستند معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ ان کی جائے پیدائش کے حوالے سے بھی مختلف آرا پائی جاتی ہیں۔ مولفِ تذکرہ ریاض نام داران کے مطابق وہ لکھنؤ کے باشندے تھے، جب کہ محمد علی خاں اثر رامپوری کی روایت میں انھیں دہلی کا بتایا گیا ہے۔ تاہم، یہ مسئلہ اس وقت واضح ہو گیا جب ان کا ڈراما 'سلیمانی شمشیر' دستیاب ہوا۔ اس کے دیباچے میں خود حباب لکھتے ہیں'' میں نے یہ ناٹک اپنے وطن ہسوہ، فتح پور میں ترتیب دیا اور وہیں شائع بھی کرایا۔'' یہ بیان ان کی جائے پیدائش کے حوالے سے ایک مستند حوالہ فراہم کرتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہسوہ، فتح پور ہی ان کا اصل وطن تھا۔

(ماہنامہ آج کل، دسمبر 1959)

محمد الف خاں حباب کا شمار اردو کے اولین ڈراما نگاروں میں ہوتا ہے، اور اس میدان میں ان کی حیثیت ایک پیش رو کی ہے۔ انھوں نے اپنی جد و جہد اور تخلیقی صلاحیتوں کے ذریعے اردو ڈرامے کی بنیاد رکھی، جس پر بعد کے ڈراما نگاروں نے اپنی عمارتیں تعمیر کیں۔ حباب اردو کے پہلے ایسے ڈراما نگار ہیں جنھوں نے ڈرامے کی زبان پر تنقیدی نگاہ ڈالی۔ انھوں نے ڈراما 'شررِ عشق' کے دیباچے میں زبان و بیان اور کرداروں کے مکالموں کے حوالے سے اپنی آرا پیش کیں۔ ان کا نظریہ تھا کہ کرداروں کی زبان ان کے طبقے اور پس منظر کے مطابق ہونی چاہیے تاکہ مکالمے حقیقت سے قریب تر اور فطری معلوم ہوں۔ حباب لکھتے ہیں:

''اب سے ناٹک جدید طرز پر ہو جس سے جوہر شناسوں کو مذاقِ شاعری ولطفِ محاورہ اور زبان کی صفائی ظاہر ہو، یہ بھی معلوم ہو کہ زبان بیگمات سلطان خانے کی کیا ہے، روزمرہ عورت درباری کی کیا ہے اور بول چال فتنہ گران بازاری کی کیا ہے اور سلطان کے دربار میں آدابِ گفتگو کیا ہے؟''

(دیباچہ، شررِ عشق، حباب کے ڈرامے، امتیاز علی تاج)

محمد الف خاں حباب کے ڈراموں کی صحیح تعداد کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی۔ تاہم، مجھے صرف چار ڈرامے دستیاب ہوئے، جنھیں امتیاز علی تاج نے ترتیب دے کر مجلس ترقی ادب، لاہور سے شائع کیا۔ ان ڈراموں کے عنوانات درج ذیل ہیں:

1. شررِ عشق
2. نیرنگ قاف
3. نقش سلیمانی
4. جشن کنور سین

ان ڈراموں کے بیشتر موضوعات مثنویوں سے ماخوذ ہیں، جن میں دیو، پری، انسان اور دیگر خیالی داستانوں پر مبنی روایات شامل ہیں۔ شررِ عشق درحقیقت مثنوی 'طلسم الفت کی داستان' سے ماخوذ ہے، جس کے مصنف خواجہ اسد علی خاں تھے۔ انھیں لکھنؤ کے رئیسوں میں آفتاب الدولہ شمشیر جنگ بہادر کے لقب سے جانا جاتا تھا۔ اس ڈرامے میں بھی وہی روایتی واقعات شامل ہیں جو اس دور کی داستانوں اور مثنویوں میں عام طور پر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ حباب نے ملکی داستانوں کو ڈرامے کی شکل میں ڈھال کر پیش کیا، اور 'شررِ عشق' کو چار ایکٹ پر تقسیم کیا۔ پہلے ایکٹ کے پہلے سین میں شہزادہ جان جہاں کے دیوان خانے کا منظر دکھایا گیا ہے، جہاں مختلف کردار موجود ہیں۔ اسی دوران چند سہیلیاں ہاتھوں میں دہی، پان اور پچکاری لیے داخل ہوتی ہیں اور ایک لاونی گاتی ہیں، جس میں ہندوستانی تہذیب کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔

مثال ملاحظہ کیجیے:

چلے شکار کو لا ہمارے، باندھو سب سنگت
دودھ، مچھلی، اب لے آوری بہناں، شبھ گھڑی ساعت
ناچ بدھاوا ناچو مل کر گاؤں مبارک، ہوویں کنور رخصت

(حباب کے ڈرامے، امتیاز علی تاج، ص 10)

اسی طرح، پہلے ایکٹ کے چوتھے منظر میں محل کا ایک دلکش منظر پیش کیا گیا ہے، جہاں عالم آرا بے قراری کے عالم میں داخل ہوتی ہے اور اپنی سہیلی دل رُبا سے جان جہاں کے بارے میں دریافت کرتی ہے۔ اپنی بے چینی اور اضطراب کے اظہار کے لیے وہ ایک ٹھمری گاتی ہے، جس میں ہجر اور بے قراری کو اپنے مخصوص علاقائی لہجے میں بیان کرتی ہے۔ یہ ٹھمری اودھ اور اس کے آس پاس کے علاقوں کی زبان اور تہذیب کی بھرپور عکاسی کرتی ہے، جس سے اس دور کے طرزِ اظہار، نغمگی، اور جذباتی کیفیات کا اندازہ ہوتا ہے۔

عالم آرا کی زبانی پیش کردہ ٹھمری ملاحظہ ہو۔

دکھا دو پیاری کون گلی گئے سجنا
اب درشن بھئے سپنا
سدھ بدھ سب بسرائی موری
جیا نکست ہے اپنا
سائیں کی یاد رہے گی نس دن
نام ان ہی کا جپنا (ایضاً،ص17)

مذکورہ ٹھمری میں ہندی، اودھی اور دیگر علاقائی الفاظ کا خوبصورت اور فطری استعمال کیا گیا ہے، جو اس دور کی زبان اور تہذیب کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ الفاظ جیسے سجنا، درشن، بھئے، سپنا، بسرائی، جیا، نکست، سائیں اور جپنا وغیرہ اس لوک رنگ کو مزید نمایاں کرتے ہیں۔ اسی طرح، ایک اور ٹھمری ملاحظہ ہو، جو شعلہ کے دیوان خانے کے منظر سے لی گئی ہے۔ اس منظر میں شعلہ اور جان جہاں آپس میں گفتگو کر رہے ہیں، اور یہاں کا لہجہ، انداز اور اسلوب بالکل مختلف ہے۔ یہ مکالمے نہ صرف کرداروں کی نفسیات اور معاشرتی پس منظر کو اجاگر کرتے ہیں بلکہ اس وقت کی زبان کے رنگ و آہنگ کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ یہ منظر اور مکالمے اُس دور کی تہذیبی جھلک اور اردو ڈرامے کی ابتدائی شکل کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔

عشق نے کیسی کٹاری ماری
بیٹھی نپٹ بن کے دکھیاری
کرم کے اچھر باچن نہ جانے
پنڈت گیانی اور اچاری
مجھ پر کرپا رکھو پیاری
میں چیری ہوں جی سے تہاری

(ایضاً،ص40)

مذکورہ گیتوں میں شعلہ نے عشق کے جذبات کو ہندی اور علاقائی زبان کے ذریعے نہایت منفرد انداز میں پیش کیا ہے، جو ہماری ہندوستانی تہذیب کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ ان گیتوں میں محبت، فراق، انتظار اور بے قراری کے جذبات کو نہایت لطیف پیرایے میں بیان کیا گیا ہے، جس سے اس دور کی ادبی جمالیات اور زبان کے حسن کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ اسی طرح، اس ڈرامے میں مختلف محاوروں کا استعمال بھی ملتا ہے، جو مکالموں کو مزید فطری اور بامعنی بنا دیتا ہے۔ خاص طور پر عالم آرا نے اپنے دکھ، درد اور عاشق کی جدائی کو ایک منفرد اور اچھوتے انداز میں بیان کیا ہے، جو اس کے کردار کی گہرائی اور جذباتی شدت کو نمایاں کرتا ہے۔ یہ تمام عناصر محمد الف خاں حباب کے تخلیقی فن، ان کی زبان پر گرفت اور ہندوستانی تہذیب سے گہری وابستگی کو ظاہر کرتے ہیں۔

عالم آرا:

ساجن چھوٹے، موت اب آئی، لاگ لوگ سب چھوٹا ہے
چلا مسافر جب دنیا سے، نیہا نات کل ٹوٹا ہے
گھڑی بچھڑنے کو آ پہنچی، پیارے کب کا کچھ پتا نہیں
مرتے کھن منھ نہ دیکھا، لکھا بھاگ کا پھوٹا ہے
سائیں سے اب آس لگی ہے، دکھتارن اور داتا ہے
وہی بنائے، وہی بگاڑے اور جگ سارا اچھوتا ہے

(ایضاً،ص91)

محمد الف خاں حباب کا دوسرا معروف ڈراما 'نیرنگ قاف عرف غزالہ و ماہرو' ہے، جو واجد علی شاہ کی مشہور مثنوی 'دریائے عشق' سے ماخوذ ہے۔ یہ ڈراما حباب کے سب سے مقبول اور کامیاب ڈراموں میں شمار ہوتا ہے۔ واجد علی شاہ نے خود اس مثنوی کو اسٹیج پر پیش کیا تھا، اور اس کی غیر معمولی شہرت خاص و عام میں تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ لوگ 'نیرنگ قاف' کو بھی بے حد شوق سے دیکھتے تھے۔

محمد الف خاں حباب کا دوسرا معروف ڈراما 'نیرنگ قاف عرف غزالہ و ماہرو' ہے، جو واجد علی شاہ کی مشہور مثنوی 'دریائے عشق' سے ماخوذ ہے۔ یہ ڈراما حباب کے سب سے مقبول اور کامیاب ڈراموں میں شمار ہوتا ہے۔ واجد علی شاہ نے خود اس مثنوی کو اسٹیج پر پیش کیا تھا، اور اس کی غیر معمولی شہرت خاص و عام میں تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ لوگ 'نیرنگ قاف' کو بھی بے حد شوق سے دیکھتے تھے۔ اس ڈرامے کا پلاٹ یہ ہے کہ شہزادہ ماہرو خواب میں غزالہ کو دیکھتا ہے اور بیدار ہونے کے بعد اس کی تصویر بنا لیتا ہے۔ دوسری جانب، لال پری شہزادے سے محبت کا اظہار کرتی ہے، لیکن وہ اسے پسند نہیں کرتا۔ اسی دوران لال پری، شہزادے کو قید کر لیتی ہے، اور دیو اسے کوڑے مارتا ہوا باغ میں لے جاتا ہے، جہاں ماہرو اور غزالہ کی ملاقات ہوتی ہے۔ وہ دونوں تنہائی میں عشق و محبت کی باتیں کرتے ہیں، لیکن غزالہ کی سہیلیاں یہ ساری باتیں اس کی ماں کو بتا دیتی ہیں، جس پر غزالہ کی ماں اسے قید کر لیتی ہے۔

اسی دوران سبز قبا جن نمودار ہوتا ہے اور غزالہ کو اس کے گھر سے لے کر چلا جاتا ہے۔ دوسری طرف، غزالہ کا بھائی بہن کی تلاش میں نکلتا ہے۔ راستے میں مشک پری اس پر عاشق ہو جاتی ہے اور اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہے، مگر وہ انکار کر دیتا ہے اور اپنی بہن کی تلاش میں دوبارہ روانہ ہو جاتا ہے۔ سبز قبا جن شہزادہ ماہرو کو اس کے گھر واپس لے آتا ہے اور عاشق و معشوق کو ملا دیتا ہے۔ لال پری شہزادے کی خوشامد کرتی ہے، مگر وہ اس سے ملنے اور بات کرنے سے صاف انکار کر دیتا ہے۔ مایوس ہو کر لال پری سبز قبا جن کو خط لکھتی ہے اور خوش اطوار کے ذریعے اسے بھیجتی ہے۔ بعد ازاں، سبز قبا، غزالہ، مشک بو اور خوش اطوار کو ایک دعوت پر بلایا جاتا ہے۔ جب لال پری کو یقین ہو جاتا ہے کہ ماہرو اسے قبول نہیں کرے گا، تو وہ خودکشی کرنے کی کوشش کرتی ہے، مگر سب لوگ اسے روک لیتے ہیں۔ آخر میں، ماہرو غزالہ اور لال پری دونوں سے شادی کر لیتا ہے۔ ڈرامے کے اختتام پر سب مل کر مبارکباد کے گیت گاتے ہیں، اور یوں کہانی اپنے خوشگوار انجام کو پہنچتی ہے۔

ڈراما 'نیرنگ قاف غزالہ و ماہرو' چار ایکٹ اور 53 مناظر پر مشتمل ہے۔ پہلے ایکٹ کے پہلے منظر میں بادشاہ

کا دربار دکھایا گیا ہے، جہاں مختلف کردار آتے ہیں، جن میں مجرائی بھی شامل ہیں جو بادشاہ کے دربار میں غزلیں گاتی ہیں۔ ان غزلوں میں مختلف قسم کے لباس اور زیورات کا ذکر کیا جاتا ہے، جو اس وقت کی تہذیب اور رنگینی کی جھلک پیش کرتے ہیں۔

مجرائی:

تری بزم میں زہرہ حاضر ہے آج
وہ گاتی ہے سوہا مبارک گھڑی
رکھا تشت مہتاب میں اس نے کرتا
نگینوں کی جا اس میں پروئیں جڑی
ستاروں کی ٹوپی ہے رنگ آسمانی
ثریا کی اس میں ٹکی ہے لڑی

(ایضاً،ص122)

حباب کے دوسرے ڈراموں کی طرح، 'نیرنگ قاف غزالہ و ماہرو' میں بھی ایک ٹھمری شامل ہے، جس میں ساون کے موسم کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس ٹھمری میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح عورتیں اپنے جذبات، دلی کیفیات اور ہجر کو اس موسم میں بیان کرتی ہیں۔ یہ ٹھمری اودھی اور علاقائی زبان میں لکھی گئی ہے، جس میں ان کی کیفیات کا اظہار کیا گیا ہے جو اس ہندوستانی فضا اور ماحول میں ان پر گزرتی ہیں۔ غزالہ شہزادی کا ساون کے موسم میں جھولا جھولتے ہوئے یہ ٹھمری ملاحظہ کیجیے:

غزالہ:

اے سکھی ساون آئے اٹھت جیا پیہر
امگے جو بنوا دھرت نہیں دھیر
بجلی چمکے کاری گھٹا میں تو آنکھ بھر آئے نیر
مدھ ٹپکت ہے اب جوبن سے رس مارت ہے تیر،

(ایضاً،ص137)

اسی قبیل کے چند اشعار اور ملاحظہ کیجیے جس میں ساون کے ساتھ جھولے کا ذکر ہے جو ہماری ہندوستانی تہذیب کی واضح مثال ہے۔

بہار آئی جوانی کی، گل امید پھولا ہے
مزا دیتا ہے یہ ساون عجب دلچسپ جھولا ہے
ازل سے لکھ گئے شوریدگی (ہی) بخت میں اپنے
ہنڈولا تیرے وحشی کا لڑکپن سے بگولا ہے

(ایضاً،ص137)

محمد الف خاں حباب نے اپنے ڈراموں میں اردو کے ساتھ ساتھ ہندی الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے، جو ان کی تخلیقی صلاحیت کو مزید نکھارتا ہے۔ ڈراما 'نیرنگ قاف عرف غزالہ و ماہرو' میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ تیسرے ایکٹ کے چوتھے منظر میں سبز قبا کے گھر میں جشن کا ماحول ہوتا ہے، جہاں تمام کردار مل کر گانا گاتے ہیں۔ اس منظر میں ہندی الفاظ کا استعمال واضح طور پر نظر آتا ہے، جو ہندوستانی تہذیب اور زبان کے امتزاج کو خوبصورتی سے پیش کرتا ہے۔ ان گانوں میں ہندی کے ایسے الفاظ شامل ہیں جو نہ صرف اس دور کی ثقافت کو ظاہر کرتے ہیں بلکہ زبان کی گہرائی اور رنگینی کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔

سب لوگ:

آج کا دن شادی کا ہے سب کو اے کرتار
مالک کے دل کا رنج مٹا سب راضی خوشی سنسار
بانو کا بھاگ سہاگ سلامت، پھولیں پھلیں سرکار

(ایضاً،ص179)

اس ڈرامے میں دیو، جن اور جادوگر جیسے اساطیری کرداروں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ ڈراما نگار نے ان دیو مالائی کرداروں کے ذریعے ہندوستانی تہذیب کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کرداروں کے ذریعے نہ صرف کہانی میں دلچسپی پیدا کی گئی ہے بلکہ اس کے ذریعے ہندوستانی ثقافت اور روایات کی جھلک بھی پیش کی گئی ہے۔

مکالمہ ملاحظہ کیجیے:

''ارژنگ: بیٹا نا انصافی سے کہیں وبال میں نہ آجانا (دل میں) پر اب مناسب یہ ہے کہ فطرت سے اس کو دام میں لانا چاہیے۔ نہیں تو بے ڈھب جادوگر ہے۔ ہاں اس کو اور اس کے آدمیوں کو بٹھا کر لوبان کے ساتھ بے ہوشی کی دھونی دوں۔

گلنار: اے پروردگار یہ شخص کیا کرنے آیا ہے۔

قارن: لیجیے گرو! حاضر ہے۔

(ایضاً،ص213)

اسی طرح ڈرامے میں مختلف اشلوک کا بیان بھی موجود ہے۔ پرانوں اور اپنشدوں میں جو مذہبی درس دیا گیا ہے، انھیں ہی اشلوک کہا جاتا ہے۔ ہندو مذہب میں جب کوئی مذہبی رسم ادا کی جاتی ہے، تو اس کے دوران آگ میں لوبان ڈال کر اشلوک پڑھے جاتے ہیں۔ لوبان ایک قسم کی خوشبودار لکڑی ہوتی ہے، جسے مذہبی رسومات کے دوران آگ میں ڈال کر دھونی دی جاتی ہے، اور پھر اس کے بعد اشلوک پڑھے جاتے ہیں۔ یہ عمل روحانیت اور پاکیزگی کی علامت ہے اور مذہبی عبادات میں روحانی ارتقا اور طاقت کو بڑھانے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔

مثال ملاحظہ ہو۔

''ارژنگ: (آگ پر لوبان ڈال کے) اشلوک پڑھا ہے

جگت سامری کی کروں آج بیرن
کوئی دم میں جھگڑے کا ہووے نبیڑن
ہری پنٹھ سیٹھیا، بکٹ پنتھ دھنکے
چلے خوب کنٹاپ کا پھر اٹیرن

(ایضاً،ص214)

ڈراما 'سلیمانی تلوار، معروف بہ نقش سلیمان و بہشت شداد' حباب کے مقبول ڈراموں میں سے ایک ہے۔ اس کا موضوع بھی مافوق الفطرت قصوں پر مبنی ہے، جن میں ایک خیالی داستان ہے، جسے ہندوستانی تہذیب میں سمو کر پیش کیا گیا ہے۔ اس ڈرامے میں بھی ٹھمری، لاونی، غزلیں اور گانوں کا استعمال کیا گیا ہے، جن میں ہندی تہذیب کی عکاسی دیکھی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر، پہلے ایکٹ کے تیسرے منظر میں شداد کے ذریعے ایک گانا پیش کیا گیا ہے، جس میں مختلف سمتوں کا ذکر خالص ہندی میں کیا گیا ہے۔

گانے کے چند بول درج ذیل ہیں۔

شداد:

کرتا ہوں اب نقش سلیمانی کے لانے کا سامان
جس سے پا کر ملک و خزانہ ہو جاؤں یاں کا سلطان
پورب پچھم، اتر دکھن بایب نیرت آگنیہ ایسان
چاروں جانب، چاروں گوشے، ڈھونڈوں نقش وہ بادل و جان

(ایضاً،ص270)

حباب کے اس ڈرامے میں مختلف ایسے کردار ہیں جو اپنے مکالمات علاقائی زبان میں ادا کرتے ہیں۔ مثلاً، گجراتی کردار اپنی مادری زبان میں بات کرتے ہیں، مراٹھی برہمن اپنی مراٹھی زبان میں، اور اسی طرح عام ہندوستانی کردار اپنی مخصوص علاقائی زبان میں ادا کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ہمارے مشترکہ اور گنگا جمنی تہذیب کی نشانی ہے، جسے ہم 'وحدت میں کثرت' اور 'کثرت میں وحدت' سے تعبیر کرتے ہیں۔

چند مثالیں ملاحظہ کریں:

گجراتی بنیا:

جات نون چھوں وانیوں نے مری گیو چھے ڈے کرو
مہاری الی ناسی گئی نے رہی گیو چھوں اکھے لو

موے الی بجی کرشن سرز ملی چھے رکم
ایشور تتے راکھے سکھی راکھی مہاری تیں شرم

ہندوستانی بنیا:

جات کو ہوں بنیا میں، گیا ہے میرا بیٹا مر
بھاگی میری جورو بھی، بگڑ گیا ہے میرا گھر
اب تو پائی ہے رقم، کروں گا جورو دوسری
راکھے ایشور آپ کو، اے راجا جی سدا سکھی

مراٹھا برہمن:

میں گریب برہمن راج دھن تمی مالاں دیا
لیکرو بالے بھوکے ماچے تینجا آشرباد گیا
کاپے سانگو رام رام انت انت جیو وام
چھتر پی تی سانگل تلا سگلے راجا ہندوستان

(ایضاً،ص 309)

الف خاں حباب کا ڈراما 'جشن کنور سین' تین ایکٹ اور چوبیس مناظرات پر مبنی ہے۔ اس میں دیو، پری، اور جادو جیسے مافوق الفطرت عناصر سے معمور کہانی ہے اور پورا ڈراما انہی طلسمات کو فتح کرنے پر مرکوز ہے۔ حباب کے دیگر ڈراموں کی طرح اس میں بھی مافوق الفطرت عناصر، مختلف رسوم ورواج، تہوار، لباس اور زبان و بیان میں ہندوستانی عناصر موجود ہیں۔ مثال کے طور پر، دوسرے ایکٹ کے تیسرے منظر میں جادو خانہ کے منظر میں اختر شناس کے ذریعے گانے کا یہ حصہ ملاحظہ کیجیے، جس میں مافوق الفطرت عناصر کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے الفاظ بھی شامل ہیں جو خالص ہندوستانی ہیں:

اختر شناس:

کرپا پل چھن، سامری کی مانے دیو پساج
کپٹ دھروہی جو کرے، بگڑے اس کا کاج
دھیان بچاروں گیان کا، ہنگی کے بھید بتاو
شکر، سنیچر، برہسپت، رکھشا کو آجاو

(ایضاً،ص 377)

اسی طرح مذکورہ ڈرامے میں مختلف قسم کے زیور اور لباسوں کا بھی ذکر موجود ہے، جیسے کہ کنٹھا جو ایک قسم کی مالا یا ہار ہوتا ہے، جو عام طور پر گلے میں پہنا جاتا ہے) اور لنگوٹہ وغیرہ۔ یہ زیور اور لباس ہندوستانی ثقافت اور تہذیب کی جھلک پیش کرتے ہیں اور اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ ڈرامے میں ہندوستانی روزمرہ زندگی کی خوبصورتی اور اس کی روایتوں کو شامل کیا گیا ہے۔

الف خاں حباب کا ڈراما 'جشن کنور سین' تین ایکٹ اور چوبیس مناظرات پر مبنی ہے۔ اس میں دیو، پری، اور جادو جیسے مافوق الفطرت عناصر سے معمور کہانی ہے اور پورا ڈراما انہی طلسمات کو فتح کرنے پر مرکوز ہے۔ حباب کے دیگر ڈراموں کی طرح اس میں بھی مافوق الفطرت عناصر، مختلف رسوم و رواج، تہوار، لباس اور زبان و بیان میں ہندوستانی عناصر موجود ہیں۔

تفصیل سے بیان کردہ ایسے زیور اور لباس نہ صرف کہانی کو حقیقت کے قریب لاتے ہیں بلکہ اس سے اس وقت کی ہندوستانی ثقافت کی اہمیت بھی اجاگر ہوتی ہے۔

سیارہ:

بڑا مارا ہے ہاتھ واہ واہ
میں نے زیور یہ کنٹھا اڑایا
مال اسی کا یہی میرے ہاتھ آیا
بنی کیسی یہ بات واہ واہ
داؤں کپڑوں پہ اس کے لگایا
خالی ایک ہی لنگوٹا بندھایا

(ایضاً،ص 403)

اس ڈرامے میں کرداروں کی زبانی جو مکالمات ادا کرائے گئے ہیں، وہ ان کی شخصیت اور طرز بیان کے عین مطابق ہیں۔ ان میں محاورات بھی شامل ہیں جو ہماری عام بول چال کی زبان میں استعمال ہوتے ہیں اور یہ خالص ہندوستانی ہیں، جو مختلف علاقوں میں بولے جاتے ہیں اور ہماری روزمرہ زندگی کا حصہ ہیں۔

چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

سیارہ: مائی، گٹھلی کی گٹھلی، آم کے آم
عیر ابچی: یعنی؟
سیارہ: کھائے بھینس کی سانی۔ رفیق ٹٹولولولو جنگل کی آبادانی

(ایضاً،ص 405)

ایک دوسری مثال ملاحظہ کیجیے:

''عارف شاہ: آ بچہ سیارہ، تو کہاں؟
سیارہ: قبیلہ وہی مثل ہے کہ 'ناحق چوٹ جلاہا کھائے، تانی چھوڑ تماشے جائے' پرستان کی سیر کیا ہوئی، اک بلائے ناگہانی ہوئی۔'' (ایضاً،ص 412)

ڈراما نگار نے اس ڈرامے کے ایک منظر میں لڑکے، سیارہ اور حنظل جادوگر کے ذریعے کچھ مکالمات ادا کروائے ہیں، جن میں باد بہار کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ موسم بہار میں کس طرح ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں، کالی گھٹائیں چھا جاتی ہیں اور فضا خوشگوار ہو جاتی ہے۔ پتا بھر کر چمن ہرا بھرا دکھایا گیا ہے اور اس پر بہار کی فضا میں کوئل اور بلبل کے چہکنے کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ، ڈراما نگار نے ہندوستان کے مختلف پکوان کا ذکر بھی جا بجا کیا ہے، جیسے کہ روٹی، ترکاری، لڈو، پیڑے، بھوگ موہن برفی، قلیہ، خستہ، کچوری، کباب، رس گلا اور مچھلی وغیرہ۔ مکالمات ملاحظہ کیجیے:

لڑکے: آہا باد بہاری، ٹھنڈی ہوا، کالی گھٹا، پر فضا کیا پر فضا کیا
بوٹی ہری، پتی ہری، ہری بھری کیاریاں، واہ، کیا پیاری واہ کیا پیاری...
آہاہا، ہرا بھرا، چمن ہرا، کوئل و بلبل پکاری باد بہاری...

سیارہ: بچو جی، پان سپاری، روٹی موٹی، گرما گرم گلی، سڑی ترکاری پان سپاری۔
لڈو پیڑے بھوگ موہن برفی۔ قلیہ، حلوا سوہن، خستہ کچوری، روٹی موٹی گرما گرم۔

حنظل جادو:۔ آبو یا و آبو، پان کھابو، راشو گلا کھابو، کباب کھابو، ماش کھابو، آبو آبو۔

(ایضاً،ص 427)

بلاشبہ، پارسی ڈراما نگاروں میں حباب اس عہد کے نہایت باصلاحیت اور منفرد ہنر مندوں میں شمار کیے جاتے ہیں، جنھوں نے ڈرامے کے فن میں نمایاں مقام حاصل کیا، خصوصاً مکالمہ نگاری کے حوالے سے۔ ان کے ڈراموں میں کرداروں کی زبان نہ صرف ان کے طبقاتی پس منظر سے ہم آہنگ ہے بلکہ اس عہد کے معاشرتی ماحول کی حقیقی عکاسی بھی کرتی ہے۔ یہ ایک نمایاں اور انقلابی تبدیلی تھی جو حباب کے فن میں جھلکتی ہے، جس کے ذریعے انھوں نے ڈرامے کی زبان کو مزید حقیقت پسندانہ اور معاشرتی حقائق سے قریب تر بنا دیا۔

■

Dr. Qurratulain
F-9/20, Second Floor
Gali No: 6/4, Zakir Nagar, Okhla
New Delhi- 110025
Mob.: 9810102723
qurratulaintabish@gmail.com

جمیلہ خاتون

ہندوستان کی نوآبادیاتی تاریخ میں

ماحولیاتی استحصال

ماحولیات (Environment) انسان اور فطرت کے باہمی تعلق کا مظہر ہے، جس میں زمین، پانی، ہوا، جنگلات، حیاتیاتی تنوع اور قدرتی وسائل شامل ہیں۔ یہ عناصر نہ صرف انسانی بقا کے ضامن ہیں بلکہ تہذیب، ثقافت اور معاشی نظام کی تشکیل میں بھی بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ قدیم معاشروں میں فطرت کو محض وسائل کے ذخیرے کے طور پر نہیں بلکہ ایک زندہ، مقدس اور باہمی ذمہ داری کے رشتے میں دیکھا جاتا تھا۔ تاہم جدید دور میں، خصوصاً نوآبادیاتی عہد کے آغاز کے ساتھ، انسان اور فطرت کے اس متوازن رشتے میں شدید بگاڑ پیدا ہوا۔

نوآبادیاتی ماحولیاتی استحصال سے مراد وہ منظم اور ریاستی سطح پر کی جانے والی پالیسیاں اور اقدامات ہیں جن کے ذریعے یورپی سامراجی طاقتوں نے اپنی معاشی، صنعتی اور سیاسی ضرورتوں کے لیے مقبوضہ خطوں کے قدرتی وسائل کا بے دریغ استحصال کیا۔ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں نوآبادیاتی اقتدار کا اصل محرک صرف سیاسی غلبہ نہیں تھا بلکہ خام مال کی فراہمی، منڈیوں کی توسیع اور سرمایہ دارانہ نظام کو مضبوط بنانا بھی تھا۔ اس مقصد کے لیے جنگلات کی بے تحاشا کٹائی، زرعی زمینوں کی تجارتی فصلوں میں تبدیلی، کان کنی کا فروغ، آبی وسائل پر قبضہ اور مقامی ماحولیاتی نظام کی تباہی کو دانستہ پالیسی کے طور پر اپنایا گیا۔

نوآبادیاتی طاقتوں نے مقامی علم (Indigenous Knowledge) اور روایتی ماحولیاتی نظم کو پسماندہ اور غیر سائنسی قرار دے کر رد کر دیا، حالانکہ یہی علم صدیوں سے فطرت کے ساتھ ہم آہنگ زندگی کی جز لاینفک تھا۔ جنگلاتی قوانین، آراضی اصلاحات اور محصولات کے نئے نظام نے مقامی آبادیوں کو ان کے قدرتی وسائل سے بے دخل کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف ماحولیاتی توازن بگڑا بلکہ معاشرتی ڈھانچہ بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا، جس کے نتیجے میں غربت، قحط، وباؤں اور سماجی بے چینی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

نوآبادیاتی ماحولیاتی استحصال کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اس نے ترقی کے اس تصور کو فروغ دیا جس میں فطرت کو محض قابلِ استعمال شے سمجھا گیا۔ ریلویز، نہری نظام اور بڑی صنعتوں کی تعمیر بظاہر ترقی کی علامت تھی، مگر درحقیقت اس کا فائدہ سامراجی طاقتوں کو ہوا جبکہ مقامی آبادی ماحولیاتی تباہی اور معاشی عدم تحفظ کا شکار رہی۔ اس طرح نوآبادیاتی عہد نے ماحولیاتی ناانصافی (Environmental Injustice) کی ایسی بنیاد رکھی جس کے اثرات آج بھی سابق نوآبادیاتی معاشروں میں محسوس کیے جا سکتے ہیں۔

لہٰذا ماحولیات اور نوآبادیاتی ماحولیاتی استحصال کا مطالعہ محض ماضی کا جائزہ نہیں بلکہ موجودہ ماحولیاتی بحرانوں کی جڑوں کو سمجھنے کی ایک سنجیدہ کوشش ہے۔ یہ مطالعہ ہمیں یہ شعور دیتا ہے کہ موجودہ عالمی ماحولیاتی مسائل، جیسے موسمیاتی تبدیلی، حیاتیاتی تنوع کی کمی اور وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم، دراصل نوآبادیاتی دور کی پالیسیوں اور سوچ کا تسلسل ہیں۔ اسی تناظر میں، اس موضوع کی تمہید تحقیق، تنقید اور متبادل ماحولیاتی فکر کے لیے ایک مضبوط فکری بنیاد فراہم کرتی ہے۔

ہندوستان کی نوآبادیاتی تاریخ میں ماحولیاتی عوامل کا کردار اہم رہا ہے۔ برصغیر پر برطانوی تسلط کے دوران قدرتی وسائل اور ماحولیات پر شدید اثرات مرتب ہوئے۔ برطانوی راج نے اپنی اقتصادی اور صنعتی ضروریات کے لیے ہندوستان کی زمین، جنگلات، پانی اور کانوں کا بے دریغ استحصال کیا۔ سب سے پہلے جنگلات کا ذکر ضروری ہے۔ برصغیر کے گھنے جنگلات کو تجارتی مقاصد کے لیے کاٹا گیا، خاص طور پر لکڑی کی صنعت اور ریلوے کی ترقی کے لیے۔ اس کا نتیجہ نہ صرف جنگلی حیات کے معدوم ہونے کی صورت میں سامنے آیا بلکہ زمین کی زرخیزی اور مقامی ماحولیات بھی متاثر ہوئی۔ زمین کے زمینداری اور زرعی نظام پر بھی نوآبادیاتی پالیسیوں کا اثر پڑا۔ کسانوں کو مالی فائدے کی بجائے برطانوی مقاصد کے لیے فصلیں اگانے پر مجبور کیا گیا، جس سے مقامی غذائی پیداوار کم ہوئی اور زمین کا قدرتی توازن بگڑ گیا۔ خاص طور پر کپاس اور چائے کی فصلیں اس کا شکار رہیں، جس سے نہ صرف ماحولیاتی استحصال ہوا بلکہ مقامی لوگوں کی معیشت بھی متاثر ہوئی۔ کان کنی اور صنعتی سرگرمیوں نے بھی ماحولیات پر منفی اثرات ڈالے۔ لوہے اور کوئلے کی کانیں نہ صرف زمین کو نقصان پہنچاتی تھیں بلکہ پانی اور ہوا کی آلودگی کا سبب بھی بنیں۔ اس طرح کی سرگرمیوں نے مقامی ماحول اور انسانی زندگی دونوں پر اثرات مرتب کیے۔ پانی کے وسائل پر بھی قابو پایا گیا۔ نہروں، جھیلوں اور دریاؤں کے پانی کو صنعتی اور زرعی استعمال کے لیے ہموار کیا گیا، جس سے عوامی طبقے کے لیے پانی کی قلت پیدا ہوئی اور ماحولیاتی نظام بگڑ گیا۔

یہ سب عوامل مجموعی طور پر نوآبادیاتی ماحولیاتی استحصال کی صورت میں سامنے آئے، جس نے ہندستان میں عوامی بے چینی، مقامی مزاحمت اور آزادی کی تحریک کو ایک نئے تناظر میں مستحکم کیا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ برطانوی ماحولیاتی استحصال نے لوگوں میں نہ صرف اقتصادی اور سماجی بدحالی پیدا کی بلکہ انھیں قدرتی وسائل کے تحفظ اور ماحولیات کے مسائل پر بھی حساس بنایا، جس نے آزادی کی تحریک میں ماحولیاتی شعور کے ساتھ مزاحمت کو فروغ دیا۔

نوآبادیاتی دور میں برصغیر کے کسانوں پر سخت دباؤ رہا، اور ان کی زندگی میں زرعی بحران ایک عام منظر

بن گیا۔ برطانوی راج نے مقامی کسانوں کو اپنی اقتصادی پالیسیوں کے مطابق فصلیں اگانے پر مجبور کیا، جیسے کہ کپاس، چائے اور افیون، تاکہ برطانوی مارکیٹ کے لیے خام مال کی فراہمی ممکن ہو۔ اس کے نتیجے میں ضروری خوراک کی پیداوار کم ہوئی اور مقامی معاشروں میں غذائی قلت پیدا ہوئی۔ زمین کی بے تحاشہ کٹائی، جنگلات کی کمی اور قدرتی وسائل کا غلط استعمال زمین کی زرخیزی کو متاثر کرنے والا سب سے بڑا سبب تھا۔

کسان کم زرخیز زمین پر بھی فصلیں اگانے پر مجبور تھے، جس سے پیداوار میں کمی اور زمین کی صحت خراب ہوئی۔ اس کا براہ راست اثر مقامی غذائی تحفظ پر پڑا اور معاشرتی عدم استحکام میں اضافہ ہوا۔ قحط اور بھوک بھی نوآبادیاتی پالیسیوں کا لازمی نتیجہ بن گئے۔ جب خشک سالی یا دیگر قدرتی آفات آئیں، تو مقامی کسانوں کے پاس اپنی فصلیں محفوظ کرنے یا بنیادی غذائی ضروریات پوری کرنے کے وسائل نہیں تھے۔ برطانوی حکمران زیادہ تر غذائی ذخائر اور پانی صنعتی اور تجارتی منصوبوں کے لیے استعمال کرتے رہے، جس سے عوامی طبقے شدید قحط کا شکار ہوئے۔

اسی دوران کسانوں پر بھاری محصول اور ٹیکس بھی عائد کیے گئے، جو زرعی بحران کو مزید شدید کرتے گئے۔ کئی علاقوں میں قحط نے انسانی زندگی کو تباہی کی جانب دھکیل دیا، ہزاروں لوگ ہلاک ہوئے اور کئی نے اپنی زمینیں ترک کر دیں۔ اس طرح زرعی بحران اور قحط نہ صرف ماحولیاتی استحصال کی ایک علامت تھے بلکہ آزادی کی تحریک کے سماجی اور اقتصادی پس منظر کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔

● **جنگلاتی قوانین اور مقامی قبائل پر اثرات:** برطانوی حکومت نے ہندوستان کے قدرتی وسائل، خصوصاً جنگلات، پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے مختلف جابرانہ قوانین وضع کیے۔ انیسویں صدی کے وسط اور اواخر میں نافذ ہونے والے 'جنگلاتی قوانین' (Forest Acts) کے ذریعے مقامی قبائل اور دیہی عوام کی صدیوں پرانی رسائی کو محدود کر دیا گیا۔ وہ قبائلی معاشرے جن کی روایتی زندگی ثقافت اور معیشت کا مکمل دارومدار ان جنگلاتی وسائل پر تھا۔ برطانوی قوانین نے انھیں اپنے ہی وطن میں اجنبی بنا دیا۔ برطانوی مقاصد کے لیے جنگلات کی کٹائی اور تجارتی استحصال کو قانونی تحفظ حاصل ہو گیا، جبکہ قبائلی حقوق پامال ہوتے گئے۔ اس کے نتیجے میں قبائل کو نہ صرف معیشت بلکہ ثقافتی اور سماجی سطح پر بھی نقصان پہنچا۔

● **مقامی مزاحمت اور ماحولیاتی شعور:** ان استحصالی قوانین کے خلاف مقامی سطح پر شدید ردعمل سامنے آیا۔ قبائلی قیادت نے برطانوی حکام کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور اپنی زمین، جنگلات اور آزادی کے تحفظ کے لیے مسلح تصادم سے بھی تحریز نہیں کیا۔ یہ قبائلی جدوجہد محض سیاسی نہیں تھی، بلکہ اس میں ماحولیاتی انصاف، کا گہرا شعور پوشیدہ تھا۔ یہ تحریکیں اس حقیقت کا ثبوت تھیں کہ نوآبادیاتی دور کی ناانصافیاں صرف معاشی سطح تک محدود نہیں تھیں، بلکہ انھوں نے مقامی ماحولیاتی نظام اور فطری بقا کو بھی خطرے میں ڈال دیا تھا۔ یہی ماحولیاتی شعور آگے چل کر تحریک آزادی ہند کا ایک اہم جزو بن کر ابھرا، جس نے عوام کو اپنے قدرتی وسائل کے تحفظ کے لیے بیدار کیا۔

نوآبادیاتی دور میں کسانوں پر بھاری محصولات اور زمین کے غلط استعمال کے اثرات کے نتیجے میں معاشرتی اور ماحولیاتی ناانصافیاں واضح طور پر نظر آئیں۔ برطانوی حکومت نے کسانوں کو اپنی اقتصادی ترجیحات کے لیے مجبور کیا، جیسے غیر ضروری فصلیں اگانا، زمین کی زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنا، اور قدرتی وسائل کو تجارتی مقاصد کے لیے استعمال کرنا۔ اس کے نتیجے میں نہ صرف زرعی بحران اور قحط کے واقعات بڑھ گئے بلکہ زمین اور پانی کی زرخیزی بھی متاثر ہوئی۔ ان ماحولیاتی ناانصافیوں کے خلاف کسانوں نے کئی تحریکیں چلائیں۔ ان تحریکوں کا مقصد نہ صرف اقتصادی و مالی انصاف حاصل کرنا تھا بلکہ مقامی ماحول اور قدرتی وسائل کے تحفظ کا شعور بھی پیدا کرنا تھا۔ مثال کے طور پر، بنگال، مہاراشٹر، بہار اور مدھیہ پردیش میں کسانوں نے برطانوی محصولاتی نظام، زمین کی زیادہ کٹائی اور پانی کے غیر منصفانہ استعمال کے خلاف احتجاج کیا۔ یہ تحریکیں اکثر مقامی وسائل کے تحفظ سے جڑی ہوئی تھیں۔ کسانوں نے زمین کی غیر مناسب تقسیم، جنگلات کی کٹائی، پانی کی قلت اور دیگر ماحولیاتی استحصال کے خلاف احتجاج کیا۔ بعض علاقوں میں یہ تحریکیں مسلح مزاحمت کی شکل اختیار کر گئیں، جبکہ دیگر میں پرامن مظاہروں اور احتجاجات کے ذریعے برطانوی حکام پر دباؤ ڈالا گیا۔

نتیجتاً، کسان تحریکیں نہ صرف آزادی کی تحریک کا حصہ بنیں بلکہ یہ ماحولیاتی شعور اور مقامی کمیونٹی کے حقوق کے تحفظ کی ایک علامت بھی بنیں۔ یہ تحریکیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ نوآبادیاتی دور میں ماحولیاتی ناانصافیاں صرف اقتصادی اور سماجی سطح تک محدود نہیں تھیں، بلکہ انھوں نے لوگوں کو قدرتی وسائل کے تحفظ اور مقامی ماحول کے تحفظ کی ضرورت سے بھی آگاہ کیا۔

● **قحط، وبائی امراض اور نوآبادیاتی پالیسیاں:** نوآبادیاتی عہد میں ہندوستان کے عوام پر قحط اور وبائی امراض کا شدید اثر رہا۔ برطانوی حکومت کی اقتصادی اور زرعی پالیسیوں نے زمین، پانی، اور غذائی پیداوار پر سخت دباؤ ڈالا، جس سے کئی علاقوں میں قحط پڑا۔ قحط کی شدت نے انسانی زندگی کو تباہ کن شکل دی، ہزاروں لوگ بھوک اور بیماریوں کی وجہ سے ہلاک ہوئے، اور مقامی معیشت بری طرح متاثر ہوئی۔ اس دوران وبائی امراض جیسے چیچک، کولرا اور ملیریا نے بھی لوگوں کی زندگی مزید مشکل بنا دی۔ پانی اور خوراک کی قلت، کمزور جسمانی صحت، اور ناکافی طبی سہولتیں وبائی امراض کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کر رہی تھیں۔ برطانوی انتظامیہ کی توجہ زیادہ تر اپنے تجارتی اور سیاسی مفادات پر مرکوز تھی، جس سے عوام کو حفاظتی اقدامات اور طبی امداد میں شدید کمی کا سامنا کرنا پڑا۔

● **عوامی شعور اور بقا کی جدوجہد:** ان کٹھن حالات میں مقامی سطح پر عوامی شعور کی ایک نئی لہر پیدا ہوئی، لوگوں نے اپنی بقا کے لیے قدرتی وسائل اور خوراک کے تحفظ کی اہمیت کو محسوس کرنا شروع کیا۔ مقامی گروپوں (Communities) نے مشترکہ نظم وضبط، خوراک کی بچت اور پانی کے بہتر انتظام کے لیے باہمی امداد کے طریقے اپنائے۔ کئی مقامات پر یہ شعور کسان تحریکوں اور قبائلی مزاحمت کی صورت میں ابھرا، کیونکہ لوگ سمجھ گئے تھے کہ قدرتی وسائل کی کمی اور استحصال براہ راست انسانی زندگی پر اثر انداز ہو رہا ہے۔

اس طرح، قحط اور وبائی امراض نے نہ صرف عوامی زندگی کو متاثر کیا بلکہ لوگوں میں معاشرتی اور ماحولیاتی شعور بھی پیدا کیا۔ ایک ایسا سیاسی اور معاشرتی شعور جو آگے چل کر حق خودارادیت کی بنیاد بنا۔

■

Jameela Khatoon
Research Scholar
RTM Nagpur University Nagpur
H.No.W/260A Near Sufi Nagar Masjid Bhoiline
Kalamna Road KAMPTEE-441001
Mob.: 8055195885
E-mail: jk08june@gmail.com

خلیق الزماں نصرت

گمنام فلمی نغمہ نگار

1931 میں جب پہلی بولتی فلم عالم آرا بنی تو اس سے پہلے کے فنکار ہی اس میں ایکٹنگ کرتے تھے اور گانے بھی گاتے تھے ہم نے اس سے قبل ایک خاص بات یہ بھی بتائی تھی کہ بولتی فلموں کے بھی ابتدائی دور میں کئی فلموں کے ہیرو اور ہیروئن ہی اپنے نغموں کو گاتے بھی تھے۔ جو بھی نغمہ نگار تھے وہ میوزک ڈائرکٹر کے ماتحت ہوا کرتے تھے ان کی رقم میوزک ڈائرکٹر کو دی جاتی تھی اب یہ میوزک ڈائریکٹر کی مرضی پر ہوتا تھا کہ اس میں سے وہ شاعر کو کتنا دیتا ہے۔ اس زمانے میں ان کی حالت اچھی نہیں ہوا کرتی تھی ان کو منشی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ان کا کام جز وقتی بھی ہوتا تھا اور کل وقتی بھی۔ لیکن یہ آہستہ آہستہ بدل گیا ایک وقت ایسا بھی آ گیا جس میں ہر نغمہ نگار اپنی رقم پروڈیوسر سے خود طے کرتا تھا اگر وہ راضی ہو جائے تو ہی وہ اس میں نغمے لکھتا تھا۔ فلمی نغموں نے لوگوں کے دلوں پر گہرا اثر چھوڑا ہے کچھ گانے ایسے مقبول ہوئے کہ انھیں سننے کے بعد لوگ سرشار ہو جاتے تھے اور آج بھی وہ نغمے ہر دل عزیز اور مقبول عام ہیں۔ نغمہ موسیقی کی بہار آفریں کیفیت نے لوگوں کو کئی بار فلم دیکھنے پر مجبور کیا۔ فلم کے نغمات کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے میں ریڈیو، ریکارڈ پلیئر، کیسٹ اور بعد میں سی ڈی وی ڈی، ٹی۔ وی نے بڑا رول ادا کیا۔ اب میں اپنے موضوع کی طرف آتا ہوں۔ بولتی فلموں میں ادب کے کچھ بڑے شعرا نے بھی نغمے لکھے ہیں وہ میں کبھی آپ کے سامنے رکھوں گا۔ انھی میں سے ابراہیم فیض پونہ کے رہنے والے تھے کا بھی نام آتا ہے۔ ادب میں اچھا مقام تھا لیکن فلم شاید ایک ہی مل پائی جس کا نام راستے اور منزل 1968 تھا اس فلم میں رام کدم کی میوزک سے سجے ہوئے نغمے محمد رفیع کی آواز میں تھے۔ چلتے چلتے ہو گئی غم کی رات۔ اب تو میری ناکام امیدوں پل دو پل کے ساتھ۔ غم کے سہارے دن بیتے ہیں۔ آس لیے پھر بھی جیتے ہیں۔ ختم ہوا اب تو دکھی چھتا۔ چلتے چلتے ہو گئی غم کی رات۔ ایک دوسرا نغمہ میں۔ بہت دور بہت دور چلا آیا ہوں۔ تیری محفل تیرے جلوے مری تقدیر کہاں۔ میری قسمت میں تری زلف کی زنجیر کہاں۔ میرے ہمدم میرے بکھرے ہوئے خوابوں کی قسم۔ میری قسمت میں ترے حسن کی جاگیر کہاں۔ میں بہت دور بہت دور چلا یا آیا ہوں اونچے نیچے راستے اور منزل تیری دور۔ راہ میں راہی رک نہ جانا ہو کر کے مجبور۔ اونچے نیچے راستے اور منزل تیری دور۔ یہ ہماری زندگی کا اک لمبا سفر ہی تو ہے۔ چلتے ہیں جس پہ ہم انجانی ڈگر ہی تو ہے۔ دیکھ سنبھلنا بچ کے نکلنا جو نہیں چلتے دیکھ کے آگے وہ کرتے ہیں بھول۔ ایسی تخلیقات سے شعر کا لطف خوب ملتا ہے مگر ابراہیم فیض فلم میں زیادہ دن چل نہیں سکے یہ عام فہم شاعری نہیں تھی۔ غالباً ان کی پہلی اور آخری فلم تھی فلموں میں پہلے نغمے لکھے جاتے تھے اس کے بعد میوزک بنتی تھی لیکن اب پہلے میوزک جس کو دھن کہتے ہیں اور پھر بعد میں نغمے لکھے جاتے ہیں۔ زیادہ تر میوزک والے اردو کے نہیں رہتے ہیں اس لیے وہ زبان کی خوبیوں کو اچھی طرح سمجھ نہیں پاتے تھے۔ اور بیچارے نغمہ نگاروں کو ہی بدلنے پر مجبور کیا کرتے ہیں اپنی تخلیقات کی اس طرح کی تبدیلی ہر کوئی برداشت نہیں کرتا ہے، اس لیے تو علامہ جمیل مظہری، جوش ملیح آبادی اور جگر آئے لیکن فلم والوں سے سمجھوتہ نہیں کر پائے۔ اردو ادب کے ایک مشہور شاعر ساغر نظامی بھی تھے جو پونا میں رہ کر فلموں کے نغمے لکھا کرتے تھے۔ ان کے زمانے میں بہت سی فلمی کمپنیاں وہیں تھیں۔ فلموں میں ساغر کب آئے اور کب گئے فلم والوں کو پتہ نہیں چلا۔

ساغر نظامی کے چند اشعار اردو شاعری میں بہت مشہور ہیں۔

کافر گیسو والوں کی رات بسر یوں ہوتی ہے
حسن حفاظت کرتا ہے اور جوانی سوتی ہے

دشت میں قیس نہیں کوہ پہ فرہاد نہیں
ہے وہی عشق کی دنیا مگر آباد نہیں

یہ میکدہ ہے ترا مدرسہ نہیں واعظ
یہاں شراب سے انساں بنائے جاتے ہیں

صمد یار خاں ساغر نظامی 12 دسمبر 1905 کو علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ طالب علمی کے زمانے سے ایک طرف انھیں شعر و ادب سے دلچسپی تھی تو دوسری طرف سیاست سے۔ دونوں کو ملا کر ساغر نے اپنی زندگی بسر کی، فلموں میں گیت لکھے مگر نا کامیاب رہے۔ یہاں سے دلی گئے اور اثر و رسوخ سے آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہو گئے۔ اب ان کی فلمی شاعری دیکھ لیں رشید انجم نے اپنی کتاب میں فلم لاج کے دس گیتوں کا ذکر کیا ہے جس کے مکھڑے اس طرح کے ہیں وہ ساغر نظامی

کے لکھے ہوئے ہیں

(1) اک رات محبت کرلے۔ دنیا پہ حکومت کرلے۔ (2) سکھ کا رنگ محل ہے، رنگ محل ہے دنیا۔ (3) دکھ کی اس نگری میں بابا کوئی نہ پوچھو بات۔ (4) نئی دنیا بسالے سجنی اس گھر کو بسائے سجنی۔ (5) چھائی ہوئی دنیا پر ابھی رات ہے سو جا۔ (6) کیا ساتھ ہمارا ان کا مسرور ہے دنیا۔ (7) پی اور پلا، دل سے مٹا غم کی نشانی۔ (8) وہ ہم سے جو روٹھے، ناراض زمانہ ہے۔ (9) جوت سے جوت جلاتی آئی، آئی دیوالی آئی۔ (10) اب ہم سے جدا مت ہونا، گردش کے زمانے بیتے۔ ابھی تک ان نغموں کا پورا حصہ حاصل نہیں ہوا ہے کتاب شائع ہوتے تک ممکن ہے مل جائے۔

فلم کھیل سجاد حسین کی میوزک ڈائریکشن میں لتا کا گایا ہوا یہ نغمہ۔ جاتے ہو تو جاؤ ہم بھی یہاں وعدوں کے سہارے جی لیں گے۔ خود دے کے کسی کو دل اپنا کچھ کھیل نہیں جینا لیکن۔ گھٹ گھٹ کے سہی مر مر کے سہی۔ جیسے بھی بنے گا جی لیں گے۔ رسوا نہ کریں گے ہم تم کو سینے سے لگا لیں گے غم کو۔ ٹوٹے جو کبھی دل کے آنسو ہم دل ہی دل میں سی لیں گے۔ سینے میں لگا کر یادوں کو خاموش رہیں گے راتوں کو۔ شکوے جو زباں پر آئے کبھی ہونٹوں سے زباں کو سی لیں گے۔

کیف عرفانی

نام موہن مورتی تھا، شعری نام کیف عرفانی۔ ان کی پیدائش تحصیل بھالیہ پاکستان میں 1914 میں ہوئی۔ ان کے دو شعری مجموعے شائع ہوئے۔ ترقی پسند تحریک کا اثر ان کی شاعری میں ہے۔ اردو کے دلدادہ تھے۔ ان کے کئی شاگرد تھے۔ موت 1 ستمبر 1965 کو دہلی میں ہوئی۔ فلم ملہار 1951 مکیش کی آواز، اور روشن کی میوزک میں یہ نغمہ۔

دل تجھے دے دیا تھا رکھنے کو تو نے دل کو جلا کر رکھ دیا۔ قسمت نے دے کے پیار مجھے میرا دل تڑپا کے رکھ دیا۔ بھنورے کے لبوں پر فریادیں، کلیوں کے لبوں پر مسکانیں۔ بھنورے کا کلیجہ کلیوں میں ہائے کس نے چھپا کر رکھ دیا۔

فلم ترانہ 1951 میں دلیپ کمار پر یہ نغمہ فلمایا گیا جس کو طلعت محمود نے گایا تھا اس کی موسیقی انل بسواس کی تھی۔ جلی جو شاخ چمن کے ساتھ باغباں بھی جلا۔ جلا کے میرے نشیمن کو آسماں بھی جلا۔ ایک میں ہوں ایک میری بے کسی کی شام ہے۔ اب تو تجھ بن زندگی بھی مجھ پہ اک الزام ہے۔ فلم راگ رنگ 1952 روشن کے سنگیت میں کیف عرفانی کی یہ غزل جسے لتا اور طلعت محمود نے گایا تھا۔ اس کی شعریت بھی دیکھتے چلیں۔ ہر نئی رات نیا درد لیے آتی ہے۔ نیند آنکھوں سے بہت دور ہوئی جاتی ہے۔ مت چھیڑ زندگی کے خاموش تار سو جا۔ دل بے قرار سو جا دل بے قرار سو جا۔

ہنس راج بہل کی فلم مانو نہ مانو میں مکیش کی موسیقی۔ چھپ کر نظر سے دیکھ لے۔ تم چھپ نہ سکتے کہیں۔ ہر روپ میں اک سائے کے میں ساتھ ہی لہراؤں گا۔ فلم انوراگ 1956 میں مکیش کی آواز میں یہ نغمہ۔ کوئی دل میں ہے کوئی ہے نظر میں۔ محبت کی سپنے میں کس پہ لٹاؤں۔ اسی کشمکش میں جیے جا رہا ہوں۔ کسے یاد رکھوں کسے بھول جاؤں۔ اس میں ادب کی چاشنی ہے۔

جلال ملیح آبادی کی فلم روڈ تو سکم 1969 میں ایک نغمہ مکیش کی آواز میں موسیقی وجے سنگھ جی کی۔ تم جہاں ہو وہاں کیا یہ موسم نہیں۔ کیا نظارے وہاں مسکراتے نہیں۔ یہ زمانہ ہمیشہ کا بے درد ہے۔ درد دل پہ کوئی ہاتھ دھرتا نہیں۔ دل کی فطرت کبھی ایک رہتی نہیں۔ زندگی بھر وفا کوئی کرتا نہیں۔

دوسرا نغمہ ہے۔ انداز تو اچھا ہے مگر.....ایسے شاعروں کا فلمی دنیا میں نام نہیں آتا ہے پھر بھی یہ نغمہ جب بھی دہرایا جائے گا داد حاصل کرے گا۔ ایسی حالت میں صرف مکیش کا ہی نام آئے گا جلال ملیح آبادی کا نہیں۔

اس فلم کے دوسرے گیت کار حسرت جے پوری اور اندیور تھے..

نور دیوا سی فلم بس کنڈکٹر 1957 میں موسیقی پن بابو۔ محمد رفیع اور آشا کی آواز میں پریم ناتھ اور شیاما پر فلمایا گیا۔ زندگی میں رنگ بھرا ہے پیار کا۔ آیا ہے وقت اب بہار کا۔ بن کے کسک دل میں صنم آ گئے۔ تیر نظر دل پہ چھا گئے۔ کیا انداز ہے سرکار کا 2۔ پاس ہمارے آیئے اجی دور سے نہ جایئے۔ یاد میں تیری رات رات بھر دل سے نہ نکلے ہائے۔ 3۔ من میں تیرے کیا ہے بتا دے گوری۔ پیار کا ایک نشہ ہے یہ سن لے گوری۔ نظریں لڑ گئیں اس رسیا سے۔ من کی کہہ من بتیا سے۔ کون وہ بہروپیا ہے 4۔ دل سے میں مجھ سے دل ٹکرا گیا۔ اک نیا پن زندگی میں آ گیا۔ آتی جاتی سانس بھی چنچل سی ہے۔ سر سے پاؤں تک نئی ہلچل سی ہے۔ بات کیا ہے کیوں یہ دل گھبرا گیا۔ دل سے میں مجھ سے دل ٹکرا گیا۔ اب آیئے آپ کو ایک ایسے نغمہ نگار کا نام بتائیں گے جو ہر فن مولا تھے ان کا نام کیدار شرما تھا۔ فلم کے وہ ڈائرکٹر بھی تھے پوسٹر بناتے تھے ہیرو بھی تھے فلموں میں میوزک بھی دیا کرتے تھے۔ 12 اپریل 1910 کو پنجاب کے نرول میں پیدا ہوئے جو ابھی پاکستان کے قبضے میں ہے۔ پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا کالج کے زمانے سے ہی ڈرامے اور شاعری کا شوق پیدا ہو گیا۔ پہلے فلم میں کام کرنے کے لیے کلکتہ گئے۔ فلم میں مصنف اور گیت کار کے طور پر کام شروع کیا۔ نیو تھیٹرز کی فلم افٹر دی ارتھ کیوک 1935 ملینیئر 1936 اناتھ آشرم 1937 بڑی دیدی دی رائز سپیر 1939 اور کئی فلموں میں تنخواہ پہ کام کیا۔ ان کی بے شمار فلمیں ہیں لیکن طوالت کے خوف سے میں سبھوں کا ذکر نہیں کر پاؤں گا۔ کلکتہ سے ممبئی آ گئے۔ مزاج کے بہت سخت تھے ان کے ڈھیر سارے واقعات ہم نے پڑھے ہیں آج کے زمانے میں ان واقعات کو سننے کے بعد تعجب ہوتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں مزاج کے بہت سخت تھے اور اصول کے بڑے پابند تھے ذرا بھی کوئی غلطی کرتا تھا تو اس کو ڈانٹ دیتے تھے فلم ڈائریکشن میں راج کپور جب ان کے اسسٹنٹ تھے تو انھوں نے ایک موقع پر راج کپور کو تھپڑ مار دیا تھا فلم ہماری یاد آئے گی کہ سیٹ پر ایسا ہوا تھا۔ فلم نیل کمل میں راج کپور کو پہلی بار انھوں نے موقع دیا تھا اس فلم میں مدھوبالا ہیروئن تھی اسی طرح ہماری یاد آئے گی کی شوٹنگ میں تنوجہ کو بھی ایک تھپڑ رسید کر دیا تھا لیکن ان فلم اسٹار کو اپنے استاد کی مار بھی اچھی لگی کیونکہ انھیں کچھ سیکھنا تھا۔ اب آیئے ان کے نغموں کی باتیں کریں۔ ان کا نام کیدار شرما تھا ایک کا ایک مشہور نغمہ فلم زندگی 1940 میں کا پڑھ لیں۔ میں کیا جانوں کیا جادو ہے جادو ہے.. سہگل کی آواز اس فلم میں تھی۔ 1950 میں باورے نین بنی مکیش اور گیتا دت کی آواز کا یہ نغمہ کافی مشہور ہوا جو آج بھی لوگوں کے دلوں پر راج کر رہا ہے۔۔۔ خیالوں میں کسی کے اس طرح آیا نہیں کرتے۔ کسی کو بے وفا آ آ کے تڑپایا نہیں کرتے۔ ہماری یاد آئے گی فلم میں سنہ بھاٹکر کی میوزک تھی اس گیت کو مکیش نے گایا تھا کیدار ناتھ شرما کے نغموں نے بہت دھوم مچائی تھی۔ آج بھی ایسے نغمے کو سن کر فرحت محسوس ہوتا

ہے۔آنکھوں میں تیری یاد لیے جا رہا ہوں میں ۔دل سے تمہیں دعائیں دیے جا رہا ہوں میں۔بھولے بھی تم بھلا بھی دیا تم نے پیار کو۔دن رات تم کو یاد کیے جا رہا ہوں میں۔فلم ہمیں 1949 میں مکیش کا گایا ہوا یہ گیت، بی جی بھاکر کی میوزک سے سجایا گیا یہ نغمہ پڑھ لیں۔بھگوان جو تیرا بھی بھگوان کوئی ہوتا۔ہم دیکھتے پھر کیوں کر آرام سے تو سوتا۔۔۔کیا جانے مزہ درد کا بے درد بھلا تو۔دل ہوتا تیرے پاس تو پھر درد بھی ہوتا۔۔فلم کا یہ نغمہ تیری دنیا میں جی لگتا نہیں واپس بلا لے میں سجدے میں گرا ہوں مجھ کو اے مالک اٹھا لے۔بہار آئی تھی قسمت میں مگر یہ گل کھلایا۔جلایا آشیاں صیاد نے پھر نوچ ڈالے۔مجھ کو اے مالک اٹھا لے۔۔۔۔اسی طرح دو بند اور ہیں۔فلم بارہ دری 1951 جو اس زمانے کی کامیاب فلم تھی شنکر جے کشن کی موسیقی میں مکیش کی آواز کا یہ گیت۔دل نے تو دیا دھوکا محبت نے سزا دی۔روتی ہوئی آنکھوں نے ہنسی غم کی اڑا دی۔دل نے تو دیا۔۔۔بربادِ نشیمن ہو تو میری بلا سے۔دنیا جو بسائی تھی وہ دنیا ہی مٹا دی۔دل نے تو دیا دھوکا۔۔فلم بھرا 1946 سہگل کی آواز اور کھیم چند پرکاش کی موسیقی میں یہ نغمہ۔ٹھکرا رہی ہے دنیا ہم ہیں کہ سو رہے ہیں۔1964 فلم فریاد سنہل بھاٹکر کی موسیقی اور سمن کلیان پور کی آواز میں یہ نغمہ۔۔حال دل ان کو سنانا تھا سنایا نہ گیا جو زباں پر مجھے لانا تھا بتایا نہ گیا۔۔۔

عزیز کاشمیری فلم ایک تھی لڑکی 1950 شیام سندر کی سنگیت میں لتا کی آواز کا یہ گیت۔اک پل رک جانا سرکار نہ مارو دو نینا کی مار۔جھوٹے تم ہو تمہارا پیار کہ ایک پل ہٹ جانا سرکار۔کٹ چلے ہمیں تڑپا کے اک رنگ نیا دکھلا کے۔اب اور سہارا ڈھونڈیں چل کر نیا دوار۔ڈھونڈے کہ اب تو ہو گئے ہیں بے کار۔۔اس فلم میں مزاح کا انداز ہے۔ضرورت کے مطابق اس گیت کو لکھا گیا ہوگا۔مزاحیہ فلموں کی لسٹ میں ہے اس لیے بھی اس میں تک بندی جیسا انداز ہے۔اس کو مینا شوری نے اس زمانے کی جدید موسیقی میں گایا تھا لارا لپا لارا لپا لائی رکھدا۔جی تیا اجی لائی رکھدا بابو جی کی بات نرالی دل بھی خالی جیب بھی خالی پھر بھی اکڑ دکھائے کچھ سمجھ میں سمجھ نہ آئے۔

عیش کنول اردو کے اچھے شاعران کا نام سید عثمان علی تھا وہ 1940 میں بیجاپور کرناٹک میں پیدا ہوئے ان کے والد ممبئی آئے اور چھوٹے موٹے کام کر کے اپنی زندگی بسر کرنے لگے پھر وہ قصائی وارہ کرلا میں آکر بس گئے۔معروف افسانہ نگار اشتیاق سعید نے ایک مکمل مضمون عیش کنول کے بارے میں لکھا ہے۔میں نے اس سے استفادہ کیا ہے۔شاعری کے لیے بڑی محنت کی اور سماجی خدمت کے لیے بھی بہت وقت دیا کرتے تھے خاص کر جب کسی کی موت ہو جاتی تھی تو اس کے بعد کے تمام کام بڑے شوق سے کرتے تھے۔کئی سال فلموں کے چکر کاٹنے میں لگ گئے۔چند اردو کے شاعر جو ممبئی کے تھے وہی ان کو جانتے تھے۔پہلے انھوں نے ایک چھوٹے موٹے میوزک ڈائرکٹر ستار خاں کے ساتھ رہ کر گانے لکھنے کے طریقے سیکھے۔ان کا پہلا نغمہ فلم پٹھان میں تھا جس کے بول تھے۔چاند میرا بادلوں میں کھو گیا۔میری دنیا میں اندھیرا ہو گیا۔اس کے تیور کو ڈائرکٹروں اور پروڈیوسر نے بھی پسند کیا۔فلم سنگرام 1965 میں ان کا یہ نغمہ بڑے چرچے میں رہا...میں تو ترے حسین خیالوں میں کھو گیا۔دنیا یہ کہہ رہی ہے کہ دیوانہ ہو گیا۔اس گانے کو محمد رفیع نے گایا تھا۔2۔ڈم ڈم ڈمرو باجے تھاپ ڈھول کی تا تھیا۔میں تو ناچوں سجنوا۔چاند کے رتھ پر بیٹھ کے آئی میں کرنوں کی رانی۔میں کرنوں کی رانی اوڑھ کر آئی چندریا دھانی ۔سیپ کے جیسے موتی نکلے ایسی مری جوانی ۔اس گیت کو کمل باروٹ اور لتا منگیشکر کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا۔فلم سنگرام میں ان کے دگر نغمے کے بول اس طرح ہیں۔مستی میں ڈولے جیا کیسا یہ جادو کیا..نکلا سیاں چال باز دے کے دغا مجھ کو چلا گیا۔فلم عرب کا سونا 1979۔پھسلے نہ پاؤں تیرا چکنا ہے رستہ۔نظریں ملا کے چل۔میں ایک شمع ہوں سنو پتنگے۔نہ میری چاہت میں جل۔دیگر گیت کے مکھڑے آپ پڑھ لیں۔1 غفلت میں سونے والے رب نے تمہیں پکارا2 دیکھیے آج محفل میں ہم تو ہو کے بن داشت آئے ہوئے ہیں 3 جو تو آئی ہمارے گھر میں 4 جانے تیری باتوں میں جادو۔۔۔اس فلم کے ڈائرکٹر تھے سی کے قادر۔فلم ابو کالیہ 1979 عیش کنول پانچ نغمے لکھے۔جانے تیری باتوں میں کیسا یہ جادو ہے صنم۔گیا دل ہاتھوں سے میرا ابھی اللہ رے قسم۔ایک دوسرا نغمہ۔نیکی اور بدی سب کی اک دن تولی جائے گی۔پاپ اور پنیا کی پٹنگ سب کی ایک دن کھولی جائے گی۔یہ نغمہ نتن مکیش کی آواز میں ہے۔فلم مندر مسجد جس کے میوزک ڈائرکٹر شاردا اور اس کے ڈائرکٹر حسین تھے اس میں بھی ان کے نغمہ کو محمد رفیع اور جانی بابو نے آواز دی تھی۔۔۔ہم تم پر مرمٹیں گے تم کو خبر نہ ہوگی۔

ایم جی حشمت کا یہ مشہور نغمہ میرا جیون کورا کاغذ کورا ہی رہ گیا جو لکھا تھا آنسوؤں کے سنگ بہہ گیا۔۔۔اردو والوں میں بڑا مشہور ہوا تھا اور تھوڑا بہت اخباروں میں ایم جی حشمت کا نام بھی آیا تھا۔ بناکے گیت مالا میں یہ نغمہ پہلے نمبر پہ آیا تھا۔اس فلم کا دوسرا گیت بھی بڑا مشہور ہوا تھا جو لتا منگیشکر کی آواز میں تھا۔ روٹھے روٹھے پیا مناؤں کیسے۔آج نہ جانے بات ہوئی کیا کیوں روٹھے مجھ سے۔روٹھے روٹھے پیا مناؤں کیسے۔جب تک وہ نہ بولیں مجھ سے سمجھوں کیسے۔روٹھے روٹھے پیا۔

1972 سے 1988 تک انھوں نے بہت سے کامیاب گیت لکھے میں تفصیل سے اپنی کتاب میں شامل کروں گا۔سرشار سیلانی اردو کے بہت اچھے شاعر تھے ان کا ایک شعر اردو والوں میں بڑا مشہور ہوا تھا جس کو میں نے اپنی کتاب برمحل اشعار میں شامل کیا تھا ۔چمن میں اختلاطِ رنگ و بو سے بات بنتی ہے۔ہمی ہم ہیں تو کیا ہم ہیں تمہی تم ہو تو کیا تم ہو۔ان کا پورا نام پنڈت بھیم سین سرشار سیلانی تخلص تھا وہ ساہنیوال ضلع لدھیانہ میں 12 مارچ 1914 کو پیدا ہوئے 1947 سے فلموں میں نغمے لکھنے کا کام شروع کیا۔ایک ریکارڈ کے مطابق 32 فلموں میں 68 گانے لکھے انھوں نے برسات کی رات فلم میں ڈائیلاگ بھی لکھے تھے۔55 سال کی عمر میں 10 اپریل 1969 کو یہ دنیا چھوڑ دی۔ان کے کچھ فلموں کے نغمے اس طرح ہیں۔فلم راکھی 1949 طلعت محمود کی آواز کا یہ گیت۔تری گلی سے بہت بے قرار ہو کے چلے۔شکار کرنے کو آئے شکار ہو کے چلے۔دل پر کسی کا تیر نظر کھا کے رہ گئے۔ہم اپنے دل کو آپ ہی شرما کے رہ گئے ۔دونوں کے دل میں جوش تھا دونوں جوان تھے۔لیکن زبان رکھتے ہوئے بے زبان تھے۔

■

Mr. Khaleequzzaman Nusrat
House No.1, Popessagali
M.A. Azad Road
Opp. RAMEDE CHURCH BASSEIN Vasai West
Mumbai,
Pin-401201 (Maharashtra)
Mob. 9923257606
Email: nusratkhalique@gmail.com

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے اور کتاب کے مشمولات کے تعلق سے قارئین کو اہم معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت پائی جاتی ہے۔ قدیم رسائل ومجلات نے نئی مطبوعات سے متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ تبصرہ ایک ذمہ داری کا عمل بھی ہے۔ اس لیے مبصرین کو تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، طوالت، تحسین اور نکتہ چینی سے گریز کرتے ہوئے کتاب کے اہم نکات پر اظہار خیال کرنا چاہیے۔ رسالے میں اردو زبان و ادب سے متعلق انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں شائع ہونے والی کتابوں پر تبصرے بھی شامل کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا مبصرین اس جانب بھی توجہ فرمائیں۔ (ادارہ)

پوربی دیسوں کی کہانیاں

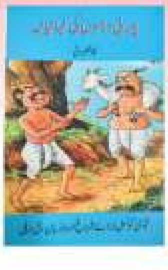

ترتیب وترجمہ: کلا تھیرانی / عائشہ صدیقی

صفحات: 296، قیمت: 75، سنہ اشاعت: 2025 (تیسرا ایڈیشن)

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: محمد فرقان عالم

اے 46، تھرڈ فلور، اوکھلا وہار، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025

''پوربی دیسوں کی کہانیاں'' کلا تھیرانی کی مرتب کردہ کتاب ہے، جس کا اردو ترجمہ عائشہ صدیقی نے کیا ہے، اس کا پہلا ایڈیشن 1988 میں شائع ہوا تھا، اس کتاب میں برما، سری لنکا، ہندستان، پاکستان، تبت، ویت نام، ملیشیا، انڈونیشیا اور فلپائن جیسے نو ایشیائی اور جنوبی مشرقی ایشیائی ممالک کی کہانیاں شامل ہیں، جو وہاں کے لوک ادب کی جہات کو واضح کرتی ہیں ''کسی بھی ملک کی لوک کہانیاں، وہاں کے رسم ورواج، عقائد، طور طریقوں اور توہم پرستی کا عکس بہت خوبصورتی کے ساتھ پیش کرتی ہیں'' ساٹھ سے زائد کہانیوں پر مشتمل اس کتاب میں اخلاق کو بنیاد بنایا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ تمام کہانیوں میں اخلاقی تعلیم کی شقیں پنہاں نظر آتی ہیں جس میں بزرگوں کے اقوال سے مزید روشنی پیدا ہوتی محسوس ہوتی ہے، ان کہانیوں کا مقصد بچوں میں اخلاق اور تربیت کا فروغ ہے، بظاہر چھوٹی اور مختصر کہانیوں میں بچوں کے لیے ایسے ایسے پہلو اور پیغام پوشیدہ ہیں جو ان کے ذہن کو بہترین غذا فراہم کر سکتے ہیں۔

پیش نظر کتاب کی کہانیوں میں بیشتر چھوٹے جانوروں کو کردار بنایا گیا ہے اور پھر اس کی الگ الگ خصوصیات کے ذریعے پیغام رسانی کا عمل انجام دیا گیا ہے، ساتھ ہی اس کو بھی واضح کیا گیا ہے کہ کس ملک میں کس جانور کو کیا مقام حاصل ہے۔ مثال کے طور پر جہاں برما اور تبت میں خرگوش کو ذہانت اور چالاکی کے معاملے میں اہمیت حاصل ہے وہیں سری لنکا، ملیشیا اور انڈونیشیا میں ہرن کی الگ الگ قسموں کی اہمیت ہے جبکہ ویت نام کی کہانیوں میں بگلے اور بلخ مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ کہانیاں ٹریٹمنٹ کے اعتبار سے تو متنوع ہیں تاہم مرکزی خیال اور نقطہ نظر کے تناظر میں یہ ایک دوسری سے مماثلت بھی رکھتی ہیں مثلاً انسان کا اس بات پر کامل یقین ہے کہ خواہ صورتحال جو بھی ہو، شر کا گراف بظاہر بڑھتا ہی کیوں نہ نظر آئے لیکن آخر میں فتح خیر کو ہی حاصل ہوتی ہے، دنیاوی معاملات میں بھی باوجود تمام ترنشیب و فراز اور اتار چڑھاؤ کے بدی کے مقابلے میں نیکی کا علم بلند ہو کر ہی رہتا ہے۔ ''پوربی دیسوں کی کہانیاں'' میں بھی یہ خیال نمایاں ہے۔ اس کی تمام کہانیاں اس نقطہ نظر کو پوری طرح گرفت میں لے کر آگے بڑھتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں، ظاہر ہے اس صورت میں مقصدیت کو مرکزیت عطا کرنے کے باوصف یہ کہانیاں بچوں کے ذہن پر بہتر انداز میں اثر انداز ہوں گی اور ان کے لیے اچھی ذہنی اور اخلاقی تربیت کا سامان کریں گی۔ اسی طرح ان کہانیوں میں نیکی کے ارتکاز کے ساتھ عقل کی قوت کو بھی خاص اہمیت دی گئی ہے اور یہ پیغام دیا گیا ہے کہ دنیا کے مشکل سے مشکل ترین مسائل کو بھی عقل کے بہترین اور مثبت استعمال سے حل کیا جا سکتا ہے۔

پیش نظر کتاب میں تعارف کے بعد برما کی سات، سری لنکا کی سات، ہندستان کی سات، پاکستان کی چھ، تبت کی سات، ویت نام کی سات، ملیشیا کی آٹھ، انڈونیشیا کی آٹھ اور فلپائن کی سات کہانیاں شامل ہیں۔ ان کہانیوں کی قرات سے مذکورہ تمام ممالک کی لوک روایت، تہذیب، مفروضے اور اخلاقی پیمانے کی نشاندہی کی جا سکتی

ہے اور یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ باوجود بعض تفریق کے شخصیت سازی کے اخلاقی ٹولز سب کے یہاں یکساں ہیں اور تہذیب و روایت کی سطح پر بھی بعض چیزیں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ برما کی کہانی ''خرگوش کا انصاف'' اس پہلو کو نمایاں کرتی ہے کہ اگر دانائی بلندیوں کا سفر طے کر کے چالاکی کا لبادہ اوڑھ لے تو پھر دانائی اپنے ہی دام میں گرفتار ہو کر نقصان کا سامنا کرتی ہے جیسا کہ اس کہانی میں خرگوش نے اپنی دانشمندی سے ''دانا صاحب'' جیسے کردار کی دانائی کو حد درجہ بے وقوفی میں تبدیل کیا ہے۔ دراصل اس کہانی کے ذریعے بچوں کو یہی پیغام دیا گیا ہے کہ بلاشبہ دانائی اچھی چیز ہے لیکن اس پر اعتدال کا پہرا ضروری ہے اگر اعتدال کا پہرا نہ ہو تو افراط و تفریط کے نتیجے میں دانائی اپنی اصل سے بے اعتنائی کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے۔

سری لنکا کی کہانی ''کسان اور دھوبی'' میں حد درجہ سادہ لوحی اور بے وقوفی کو بھی مضر باور کرایا گیا ہے اور یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ سادہ لوحی، عاجزی اور انکساری بلاشبہ بہترین انسانی اوصاف ہیں تاہم یہاں بھی اس کا لحاظ ضروری ہے کہ ان سب کے ساتھ انسان چاق و چوبند رہے اور ذہنی طور پر بیدار بھی رہے اس لیے کہ اگر انسان ایسا نہیں کرتا ہے تو پھر اس کی سادہ لوحی بے وقوفی میں مبدل ہو کر نقصان کا سبب ہوگی اس لیے کہ سادہ لوحی بلاشبہ ایک اچھا وصف ہے لیکن بے وقوفی کو اچھا وصف نہیں کہا جاسکتا۔

ہندوستانی کہانی ''برہمن کی بکری'' میں اس پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایک جھوٹ کو بار بار دہرانے سے عقلمند انسان بھی دھوکے کا شکار ہو جاتا ہے، اس کہانی میں یہی کیا گیا ہے کہ باہم مشورے سے کئی چالبازوں نے برہمن کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ جس کو وہ اپنے کندھے پر سوار کیے ہوا ہے وہ بکری نہیں کتا ہے، برہمن نے پہلی مرتبہ اس جھوٹ کی تردید کی، آگے بڑھا پھر کسی دوسرے سے اسی جھوٹ کا سامنا ہوا، پھر تردید کی اور آگے بڑھا لیکن اس مرتبہ وہ تردید نہ کر سکا بلکہ جھوٹ کی مسلسل تکرار نے اس کے ذہن پر سچ کا تاثر قائم کیا اور اس طرح برہمن نے فریب کا شکار ہو کر نقصان کا سامنا کیا۔

تبت کی کہانی ''چالاک خرگوش'' اس خیال پر مبنی ہے کہ طاقت کے نشے میں غصے کی شدت اور جذباتیت بہت ہی خطرناک ہے اگر اس کو قابو میں نہ رکھا جائے تو بظاہر کمزور وجود بھی ایک خاص سازش کے تحت ورغلا کر طاقتور وجود کو نقصان پہنچا سکتا ہے، ایسے میں طاقتور وجود کے لیے ضروری ہے کہ وہ جسمانی قوت کے ساتھ ذہنی قوت اور ضبط کا بھی مظاہرہ کرے جیسا کہ اس کہانی میں شیر طاقت کے نشے میں جذباتیت کا شکار ہو کر خرگوش کی چالاکی کا شکار بنا اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

تبت کی ہی دوسری کہانی ''گیدڑ کا انصاف'' اس نقطہ نظر پر مرتکز ہے کہ اگر فریقین کے ذریعے کسی خاص عمل میں آپسی رضامندی سے بروقت کوئی فیصلہ نہ لیا جائے تو کسی تیسرے کی مداخلت دونوں کے نقصان کا سبب بن سکتی ہے جیسا کہ اس کہانی میں اود بلاؤ کے تذبذب نے گیدڑ کی راہ ہموار کی اور گیدڑ نے دونوں کے تذبذب کا بھرپور فائدہ اٹھایا جس سے دونوں کو ایک بڑے نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔

ملیشیا کی کہانی ''ہرن کا انصاف'' میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کسی ناقابل یقین جھوٹ پر مبنی چالاکی کی عمارت کو منہدم کرنے کے لیے عملی طور اسی طرح کی مثال پیش کی جانی چاہیے تاکہ اگر ایک کو صحیح تسلیم کیا جائے تو دوسرے کو بھی رد نہ کیا جاسکے یعنی ایسے دعووں کے لیے دلیل نہیں بلکہ اسی کے مماثل خارق عادت دعوے کی ضرورت پڑتی ہے جیسا کہ اس کہانی میں ہرن نے ''کلہاڑی کو کیڑے مکوڑے کھا گئے'' جیسے جملے کی تردید کے لیے اسی طرح کا جملہ گڑھا۔

اسی طرح ''سچا دوست''، ''بگلے کی سفیدی''، ''کانچل کی چالاکی''، ''دھنک کی کہانی'' اور ''جادوئی پتھر والا آدمی'' وغیرہ ایسی کہانیاں ہیں جو مختلف ممالک کی متنوع تہذیب، روایت، عقائد اور مفروضے کی عکاسی کے ساتھ اپنے اپنے متن کے درون میں خاص پیغام بھی رکھتی ہیں جس میں انسانی عادات اور نفسیات کے ساتھ جانوروں کی ذہانت، دانشمندی اور چالاکی بھی قابل ذکر ہیں۔ جیسا کہ ذکر کیا جاچکا کہ کتاب ''پوربی دیسوں کی کہانیاں'' کے بیشتر مشتملات میں جانوروں کو مرکزیت عطا کی گئی ہے اور اسی کی عملی سرگرمیوں اور رویوں سے مقصدیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہی سمجھ میں آتی ہے کہ یہ کہانیاں نو ممالک کی لوک روایات کا احاطہ کرتی ہیں، اور لوک روایت میں جانوروں سے وابستہ بیانیے پر مرتکز قصے کہانیاں اہم متصور ہوتی ہیں، اس لیے یہ کہانیاں جانوروں کے کردار پر زیادہ مبنی ہیں، دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ جانوروں کے کردار پر مبنی کہانیاں بچوں کے ذہنوں کو زیادہ حیرت میں ڈالتی ہیں اور یہی حیرت ان کہانیوں کے اخلاقی اور تربیتی پہلوؤں کو مزید منکشف کرنے کا اشاریہ متصور ہوتی ہے اور چیزیں بہتر طور پر ذہن میں پیوست ہوتی چلی جاتی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ ''پوربی دیسوں کی کہانیاں'' بچوں کے لیے ایک اچھی کتاب ہے جس سے بچے جہاں مختلف اور متنوع کہانیوں سے لطف اندوز ہوں گے وہیں ان کہانیوں کے ذریعے بچوں کو الگ الگ تہذیبوں سے واقفیت بھی حاصل ہوگی اور مجموعی طور پر وہ ان کہانیوں کی قرأت سے اپنے اندر ایک خاص قسم کی تبدیلی بھی محسوس کریں گے، اسی مقصد کے پیش نظر قومی کونسل برائے فروغ اردو کے ذریعے اس کی تیسری اشاعت عمل میں آئی ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159 E-mail.:ncpulsalcunit@gmail.com, sales@ncpul.in

افسانہ

رقص شعلہ

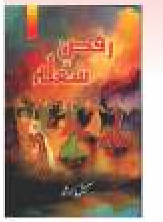

مصنف: سہیل ارشد

صفحات: 128، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2024

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: عبدالوارث، ریسرچ اسکالر، ستلج ہاسٹل

(روم نمبر: 123) جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

''رقص شعلہ'' سہیل ارشد کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس سے قبل مصنف کی تین کتابیں ''ضلع بردوان میں اردو ڈرامہ'' (2000)، ''ہمارا شعری ونثری ادب'' (2020) اور Dimensions of Quranic Though (2020) منظر عام پر آچکی ہیں۔

''رقص شعلہ'' گیارہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ کتاب کی ابتدا مصنف کے مختصر پیش لفظ سے ہوتی ہے جس میں وہ اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ مجموعے میں شامل افسانے ہند و پاک کے مقتدر ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ علاوہ ازیں مصنف نے اپنے فن افسانہ نگاری پر بھی اجمالاً روشنی ڈالی ہے۔ فیروز عابد، انیس رفیع اور ظہیر انور جیسے معتبر ادبا نے بالترتیب سہیل ارشد کی افسانہ نگاری کی انفرادیت اور اس کے موضوعات، زبان و اسلوب وغیرہ پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس ضمن میں فیروز عابد لکھتے ہیں ''سہیل ارشد زندگی سے آنکھ ملانے کی جرأت اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے شعور میں بالیدگی ہے۔ جہاں تک میرے مطالعے کا سوال ہے تو میں نے ان کے افسانوں کے باطن میں ارتعاش میں سناٹا اور سناٹے میں آواز محسوس کیا ہے۔'' (ص،6)

بعد ازاں معروف فکشن نویس انیس رفیع نے سہیل ارشد کا افسانہ ''رقص شعلہ'' کا مختصر مگر جامع تجزیہ کیا جو شامل کتاب ہے۔ ساتھ ہی محترم ظہیر انور نے بھی ان کی ایک اچھی کہانی ''گاماشاہ کا سانڈ'' کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ زیر مطالعہ مجموعے کا پہلا افسانہ ''رقص شعلہ'' ہے۔ یہ ایک سبق آموز کہانی ہے جس میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ شر پسند اور خیر پسند کے بالمقابل فتح یاب ہمیشہ خیر پسند ہی ہوتا ہے۔ شر پسند کی شکست کی بنیادی وجہ اس کی عیاشانہ طبیعت ہے۔ ''گاماشاہ کا سانڈ'' ایک طویل افسانہ ہے جس میں رجنی نامی عورت کی بہادری کو پیش کیا گیا ہے۔ مذکورہ افسانے میں مذہبی پیشوا مذہب کی آڑ میں گاؤں کی عورتوں کا جنسی استحصال کرتے تھے۔ پہلے پہل ظالم رنجیت سنگھ اور بعد میں اس کا بیٹا اجیت سنگھ (جو گاماشاہ کے سانڈ کے لقب سے مشہور تھے) گاؤں کی بے اولاد عورتوں کو جبراً گربھ وتی کرتے تھے۔ گاؤں کے لوگ اس فعل قبیح کو مذہبی رواج سمجھ کر برداشت کرتے تھے۔ لیکن جب رجنی کے ساتھ بھی گاماشاہ کا سانڈ اجیت سنگھ یہ زبردستی کرتا ہے تو اپنی جان دے کر لوگوں کو خواب غفلت سے بیدار کرتی ہے کہ یہ کوئی مذہبی رواج نہیں بلکہ ایک سنگین جرم ہے جسے برداشت نہیں کیا جائے گا۔ رجنی کی موت کے بعد گاؤں کی دائی آشا دیوی اس کے شوہر گجادھر کو دلاسا دیتی ہوئی کہتی ہے:

''آج سے یہ ہنسوا ہم عورتوں کا ہتھیار رہوگا، یہ ہنسوا بڑے کام کی چیز ہے۔ مرد اس سے فصل کاٹ سکتے ہیں اور عورتیں ظالم کی گردن۔'' (ص،32)

نتیجتاً گاؤں میں گاماشاہ کے سانڈ کا رواج ختم ہوتا ہے اور رجنی کی قربانی کو سراہتے ہوئے اسے دیوی تسلیم کیا جاتا ہے۔ افسانہ ''کٹھری'' بھی اس نوع کا ایک طویل افسانہ ہے جس میں سماج سدھار کو بنیادی حیثیت دی گئی ہے۔ خود افسانہ نگار نے بھی اپنی کہانیوں کو سماجی تبدیلی کا پیغام کہا ہے۔ سہیل ارشد فن افسانہ نگاری کی روایت سے بخوبی واقف ہیں۔ کہانی کی بنت میں بھی انھیں غیر معمولی دسترس حاصل ہے۔ لیکن بعض دفعہ ان کی کہانیاں بے جا تفصیلات اور واقعے کی تکرار سے بوجھل پن کا شکار ہو جاتی ہیں جس کی واضح مثال افسانہ ''کٹھری'' ہے۔

بہر حال سہیل ارشد کا افسانوی اسلوب سادہ و سہل ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں ہیئت کے تجربے سے گریز کرتے نظر آتے ہیں اور ساتھ ہی انھیں بے جا استعاروں اور علامتوں سے پاک رکھنے کی حتی المقدور کوشش بھی کرتے ہیں۔ مذکورہ افسانے کے علاوہ افسانہ ''بیٹی''، ''پنجرہ''، ''ماسک'' اور ''صلیب'' کو اچھے افسانے کے زمرے رکھ سکتے ہیں اور سہیل ارشد صاحب سے مزید بہتر افسانوں کی امید کرتے ہیں۔

ترتیب و تدوین

تعلم الکتابة

مرتبین: شیخ شمیم احمد، شیخ محفوظ الرحمٰن

صفحات: 100، سنہ اشاعت: 2025

مبصر: ڈاکٹر رفیق احمد۔ ڈی، سی، ایس، کے (پی، جی) کالج مؤناتھ بھنجن (یوپی)

''تعلم الکتابۃ'' حالیہ چند برسوں میں غیر عربی داں حضرات کو عربی سکھانے کی خاطر کتابت و تحریر کا جو گراں قدر سلسلہ منظر عام پر آیا ہے اس میں خاص طور سے شیخ شمیم احمد عبدالغفار اور شیخ محفوظ الرحمٰن نے ''تعلم الکتابۃ'' کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ کافی مقبول، مفید اور پسندیدہ ہے یہ کتاب عربی مدارس و جامعات اور عصری علوم کی درسگاہوں میں عربی تحریر و کتابت سکھانے کے لیے داخل نصاب کرنی چاہیے تاکہ ہماری نئی نسل کے بچے جدید طریقے سے عربی نوشت و خواندگی کی جانب آسانی سے متوجہ اور مائل ہو سکیں میرے ناقص خیال میں ''تعلم الکتابۃ'' کا یہ گراں قدر، قابل تعریف اور اہم سلسلہ بچوں میں عربی زبان سے انسیت پیدا کرے گا اور بچے آسانی سے اس زبان کی تحریر سے واقف ہو جائیں گے۔

''تعلم الکتابۃ'' نامی یہ باتصویر کتاب چھ اجزا پر مشتمل ہے اور اس کا پہلا حصہ 78 صفحات کو محیط ہے جبکہ بقیہ پانچ حصے تقریباً سو صفحات پر مشتمل ہیں اس کتاب کی سب سے اہم اور بنیادی خوبی یہ ہے کہ کتابت و تحریر سکھانے کے لیے یہ باتصویر ہے یعنی بچوں کی عمر اور نفسیات کے لحاظ سے انسان مختلف اشیا، چوپائے اور پرندے وغیرہ کی تصویروں کی مدد سے عربی زبان سیکھنے کی جانب بچوں کی توجہ مائل کی گئی ہے۔

''تعلم الکتابۃ'' نامی اس گراں قدر اور مفید کتاب کے پہلے حصے میں تین مرحلے میں پہلے مرحلے میں کتابت و تحریر سے قبل بچوں کو قلم یا پنسل کے ذریعہ مختلف عکس یا شکل کو بنانے کی جانب راغب کیا گیا ہے دوسرے مرحلے میں حروف تہجی کے ذریعہ مختلف تصویروں کی مدد سے بچوں کو عربی تحریر سکھانے کی مشق کرائی گئی ہے مثلاً ب، ت، ج، س، ط، ف وغیرہ۔ بقرۃ، تفاح، جمل، رمان، سیارۃ، طائرۃ، فیل، وردہ حروف ہجائیہ کو جوڑ کر مذکورہ الفاظ لکھنے کی مشق سکھائی گئی ہے میرے خیال میں یہ آموزش زبان کا کارآمد، مفید اور بہترین طریقہ ہے۔

''تعلم الکتابۃ'' کا دوسرا حصہ بھی تین مرحلے پر مشتمل ہے پہلے مرحلے میں

بچوں کو حروف ہجائیہ کی تحریری مشق کرائی گئی ہے اور حروف تہجی کی مدد سے مختلف اقسام کی تصویروں کو پیش کیا گیا ہے مثلاث ، ح، س، ط، م وغیرہ۔ ثعبان ، حاسوب ، ساعۃ ، طاؤس ، موز ، ان الفاظ میں حروف تہجی کی مشق کی جانب بچوں کو راغب کیا گیا ہے، اسی طرح دوسرے اور تیسرے مرحلے میں بھی تصویروں کی مدد سے حروف شناسی اور عربی کتابت وتحریر سکھانے کی طرف بچوں کی رہنمائی کی گئی ہے۔ زیر نظر کتاب ''تعلم الکتابۃ'' کا یہ تیسرا حصہ دو مرحلے میں ہے پہلا مرحلہ دو یا دو سے زیادہ حروف کی تحریری مشق کی جانب رہنمائی کرتا ہے اس میں حروف ہجائیہ کی مدد سے کچھ ایسے حروف یا الفاظ لکھنے کی جانب توجہ دلائی گئی ہے جو کتاب میں تصویروں کی مدد سے لکھے جا سکتے ہیں مثلا ب ، ج ، ح ش ک ، ق وغیرہ۔ بصل، جبل ، جرس، حمار، کتاب، قرد وغیرہ۔ اسی کتاب کے دوسرے مرحلے میں حرف ہجائیہ کی مدد سے تصویروں کا سہارا لیتے ہوئے مرکب حروف لکھنے کی مشق کرائی گئی ہے مثلا ام راۃ ، امرأۃ ، ب ی ت ، بیت ، ر ، ج ، ل ، رجل ، رش ، ام ، رسام ، م س ط ر ۃ مسطرۃ ، ق ، ر ، آ ، ن ، قرآن وغیرہ۔

''تعلم الکتابۃ'' کے چوتھے حصے میں چھ مرحلے ہیں اور ہر ایک مرحلے میں بچوں کو تصویروں کی مدد سے آموزش زبان اور لکھنے کی مشق کرائی گئی ہے، پہلے مرحلے میں بچوں کو پڑھائے گئے سابقہ تین اجزا کے اسباق کا آموختہ یا اعادہ ہے جسے بالفاظ دیگر تحصیلی جانچ کے نام سے بھی موسوم کیا جا سکتا ہے یعنی سابقہ تین کتابوں کی مدد سے بچوں نے حروف کی جو شناخت کی ہے اور لکھنے کی جو مشق کی ہے اس میں وہ کہاں تک کامیاب ہیں معلم یا استاد اس کا محاسبہ بچوں سے ڈائرکٹ کر سکتا ہے۔ اس کتاب میں دو سے پانچویں مرحلے تک بچوں کو مختصر اور طویل حرکات مثلا فتحہ، کسرہ ، مد، مختصر اور مد طویل کی شناخت اور آموزش کی تحریری مشق کرائی گئی ہے مثلا کرۃ ، قطار، سیارۃ ، طائرۃ ، عنب ، فیل وغیرہ۔ مذکورہ کتاب کے چھٹے مرحلے میں تائے مفتوحہ اور مربوطہ کے درمیان فرق کو واضح کیا گیا ہے اور اس کی تحریری مشق بھی کرائی گئی ہے مثلا ھذا بیت جمیل، ھذہ خریطۃ العالم، خرجت من الغرفۃ وغیرہ۔

''تعلم الکتابۃ'' کا پانچواں حصہ پانچ یونٹ (اکائی) پر مشتمل ہے پہلی یونٹ میں اب تک سیکھی گئی کتابت یا تحریر کا اعادہ ہے یعنی بچوں نے پچھلے اسباق سے کتنی مہارت حاصل کی ہے اور انھوں نے کیا کچھ اخذ کیا ہے۔ اس طرح دوسری اکائی سے پانچویں اکائی تک میں مدہ ، ہمزہ ، وصل وغیرہ کا بیان ہے اور مختلف تمرین اور کتابی مشق کے ذریعہ ان چیزوں کو تصویروں کی مدد سے بچوں کو سکھانے کی کوشش کی گئی ہے مثلا الکتاب مفید، العسل کثیر الفوائد، عندي مئۃ ریال ، قرأ احمد القرآن، کتابت یا تحریر سکھانے والی اس کتاب کے چھٹے حصے میں پانچ مرحلے ہیں اس کا پہلا مرحلہ گزشتہ پانچوں حصوں سے حاصل کی ہوئی معلومات کے اعادہ پر مشتمل ہے جبکہ دوسرا مرحلہ الف لینہ اور اس کی اقسام کے لکھنے کے طریقے پر مشتمل ہے مثلا عصا اور موسیٰ ، اس مرحلے میں تصویروں کی مدد سے اس کو لکھنے کا بہترین طریقہ سکھایا گیا ہے۔ تیسرے مرحلے میں ان حروف کا بیان ہے جو لکھنے میں تو دکھائی دیں گے مگر بولنے اور پڑھنے میں وہ ساکت رہیں گے مثلا کتبوا، ادرسوا، ارسلوہ، عمرو وغیرہ۔ الطلاب کتبوا لدرس، سلمت علی عمرو۔ اسی طرح چوتھے مرحلے میں ان حروف کی کتابت یا تحریر کا تذکرہ ہے جو لکھنے میں حذف کر دیے جاتے ہیں مثلا الف ، ل ، واو وغیرہ محمد ابن عبداللہ۔ اس کتاب کے پانچویں مرحلے میں علامات الترقیم کے لکھنے کا بیان ہے مثلا عربی زبان لکھتے وقت کہاں کون سی علامت یا نشان ظاہر کرتے ہیں جیسے کاما، سوالیہ نشان؟ استعجابیہ! بریکٹ وغیرہ ''کیف حالک'' ما اسمکَ انت ، وا اسفاہ! لقد فاتت الصلوۃ۔

مجموعی طور پر زیر نظر کتابوں کے تمام اجزا بڑی افادیت واہمیت کے حامل ہیں عربی زبان کو آسانی سے سیکھنے کے لیے اس کی کتابت یا تحریری صورت میں بچوں سے مشق کے لیے ''تعلم الکتابۃ'' بڑی عمدہ اور فائدہ مند ہے حروف تہجی کو پہچان کر عملی مشق وتمرین کے لیے بھی یہ کتاب بہت کارآمد ہے، عربی حروف شناسی اور آموزش زبان کے لیے ''تعلم الکتابۃ'' سیریز میں عربی زبان کی تعلیم وتدریس کو آسان بنا کر طلبا کے سامنے پیش کیا گیا ہے اور مختلف اشکال (شکلوں) کو تصویروں کے ذریعے دکھایا گیا ہے اور کتابت وتحریر سے متعلق مشق اور تمرین سے بھی بات کو واضح کر کے بچوں کے سامنے پیش کیا گیا ہے، زیر نظر کتاب حسن ترتیب اور پیشکش کے لحاظ سے بڑی معنی خیز ہے نئی نسل کے بچوں کو عربی زبان کی کتابت وتحریر سیکھنے میں یہ کتاب ان شاء اللہ معاون ومددگار ثابت ہوگی۔

شاعری

کنج سیارگاں

(شعری مجموعہ)

شاعر: امیر حمزہ ثاقب

صفحات: 144، قیمت: 225

ناشر: بازگشت بکس، نئی دہلی

مبصر: محمد ارشد ہمراز، ریسرچ اسکالر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

امیر حمزہ ثاقب منفرد لب ولہجے کے شاعر ہیں۔ اس نوع کے جملے عموماً رسمی طور پر کسی شاعر کے لیے لکھ دیے جاتے ہیں لیکن یہاں یہ معاملہ نہیں ہے۔ امیر حمزہ ثاقب کا شعری اسلوب اور ڈکشن اسے اپنے ہمعصروں سے منفرد کرتا ہے۔ یہ اپنی شعری کائنات میں ایسی نئی اور نامانوس فضا خلق کرتے ہیں کہ قاری کو قدم قدم پر ٹھہرنا پڑتا ہے۔ امیر حمزہ ثاقب روح کے دھاگوں سے نئی چادر بننے کے انوکھے فن سے خوب واقف ہیں۔ یہ ایسے جاں باف ہیں جو جگر افزائی کرتے ہیں تو کئی رنگ بکھرتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے انہیں رنگوں سے بڑی انسیت ہے 'موسم کشف' ہو یا ''کنج سیارگاں' اس کے سرورق پر بھی رنگوں کی ایک کہکشاں، غالباً یہ تمہید ہے ان مختلف الوان کی جو آگے متن میں لفظ ومعانی کے پیکر میں نمودار ہونے والے ہیں۔ ان کے ہاں ہر رنگ ایک مختلف علائم اور استعارے کی شکل میں ابھرتے ہیں۔ کتاب کا انتساب بھی ''مہندی کے اس شجر کے نام ہے جس کی جڑیں آنسوؤں کی زمین میں پیوست ہیں''۔

پیش نظر مجموعے میں تقریباً 75 غزلیں ہیں جہاں 15 مقامات پر لفظ 'رنگ' روشن ہے۔ کمال فن یہ ہے کہ ان رنگوں میں کوئی یکسانیت نہیں ہے یہ ہر جگہ مختلف معنوی پیکر لیے ہوئے ہے، ان کے استعمال میں وہ شاعرانہ فنکاری نمایاں

ہے جہاں الفاظ اس طرح ترتیب پاتے ہیں کہ وہ جی اٹھتے ہیں۔ بطور نمونہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

آتے ہیں دست بوسی کو صد جلوہ بہار
کیا رنگ آ گیا ترے گوشہ نشین پر

کیا شہر نگاراں ہے فلک ہے نہ زمیں ہے
کیا رنگ تعلق ہے کہ دنیا ہے نہ دیں ہے

رنگ مجھ میں چھلکتے رہتے ہیں
خواب والہام کے چمن میں ہوں

'گنج سیارگاں' امیر حمزہ ثاقب کا دوسرا شعری مجموعہ ہے جو 2023 میں منظر عام پر آیا ہے۔ اس سے قبل 2014 میں 'موسم کشف' کے نام سے پہلا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ یہ مجموعے پروفیسر عتیق اللہ اور قاضی جمال جیسے ناقدین سے داد و تحسین وصول کر چکے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی اب تک کئی اصحاب فکر وفن 'گنج سیارگاں' کی شاعری پر اظہار خیال کر چکے ہیں۔ سب نے اپنی نظر سے انھیں دیکھا ہے۔ میں جب دیکھتا ہوں تو امیر حمزہ ثاقب رنگ اور روح کے شاعر نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں تہہ داری بھی ہے اور تاثیر بھی اور یہ تاثیر درون ذات کی واردات اور باطنی اسرار کے شعری سانچے میں ڈھلنے سے آئی ہے۔ ان کے یہاں خارج سے زیادہ باطن کی گرہ کشائی کا عمل ہے۔ بقول قاضی جمال حسین 'امیر حمزہ بار بار اپنے باطن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور ذات کے پر اسرار سفر میں ذات کے اَن دیکھے گوشوں کو منور کر دیتے ہیں۔ خارجی حقائق سے زیادہ ان کا سروکار باطنی اسرار سے ہے جسے وہ لفظوں میں بیان کرتے ہیں اور بسا اوقات حیرت اور گمشدگی کی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں۔''

امیر حمزہ ثاقب کے یہاں موسم کشف ہے اور خواب والہام کے پر اسرار دھندلکے بھی، بدن کی باؤلی وحشت ہے اور اس وحشت میں بھی عجیب طرح کی لذت ہے اور یہ لذت ان کے یہاں استفہامیہ لہجے سے مزید بڑھ جاتی ہے:

بدن میں باؤلی وحشت کہاں سے آتی ہے
عجیب طرح کی لذت کہاں سے آتی ہے
کوئی بتائے بہشت خیال وصل میں بھی
عذاب ہجر کی ساعت کہاں سے آتی ہے

ساعت وصل میں جدائی کا کھٹکا لگا رہنا، یہ مضمون کئی کلاسیکی شعرا کے یہاں ملتا ہے۔ بطور نمونہ، مومن خان مومن کا ایک شعر دیکھیں:

تھی وصل میں بھی فکر جدائی تمام شب
وہ آئے تو بھی نیند نہ آئی تمام شب

مومن کا یہ شعر یقیناً اعلیٰ درجے کا ہے۔ امیر حمزہ ثاقب نے بہشت خیال وصل اور عذاب ساعت ہجر کی ترکیب سے شعر کے مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ ان کے یہاں نت نئی تراکیب اور نادر استعاروں کا استعمال بکثرت ملتا ہے۔ وہ تشبیہات و تلمیحات کی ایسی دھنک سجاتے ہیں جس کی جادوئی چمک یکلخت نہیں بلکہ آہستگی سے قاری کو اپنے حصار میں لیتی ہے:

زبوری خواب کی خوشبو تھی روشن
گل داؤدی آنکھوں میں کھلا تھا

اپنے گندم میں پیالہ لیے جاتے ہیں ترا
لوگ کہتے ہیں کہ ہم خالی و تنہا نکلے

مذہبی روایات پر بھی امیر حمزہ ثاقب کی نظر بہت گہری ہے۔ 'زبوری خواب' کی رعایت سے 'گل داؤدی' کا استعمال عام نہیں ہے اور 'گندم میں پیالہ لیے جانا' اس نادر تلمیح پر جتنی داد دی جائے کم ہے۔ ان کا پرواز تخیل اگر دیکھنا ہو تو ایک شعر کافی ہے۔

ہمارے پاؤں کے چھالے ہیں اختر شب تاب
یہ آسماں نہیں ہے ہمارا صحرا ہے

رنگ، بدن، روح، دشت، صحرا، وحشت، خاموشی، خواب، چاند، عشق، نور اور نغمہ جیسے الفاظ غزلیہ شاعری میں بکثرت مستعمل ہیں۔ ایسے پامال الفاظ کا برتاؤ بھی وہ اس مہارت سے کرتے ہیں کہ اس میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ جاتی ہے۔

ان کے یہاں لحہ شبنم، خیمہ فرصت، طشت گفتار، جوئے تنہائی، تخم تمنا، دامن چرخ، کنار دید، چراغ نغمہ، جبین شب جیسی نامانوس تراکیب کو بڑی خوبی سے برتا گیا ہے۔ امیر حمزہ ثاقب نے 'گنج سیارگاں' کی غزلوں میں صرف دو جگہ اپنا تخلص استعمال کیا ہے۔ مجھے لگتا ہے یہ ایک شعوری عمل ہے اس سے جہاں ایک طرف انفرادیت قائم ہوتی ہے وہیں نفی ذات کی علامت بھی ابھر کر سامنے آتی جو کم و بیش 'گنج سیارگاں' کی تمام غزلوں کا خاصہ ہے:

میں تو ایک قرینۂ بے نطق کا باشندہ ہوں
اور غزل میری سر شہر زباں رہتی ہے
ایسی گہرائی کہ حاصل کی خبر ہوتی نہیں
کون سی چیز مری تہہ میں نہاں رہتی ہے

گنج سیارگاں کی ضخامت 144 صفحات ہے۔ طباعت نفیس اور سرورق بھی نہایت ہی دیدہ زیب ہے۔ بازگشت بکس، نئی دہلی سے یہ شائع ہوئی ہے۔

حرف اشرف (شعری مجموعہ)

شاعر: سید اشرف برماور مرحوم
ترتیب و تدوین: ڈاکٹر محمد حنیف شباب
صفحات: 360، قیمت: 350، سنہ اشاعت: 2025
طباعت: آئی پرنٹ بنگلور
مبصر: ڈاکٹر حبیب سیفی، حوض رانی، مالویہ نگر، نئی دہلی-17

سید محمد اشرف برماور مرحوم کا کلام ''حرف اشرف'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس کی ترتیب و تدوین ڈاکٹر محمد حنیف شباب نے کی ہے۔ محمد اشرف کی شاعری میں ان کی معاشی و ادبی اور سماجی سرگرمیوں کا عکس صاف طور پر نظر آتا ہے۔ کتاب کے بیک کور پر مرحوم کی تصویر کے ساتھ تعارف پیش کیا گیا ہے، اس تعارف نامے میں تحصیل علوم وفنون، اور کاروباری زندگی کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی

ہے کہ سید محمد اشرف نے کس طرح عوامی فلاح کے منصوبے بنائے اور ان کے تعلق سے عملی اقدامات کیے۔ جس تعلیم کے اثرات سید محمد اشرف برماور کی شخصیت پر رونما ہوئے اور جن صالح ادبی اقدار کی انھوں نے پیروی کی۔ اپنی شاعری میں وہی پیغام دیا ہے، تاکہ مقصدی ادب کی نمائندگی کا حق ادا ہو سکے۔

ان کی شاعری میں تخلیقی کرب کے ساتھ ظاہری خیال اور باطنی نیت کی تفریق بھی نظر آتی ہے۔ دیانت دار اور تربیت یافتہ ذہن جب بھی کوئی بات لکھتا ہے اسے اپنی ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے، بغیر سوچے سمجھے وہ ایک لفظ بھی استعمال کرنا نہیں چاہتا، اپنے دور کے مسائل پر نہایت ذمہ داری اور روشن خیالی سے نگاہ ڈالتے ہوئے وہ اپنے خیال کو سپردِ قلم کرتا ہے، یہی کام سید محمد اشرف نے اپنی شاعری میں بہ طریق احسن انجام دیا ہے۔

حق جان کے جو حق کی حمایت نہیں کرتے
در اصل وہ اللہ کی طاعت نہیں کرتے
سورج تو بانٹتا رہا دنیا کو روشنی
اور میں اسے چراغ دکھانے میں رہ گیا

ان کے کلام میں مجروح ہوتی انسانیت اور اس کے نتیجے میں غمزدہ ہونے والی جذباتیت کی پرچھائیاں نہیں بلکہ مکمل ترجمانی ملتی ہے۔ ان کی شاعری ان کی زخمی روح کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ وہ شاعری ہے جس میں ذاتی تجربات اور سماجی مشاہدات کو دلچسپی کے ساتھ پڑھنے والے انداز میں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے، ثقیل الفاظ استعمال نہیں کیے گئے ہیں، رواں اور مروج بحور میں بیشتر غزلیں ہیں۔ شعریات کا مطالعہ کرنے کے بعد میں کہہ سکتا ہوں حساس طبیعت کے مالک سید محمد اشرف برماور نے اپنے مزاج کی شاعری کی ہے۔ ان کی شاعری پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ موجودہ عہد میں انسان کا وجود بے معنی سا ہو کر رہ گیا ہے، خود اس کا داخل اس کے خلاف سازش کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے، اسی لیے معاشرے میں انسان کی سائکی پر مکمل بے حسی طاری ہو جاتی ہے، اور اسی بے حسی کے آثار مٹانے کا کام سید محمد اشرف برماور نے اپنی شاعری کے ذریعے کیا ہے۔

جس کی ٹھوکر نے مرے قدموں کو بخشا ہے ثبات
راستے کا مجھ کو وہ پتھر بہت اچھا لگا
ضرورت ہی نہیں مجھ کو مرے حق میں کوئی بولے
مجھے تو بس یہی کافی ہے کہ میری خودی بولے

مجموعہ کی شروعات میں قادر میراں پٹیل نے 'ایک بچھڑے ہوئے ساتھی کا پتہ یاد آیا'، مولانا سراج الدین ندوی نے بھائی سید محمد اشرف برماور کی شخصیت اور شاعری کے پس منظر میں شعری حوالوں کے ساتھ بات کی ہے۔ سید محمد اشرف برماور کے سامنے لامحدود انسانی مسائل کے حوالوں کا انبار ہے، وسائل کی کمی کا رونا نہیں رویا ہے، کیونکہ یہ مسائل ہیں جن کا تدارک تعلیم پانے کے بعد آسانی سے کیا جا سکتا ہے، یہی مرحوم کی فکر ہے جسے مرتب ڈاکٹر محمد حنیف شباب نے شاعری کو بہترین طریقے سے ترتیب دے کر روحانی آزادی سے لطف لینے کا سامان فراہم کیا ہے۔ سید محمد اشرف برماور کا ذہن حساس اور تخلیقی ذہن تھا، اس کی مثالیں ان اشعار سے دیکھی جا سکتی ہیں۔

علم سے جی چرا رہا ہوں میں
ہر بلا کو بلا رہا ہوں میں
سامنے چیختی کتابیں ہیں
رات کو دل جلا رہا ہوں میں
یہ تو نہیں جاگیر کسی کی
دین حق تو دین ہے سب کا

بعض غزلوں میں شہری زندگی کے مصائب، پیچیدگیوں، اعصابی تناؤ، زندہ رہنے کے لیے کی جانے والی مسلسل بھاگ دوڑ، نیز صنعتی ترقی کے سیلاب میں تنکوں کی طرح بہہ جانے والی مہذب اور نفیس اقدار کا نہ صرف موثر اور حقیقت پسندانہ اظہار کیا ہے، بلکہ اپنے انفرادی نظریے کے خاص زاویوں سے دنیا کو دیکھنے کے بعد اس کے متعلق لب کشائی کی ہے۔ بعض اشعار میں موجودہ معاشرتی ماحول کی تشریح بھی ہوئی ہے۔ کچھ غزلوں میں اشعار کے ذریعے بلند ترین انسانی اقدار اور اخلاقیات کو اتنے تخلیقی انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ تاریخ زندہ اور موجودہ لمحے کے طور پر پوری روحانی قوت کے ساتھ اجاگر ہو جاتی ہے۔ حرف اشرف اپنی طرف راغب کرنے کی خوبیوں سے پر ہے۔ ادارہ ادب اسلامی ہند، بھٹکل سے صاف ستھری شائع کتاب ملنے کا پتا: دعوت سینٹر، سلطان اسٹریٹ بھٹکل، درج ہے۔ ■

پہلی تحریر پہلا تاثر

کسی بھی رسالے میں جب آپ کی تحریر شائع ہوتی ہے تو آپ کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ایک نئی تحریک بھی ملتی ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' میں جب آپ کی تحریر پہلی بار شائع ہوئی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟ آپ اپنے خیالات لکھ کر ہمیں بھیجیں اور یہ بھی ضرور لکھیں کہ آپ کی ذہنی اور تحریری تربیت میں ادبی رسائل کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے! اگر یہ رسالے نہ ہوتے تو...؟

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

بین المذاہب ہم آہنگی کے عنوان سے یک روزہ سمینار

نئی دہلی: آج انڈیا انٹرنیشنل سینٹر، نئی دہلی میں انٹرفیتھ ہارمونی فاؤنڈیشن آف انڈیا اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے باہمی اشتراک سے بین المذاہب ہم آہنگی کے عنوان سے یک روزہ سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ اس سمینار میں مختلف موضوعات پر تین سیشن منعقد ہوئے۔ افتتاحی سیشن بعنوان "اردو: بین المذاہب ہم آہنگی اور مشترکہ ثقافتی ورثے کی زبان" کی صدارت پروفیسر قاضی عبید الرحمن ہاشمی نے کی اور جناب وجے گوئیل (وائس چیئر پرسن، گاندھی اسمرتی اور درشن سمیتی، حکومت ہند) بحیثیت مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ جبکہ مقررین میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال اور انٹرفیتھ ہارمونی فاؤنڈیشن آف انڈیا کے بانی وصدر ڈاکٹر خواجہ افتخار احمد کے علاوہ جناب فیروز بخت احمد (سابق چانسلر، مانو، حیدرآباد) جناب خورشید ربانی (ایڈیٹر منصف ٹی وی) شامل رہے۔ اس کی نظامت جناب جاوید رحمانی نے کی اور کلمات تشکر جناب فوزان احمد خواجہ نے ادا کیے۔

ڈاکٹر خواجہ افتخار احمد نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے سمینار کے مقاصد پر روشنی ڈالی اور کہا کہ ہندوستان کی زبانوں میں ایک خاص تہذیب شامل ہے۔ اردو ایک مشترکہ وراثت کی زبان ہے جو بین المذاہب ہم آہنگی اور حب الوطنی کے جذبات کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کررہی ہے۔ دنیا میں اگر کوئی ملک ہے جس میں تمام مذاہب کو آزادی حاصل ہے تو وہ ہندوستان ہے۔

ڈاکٹر شمس اقبال (ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان) نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اس موضوع کا تعلق جتنا زبان و ادب سے ہے اتنا ہی سماجی ڈسکورس سے بھی ہے۔ اردو نے ابتدا سے ہی ہندوستانیت اور اس کی تہذیبی شناخت کو مرکز میں رکھا ہے، انہوں نے آگ کا دریا اور کئی چاند تھے سر آسماں جیسے ناولوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان میں ہندوستانی تہذیب کی عکاسی دیکھی جا سکتی ہے۔ اسی طرح اردو کے متعدد شعرا کا کلام مشترکہ تہذیب کی نمائندگی کرتا ہے۔

مہمان خصوصی جناب وجے گوئل نے کہا کہ مذہب کی بنیاد تعلیم اور اخلاقیات پر ہے، اپنے بڑوں کی اچھی باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کی اتباع کرنی چاہیے، مذہب ہمیں سچائی اور عدم تشدد کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کے نام پر لڑنا درست نہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو خالص ہندوستانی زبان ہے جو یہیں پیدا ہوئی، کوئی بھی زبان کسی خاص طبقے کی ملکیت نہیں ہوتی بلکہ زبان کا تعلق سب کے ساتھ یکساں ہوتا ہے۔ ہندوستان ایسا ملک ہے جہاں تمام زبانیں پنپ سکتی ہیں اور تمام مذاہب اور تہذیب کو فروغ حاصل ہو سکتا ہے۔

صدارتی تقریر پیش کرتے ہوئے پروفیسر قاضی عبید الرحمن ہاشمی نے کہا اردو زبان لنگوا فرینکا ہونے کی وجہ سے ہمیشہ سے مشترکہ تہذیب و ثقافت کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتی رہی ہے، فلم انڈسٹری اور صوفیا کی خانقاہیں بھی اس زبان کے اثرات سے معمور رہی ہیں۔ انھوں نے قومی کونسل کی موجودہ سرگرمیوں کو سراہتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شمس اقبال اور انٹرفیتھ ہارمونی فاؤنڈیشن کے بانی خواجہ افتخار احمد کو پروگرام کے انعقاد پر مبارکباد پیش کی۔

پہلے مقرر جناب فیروز بخت احمد نے کہا کہ اردو مذہب کی نہیں وطن کی زبان ہے۔ یہ زبان نہیں جنون ہے، یہ مشترکہ تہذیب کی زبان ہے اس کے مصنفین بھی الگ الگ مذاہب سے متعلق ہیں۔ دوسرے مقرر جناب خورشید ربانی نے کہا کہ مشترکہ تہذیب کو فروغ دیتے ہوئے ملک کے حالات کو بہتر بنانے میں اردو ٹی وی جرنلزم نے اہم خدمات انجام دی ہیں۔

سمینار کے دوسرے سیشن میں "میڈیا اور عوامی مباحثے میں بین المذاہب اخلاقیات" کے موضوع پر گفتگو کی گئی، جس میں بحیثیت مہمان خصوصی جسٹس اقبال احمد انصاری (سابق چیف جسٹس پٹنہ ہائی کورٹ، پٹنہ) نے شرکت کی جبکہ مقررین میں ڈاکٹر خواجہ افتخار احمد، ڈاکٹر دنیش دوبے، جناب ایم ودود ساجد اور جناب محمد وجیہ الدین شامل رہے۔ اس کی نظامت ڈاکٹر آیوشی کیتکر نے کی۔

اس سیشن کے مہمان خصوصی جسٹس اقبال احمد انصاری نے کہا کہ ہم بنیادی طور پر آدمی ہیں جبکہ ہمیں آدمی سے زیادہ انسان بننے کی ضرورت ہے جو وقت، حالات اور سماج کی بھلائی کے لیے سب سے بڑا تقاضا ہے۔ بین المذاہب ہم آہنگی کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ ہم ایک دوسرے کو چوٹ نہ پہنچائیں۔ یہ کثیر لسانی، مذہبی اور تہذیبی ملک ہے اس لیے یہاں بین المذاہب مکالمے کی زیادہ ضرورت ہے۔

سیشن کے پہلے مقرر ڈاکٹر دنیش دوبے نے کہا کہ جب کوئی آئین نہیں تھا اس وقت بھی مذہب تھا، مذہب نے ہی تہذیب کو روشنی پہنچایا۔ انھوں نے الگ الگ مذاہب کی تعلیمات کی روشنی میں واضح کیا کہ انسان کے لیے بنیادی چیز محبت ہے اور انسانی زندگی کے لیے روحانی پہلو بہت ہی اہم ہیں۔ دوسرے مقرر جناب ایم ودود ساجد نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں بین المذاہب ہم آہنگی کو واضح کیا، اور مذہب اسلام کے تصور انسانیت پر روشنی ڈالی۔ سیشن کے آخری مقرر جناب محمد وجیہ الدین نے میڈیا کے کارناموں اور ذمہ داریوں پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ کلمات تشکر جناب فائنان احمد خواجہ نے ادا کیے۔

اختتامی سیشن میں ''بین المذاہب روایات اور بھارت کا مشترکہ ثقافتی ورثہ'' کے عنوان سے مقررین نے اظہار خیال کیا۔ اس کی صدارت پروفیسر خواجہ عبدالمنتقم نے کی جبکہ بحیثیت مہمان خصوصی پروفیسر محمد افشار عالم (وائس چانسلر، جامعہ ہمدرد) شریک ہوئے۔ ڈاکٹر خواجہ افتخار احمد، ڈاکٹر محمد شمس اقبال، پروفیسر دویہ تنور، پروفیسر محمد قطب الدین، پروفیسر ذاکر خان ذاکر اور جناب فائنان احمد خواجہ، بطور پینلسٹ شریک ہوئے۔ نظامت ڈاکٹر آمنہ مرزا نے کی۔

مہمان خصوصی پروفیسر افشار عالم (وائس چانسلر جامعہ ہمدرد) نے کہا کہ ہندوستان ایک روحانی سرزمین ہے، ہمارا مشترکہ ثقافتی ورثہ بہت ہی ثروت مند ہے، یہاں کے صوفیوں اور رشی منیوں نے اپنے اخلاقی عمل اور روحانی تعلیمات سے اس ورثہ کو تقویت عطا کی جس کے اثرات آج بھی ہمارے یہاں نمایاں ہیں، ہمیں اپنی مشترکہ ثقافتی وراثت، اخلاق، ہم آہنگی اور احترام کو عملی طور پر فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ اس سیشن میں صدارتی خطاب پیش کرتے ہوئے پروفیسر خواجہ عبدالمنتقم نے کہا کہ ہمارا ملک ہمیشہ سے مشترکہ تہذیب کا گہوارہ رہا ہے اور تنوع کے باوجود یہاں باہمی احترام اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

خواجہ افتخار احمد نے کہا کہ ہندوستان انسانیت کی ابتدا کی سرزمین ہے۔ اسی طرح فائنان احمد خواجہ نے کہا کہ ہندوستان کی بنیادی شناخت اخلاقی کردار ہے۔ پروفیسر ذاکر خان ذاکر نے ہندوستان کی مذہبی اور تہذیبی تاریخ کی روشنی میں بین المذاہب اور مشترکہ ثقافتی ورثہ کو واضح کیا۔ دوسرے مقرر پروفیسر محمد قطب الدین (جے این یو) نے ہندوستان کی مشترکہ ثقافتی وراثت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کی تاریخی روایات کا ذکر کیا اور کہا کہ بین المذاہب مکالمے کو اسکولوں اور کالجوں میں بھی عملی طور پر فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر دویہ تنور (بانی دویہ فاؤنڈیشن) نے بین المذاہب ہم آہنگی کے عملی اقدامات پر گفتگو کی اور اس بات پر زور دیا کہ نئی نسل اور بچوں کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ ہماری مشترکہ ثقافتی روایات کیا ہیں اور اس کے اثرات ہمارے لیے کتنے سودمند ہو سکتے ہیں۔

اس سمینار کا اختتام قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شمس اقبال کے کنکلوڈنگ ریمارکس اور اظہار تشکر پر ہوا۔ سمینار کے موضوع کے حوالے سے انھوں نے کہا کہ اس پیغام کو ہندوستان کے کونے کونے تک لے جانے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے داراشکوہ اور دیگر شخصیات کی اہم مطبوعات پر روشنی ڈالی اور اردو کے مدھوبن میں رادھا کرشن، خسرو دریا پریم کا، داستان کہت کبیر جیسے پروگراموں کا تذکرہ کرتے ہوئے مشترکہ ہندوستانی تہذیب کے فروغ میں قومی اردو کونسل کی اہم کاوشوں کا ذکر کیا اور سمینار میں شریک ہونے والے تمام مہمانوں کا شکریہ بھی ادا کیا۔ (رابطہ عامہ سیل)

زبان، ادب اور تعلیم سے متعلق خبریں

ماہنامہ اردو دنیا میں 'خبر نامہ' کے تحت علمی، ادبی، ثقافتی اور تعلیمی سرگرمیوں سے متعلق خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ ان خبروں سے ہماری ادبی و ثقافتی سرگرمیوں، تنوع اور زبان و ادب کی سمت و رفتار کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ خبرنامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ کوشش کے باوجود بہت سی اہم خبریں ہم تک موصول ہونے سے رہ جاتی ہیں۔ اس لیے منتظمین سے گزارش ہے کہ وہ اہم علمی، ادبی و ثقافتی تقریبات اور وفیات سے متعلق خبریں درجِ ذیل ای میل editor@ncpul.in | urdudunyancpul@yahoo.co.in پر ارسال کرنے کی زحمت کریں۔ (ادارہ)

دہلی

وزیر تعلیم جناب دھرمیندر پردھان کا خطاب

نئی دہلی: مرکزی وزیر تعلیم جناب دھرمیندر پردھان نے آج سشما سوراج بھون، نئی دہلی میں وزارت تعلیم

کے زیر اہتمام اسٹڈی ان انڈیا ایجو ڈپلومیٹک کنکلیو 2026 سے خطاب کیا، جس میں 50 سے زیادہ ممالک کے سفیروں، ہائی کمشنروں، سفارتی مشن کے نمائندوں اور وزارت کے عہدیداروں کو ایک ساتھ ملا کر بین الاقوامی تعلیم میں تعاون کو مضبوط بنانے پر غور کیا گیا۔ اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے، وزیر تعلیم نے قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے تحت ہندوستان کے نظام تعلیم کی تبدیلی کے بارے میں بات کی، جس میں تعلیم کی بین الاقوامی کاری اور معیار، اختراع اور قابل استطاعت پر ہندوستان کی مضبوط توجہ پر روشنی ڈالی گئی۔ انھوں نے مزید کہا کہ وزیر اعظم جناب نریندر مودی نے آزادی کے 100 سال مکمل ہونے پر 2047 تک ہندوستان کو ایک ترقی یافتہ ملک بنانے کا تصور پیش کیا ہے۔ اس تناظر میں، وزیر نے اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان عالمی اقتصادی منظر نامے میں ایک روشن مقام بنا ہوا ہے، جو سیکھنے، تحقیق کرنے، اختراع کرنے اور لاگو کرنے کے بے پناہ مواقع فراہم کرتا ہے۔ وزیر موصوف نے اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان کی سب سے بڑی طاقت اس کے متحرک علمی ماحولیاتی نظام، آبادیاتی منافع اور تیزی سے بڑھتی ہوئی معیشت میں ہے۔ انھوں نے اس بات پر بھی روشنی ڈالی کی مصنوعی ذہانت، بایو ٹکنالوجی اور سیمی کنڈکٹرز سے لے کر پائیدار توانائی تک، ہندوستان ایک قابل اعتماد اختراعی پارٹنر کے طور پر ابھر رہا ہے، جو تعاون، صلاحیت سازی اور مشترکہ علم پر مبنی گلوبل ساؤتھ ماڈل کو آگے بڑھا رہا ہے۔ ہندوستان شراکت دار ممالک کے ساتھ علم کے مضبوط پل بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 3 مارچ 2026

لٹریچر فیسٹیول

نئی دہلی: دہلی یونیورسٹی کے پہلے ادبی میلے "دہلی یونیورسٹی لٹریچر فیسٹیول" (ڈی یو ایل ایف) کا آغاز

جمعرات کو یونیورسٹی کے ملٹی پرپز اسپورٹس کمپلیکس میں ہوا۔ افتتاحی تقریب میں ڈی یو ایل ایف کے پیٹرن ان چیف اور دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر یوگیش سنگھ مہمان خصوصی کے طور پر موجود رہے۔ اس موقع پر پروفیسر یوگیش سنگھ نے کہا کہ ادب انسان کو سوچنا، سمجھنا اور سلیقے سے بولنا سکھاتا ہے۔ ادب نہ صرف انسان کو اس کی جڑوں سے جوڑتا ہے بلکہ مٹی سے رشتہ مضبوط کرتا ہے۔ افتتاح کے بعد مختلف مذاکرہ سیشن منعقد ہوئے جن میں طلبہ نے مقررین سے سوالات کیے۔ اس موقع پر پبلشرز کے بک اسٹالوں پر بھیڑ دیکھی گئی، جبکہ یونیورسٹی کلچرل کونسل کی جانب سے پیش کیے گئے ثقافتی پروگراموں نے حاضرین کو خوب محظوظ کیا۔ وائس چانسلر نے فیسٹیول کے شعار "راشٹر پرتھم ایکتا میں انیکتا" پر روشنی ڈالی۔ ابتدائی تقریب میں ڈی یو ایل ایف کے کنوینز اور کور کمیٹی کے نائب صدر (چیئرمین، ڈی یو کلچرل کونسل) انوپ لاٹھر نے استقبالیہ خطاب میں کہا کہ دہلی یونیورسٹی کے 104 سال مکمل ہونے کے بعد پہلی بار یونیورسٹی سطح پر اس نوعیت کا ادبی میلہ منعقد ہو رہا ہے۔ ڈی یو رجسٹرار ڈاکٹر وکاس گپتا نے اختتامی کلمات میں بتایا کہ اس پروگرام کی تیاری میں دو ماہ تک مختلف ٹیموں نے روز محنت کی، جس میں 200 سے زائد اساتذہ اور غیر تدریسی ملازمین شریک رہے۔ فیسٹیول کے مختلف سیشنز میں صحافت، ویدک علم، مقابلہ جاتی امتحانات، شاعری اور ادب کے دیگر پہلوؤں پر گہری بحث ہوئی، جس میں ہزاروں طلبہ اور اساتذہ نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 فروری 2026

عہد وسطیٰ میں تصوف کی روایت

نئی دہلی: دہلی یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کے زیر اہتمام پرشین لیکچر سیریز کا 46واں لیکچر منعقد ہوا جس میں شعبہ

تاریخ کے ممتاز مورخ پروفیسر رضی الدین عقیل نے ''عہد وسطیٰ میں تصوف کی روایت'' کے موضوع پر کلیدی خطاب کیا۔ پروفیسر رضی الدین عقیل نے کہا کہ تصوف نے ہندوستانی سماج میں روحانیت کے ساتھ سماجی ہم آہنگی، مذہبی رواداری اور انسان دوستی کو فروغ دیا۔ انھوں نے حضرت نظام الدین اولیا کے تصور دور کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ صوفیانہ تعلیمات صبر، محنت اور خدمت خلق کا درس دیتی ہیں۔ انھوں نے حسن سنجری کی فوائد الفواد اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی اخبار الاخیار فی اسرار الابرار کو تصوف کے اہم ماخذ قرار دیا اور اپنے خطاب میں صوفیانہ اشعار بھی پیش کیے۔ پروگرام کی صدارت شعبہ فارسی کے صدر پروفیسر علیم اشرف خان نے کی۔ انھوں نے تصوف کے متون کے سنجیدہ علمی مطالعے پر زور دیتے ہوئے الخلق عیال اللہ کے آفاقی تصور کو ہندوستانی روایت سے جوڑا۔ نظامت اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن نے کی جبکہ ایسوی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر مہتاب جہاں نے اظہار تشکر کیا۔ اس موقع پر طلبا اور اساتذہ بڑی تعداد میں موجود رہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 فروری 2026

ماضی قریب میں غالب کے ناقدین و محققین

نئی دہلی: غالب اکیڈمی کے زیر اہتمام یک روزہ سمینار بعنوان ''ماضی قریب میں غالب کے ناقدین و محققین'' منعقد ہوا، جس میں غالب کے مختلف پہلوؤں

پر مقالات پیش کیے گئے۔ یہ سمینار غالب کے یوم وفات اور غالب اکیڈمی کے یوم تاسیس کے تعلق سے منعقد ہوا تھا۔ سمینار کی صدارت کرتے ہوئے ڈاکٹر جی آر کنول نے کہا کہ مرزا غالب پر اردو اور فارسی کے ناقدین و محققین نے وافر مقدار میں لکھا ہے اور ان کا کلام زندگی کے ہر موڑ پر رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ پروفیسر قاضی جمال حسین نے کہا کہ گوپی چند نارنگ کی اہم کتاب ''غالب: معنی آفرینی، جدلیات، وضع، سونیتا اور شعریات'' غالب فہمی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے، جس میں بیدل پر بھی ایک مستقل باب شامل ہے۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کہا کہ بیدل ہندوستان کے فارسی شعرا میں سب سے نمایاں نام ہیں۔ پروفیسر معظم الدین نے قاضی عبدالستار کے ناول غالب پر مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ قاضی عبدالستار بنیادی طور پر ناول نگار تھے اور انھوں نے غالب کی زندگی کو اس عہد کی تہذیبی فضا میں اشعار اور لطائف کی بنیاد پر تخلیقی انداز میں پیش کیا۔ ڈاکٹر ابرار رحمانی نے امتیاز علی عرشی پر مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ دیوان غالب نسخہ عرشی اور دیوان مومن کی ترتیب کی بدولت امتیاز علی عرشی کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ شاہد حبیب نے ''مالک رام بحیثیت غالب شناس'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ نفیس بانو نے ''نثار احمد فاروقی کے تحقیقی شعور اور تلاش غالب'' پر، جبکہ ڈاکٹر حنا آفرین نے ''میر و غالب شمیم حنفی کی نظر میں'' پر مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر شاداب تبسم نے ''خلیق انجم اور خطوط غالب'' پر مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ خلیق انجم نے خطوط غالب کو چار جلدوں میں مرتب کیا اور جامع و مستند حواشی کے ذریعے اہم تحقیقی خدمت انجام دی۔ پروفیسر علیم اشرف نے پروفیسر نذیر احمد کی غالب شناسی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ غالب کی فارسی شاعری اور نثر کو سمجھنے کے لیے نذیر احمد کی تصانیف ناگزیر ہیں۔ سمینار کی نظامت ڈاکٹر یامین انصاری نے کی، جبکہ ڈاکٹر عقیل احمد نے اختتامی کلمات میں کہا کہ ماضی قریب کے ناقدین و محققین کی تصانیف نئی نسل کے لیے مشعل راہ ہیں اور سمینار میں پیش کیے گئے مقالات مستقبل کے محققین کے لیے نہایت مفید ثابت ہوں گے۔ اس موقع پر سامعین سرکردہ افراد موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 فروری 2026

پروفیسر ابن کنول

نئی دہلی: انجمن شاگردان ابن کنول کی جانب سے پروفیسر ابن کنول کی حیات اور ادبی خدمات پر ایک

آن لائن سمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں ملک کی مختلف یونیورسٹیوں سے تعلق رکھنے والے اساتذہ، محققین، اسکالرز اور طلبہ وطالبات نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ سمینار کا مقصد پروفیسر ابن کنول کی علمی، ادبی اور تدریسی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں خراج عقیدت پیش کرنا اور نئی نسل کو ان کے افکار و نظریات سے روشناس کرانا تھا۔ پروگرام کی صدارت ان کے سینئر شاگرد ڈاکٹر محمد اکمل (خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی) نے کی۔ صدارتی خطاب میں انھوں نے پروفیسر ابن کنول کی ادبی خدمات پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ وہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے اور اردو ادب کے مختلف میدانوں میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ وہ اپنے طلبہ کی علمی و اخلاقی تربیت کو ہمیشہ اولین ترجیح دیتے تھے۔ اس موقع پر پروفیسر احمد امتیاز، ڈاکٹر نعیم انیس، ڈاکٹر شمس الدین، ڈاکٹر عبدالرب، ڈاکٹر نثار احمد خان اور ڈاکٹر شاداب شمیم کے علاوہ کئی اسکالرز نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 14 فروری 2026

قومی سمینار کا انعقاد

نئی دہلی: عصر حاضر میں کوئی ایک نظریہ ادبی اظہار پر اس طرح حاوی نہیں رہا جیسا کہ ماضی میں تھا۔ آج کا ادیب پوری آزادی کے ساتھ اپنی انفرادیت، علاقائی

ومعاشرتی شناخت، ماحولیات، ڈیجیٹل زندگی اور نفسیاتی مسائل کو اپنے تخلیقی اظہار کا حصہ بنا رہا ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر سراج اجملی، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے قمر رئیس سلور جبلی آڈیٹوریم میں اردو اکادمی، دہلی کے زیر اہتمام سہ روزہ قومی سمینار ''اردو ادب کا عصری منظرنامہ: اہمیت اور معنویت'' کے افتتاحی اجلاس میں اپنے کلیدی خطبے کے دوران کیا۔ انھوں نے کہا کہ سوشل میڈیا، آن لائن پلیٹ فارمز اور ای کتابوں نے اردو ادب کو نئی نسل تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ نوجوان بھی

اردو سے وابستہ ہو رہے ہیں جن کا تہذیبی یا لسانی پس منظر اردو سے مضبوط نہیں رہا۔ان کے مطابق تخلیقی صلاحیت سے مالا مال شاعر ہر تجربے کو بامعنی ادبی اظہار میں ڈھالنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور یہی عصری ادب کی سب سے بڑی قوت ہے۔ اس سے قبل سمینار کے کنوینر پروفیسر احمد محفوظ نے مختصر تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ مقالہ نگاران کو سمینار کے بنیادی موضوع کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی گفتگو کسی ایک مخصوص عہد تک محدود نہیں رکھنی چاہیے کیونکہ اس طرح بحث کی معنویت متاثر ہوتی ہے۔ انھوں نے زور دیا کہ اردو ادب کی تفہیم کے لیے وسیع تاریخی اور فکری تناظر میں غور و فکر ناگزیر ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادب میں اصل اہمیت فنکار کی ذات سے زیادہ اس کی تخلیقات کو حاصل ہوتی ہے، اس لیے میر، غالب اور سودا جیسے شعرا کا تخلیقی سرمایہ آج بھی زندہ اور بامعنی ہے۔ انھوں نے سائنس، ٹیکنالوجی اور مصنوعی ذہانت کی ادبی صورت حال پر اثرات کو بھی سمینار کی گفتگو کا اہم حصہ قرار دیا۔ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے شعبہ اردو، الہ آباد یونیورسٹی کے سابق صدر پروفیسر علی احمد فاطمی نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ حقیقی تخلیق محض اطلاعات پر نہیں بلکہ گہرے تجربات اور مشاہدات پر قائم ہوتی ہے جبکہ آج کی بیشتر تخلیقات معلومات کی بنیاد پر لکھی جا رہی ہیں۔ انھوں نے فطرت کے اصول کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ کسی شے کی زیادتی اس کی کاٹ بھی لے آتی ہے جیسے حد سے زیادہ شور بہرے پن اور حد سے زیادہ روشنی اندھے پن میں بدل جاتی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ معاصر اردو ادب میں خوابوں کے ٹوٹنے کا عمل تو نمایاں ہے، مگر خواب دیکھنے کی جرأت کم ہوتی جا رہی ہے حالانکہ خواب کے لیے مقصد حیات اور مقصد حیات کے لیے نظریہ حیات ناگزیر ہے۔ افتتاحی اجلاس کی نظامت مالک اشتر نے کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 15 فروری 2026

توسیعی لیکچر

نئی دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ عربی کے زیر اہتمام ڈاکٹر عبدالعلیم لائبریری میں ایک توسیعی لیکچر منعقد کیا گیا، جس کا موضوع ''عربوں کا پرتگال اور پرتگیز زبان پر اثر'' تھا۔ اس علمی نشست میں جناب اجے کمار پرشاد

شعبہ فارن لینگویجز، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے توسیعی خطبہ پیش کیا اور اپنے موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی۔ لیکچر کا آغاز شعبہ کے ریسرچ اسکالر محمد عاقب کی تلاوت کلام پاک سے ہوا، جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ہیفاء شاکری نے انجام دیے۔ مہمان خطیب نے اپنے خطاب میں اندلس اور پرتگال کے تاریخی پس منظر پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے بتایا کہ آئبیرین جزیرہ نما میں مسلمانوں کی آمد کیسے ہوئی۔ لسانی پہلو پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے انکشاف کیا کہ عربی زبان نے پرتگیز زبان پر گہرے اثرات مرتب کیے جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پرتگیز میں تقریباً 1800 الفاظ عربی سے مستعار ہیں۔ یہ الفاظ زراعت، سائنس اور روزمرہ کی زندگی کے مختلف شعبوں پر محیط ہیں جو عربی تہذیب کے غلبے کی عکاسی کرتے ہیں۔ مزید گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ثقافتی اعتبار سے پرتگالی رقص و موسیقی حتیٰ کہ مٹھائیوں میں بھی عربی اثرات نمایاں طور پر پائے جاتے ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 15 فروری 2026

یوم غالب کا انعقاد

نئی دہلی: یوم غالب کے موقع پر انجمن ترقی اردو (دہلی) کے زیر اہتمام بہ اشتراک غالب انسٹی ٹیوٹ

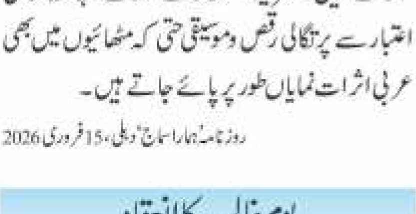

اور غالب اکیڈمی ایک باوقار تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کا آغاز مزار مرزا اسداللہ خاں غالب پر گل پوشی اور فاتحہ خوانی سے ہوا جس میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد، انجمن کے صدر اقبال مسعود فاروقی، غالب اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد، پروفیسر شہپر رسول اور متعدد ریسرچ اسکالرس نے شرکت کی۔ ایوان غالب میں ایک مذاکرہ منعقد ہوا جس کی صدارت معروف ادیب و نقاد پروفیسر علی احمد فاطمی نے کی۔ اپنے صدارتی خطاب میں انھوں نے فراق گورکھپوری سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ فراق صاحب میر کو دل کا شاعر اور غالب کو دماغ کا شاعر قرار دیتے تھے۔ ان کے مطابق غالب کی شاعری ذہن کو متحرک کرتی ہے اور فکر کو جلا بخشتی ہے۔ انھوں نے محترمہ شائستہ یوسف کے ناول ''صدیوں کا رقص'' کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اس میں زندگی کے چیلنجز کو قبول کرنے کا وہی رویہ ملتا ہے جو غالب کی پہچان ہے۔ ڈاکٹر خالد علوی نے اپنے خطاب میں کہا کہ غالب کی مقبولیت کا عالم نرالا ہے۔ انھوں نے کلکتہ میں ایک ایسے شخص کا ذکر کیا جو اپنے ذاتی خرچ پر دیواروں پر رومن رسم الخط میں غالب کے اشعار تحریر کرتا تھا۔ اسی طرح تاشقند میں غالب کے نام سے منسوب محلہ، سڑک اور مسجد کی موجودگی ان کی عالمی مقبولیت کا ثبوت ہے۔

اس موقع پر شائستہ یوسف کے ناول ''صدیوں کا رقص'' کی رسم رونمائی بھی انجام دی گئی۔ اپنے اظہار خیال میں انھوں نے کہا کہ یہ ناول انسانی تاریخ اور وجودی سوالات کا آئینہ دار ہے، جس میں زندگی اور کائنات سے متعلق بنیادی سوالات کو دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ یوم غالب کا انعقاد بظاہر ایک رسم ہے، مگر یہ رسم ہمیں اپنے علمی سرمایہ اور دانشورانہ روایت سے جوڑتی ہے اور تازگی بخشتی ہے۔ مذاکرے کے بعد طرحی مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت وقار مانوی نے کی جبکہ متین امروہوی مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر عمیر منظر نے انجام دیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 فروری 2026

قمر رئیس ایوارڈ

نئی دہلی: پروفیسر قمر رئیس ایک ادیب استاد اور دانشور ہی نہیں اردو ادب کی تاریخ میں اپنی ترقی پسندانہ فکر روشن

اور وسیع المشربی کی بدولت ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ ان خیالات کا اظہار معروف براڈ کاسٹر، داستان گو اور سفرنامہ نگار جاوید دانش نے قمر رئیس ایوارڈ تقریب میں کیا۔ راجستھان اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے دیا جانے والا باوقار پروفیسر قمر رئیس ایوارڈ کینیڈا میں مقیم ہندوستانی نژاد داستان گو اور سفرنامہ نگار جاوید دانش کو دیا گیا ہے۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے راجستھان اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی ستائش کی اور اس تقریب کو ایک نامور استاد کی یاد کو خراج عقیدت پیش کرنے کا ذریعہ بتایا۔ اس باوقار تقریب کے مہمان خصوصی پروفیسر خالد محمود نے مفصل طور پر جاوید دانش کی سفرنامہ نگاری کو اردو ادب کی تاریخ میں اضافہ قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ جاوید دانش محض سفر کی روداد بیان نہیں کرتے، بلکہ وہ جہاں جاتے ہیں اس مقام کا جغرافیہ سیاسی تہذیبی صورتحال کو دل پذیر انداز میں بیان کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے سفرنامے فلمی منظرنامے کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔ پروفیسر اخلاق آہن نے مہجری ادب کے حوالے سے جاوید دانش کی تخلیقات پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ بیشتر شعرا و ادبا نے مہجری ادب کے ذیل میں اپنی غریب الوطنی کی روداد بیان کی ہے جبکہ جاوید دانش نے اس بحران کو اپنی تخلیقات میں پیش کیا ہے جو نئی نسل کو درپیش ہے۔ مہمان خصوصی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے جاوید دانش کو بہت مقبول فنکار قرار دیا۔ اس پروقار تقریب کی صدارت تسمیہ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے ڈاکٹر سید فاروق نے کی۔ اپنے صدارتی خطبے میں جاوید دانش کی صلاحیتوں کو سراہتے ہوئے انھیں ایک نابغہ روزگار شخصیت قرار دیا۔ تقریب کے آغاز میں راجستھان اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر پروفیسر فاروق بخشی نے راجستھان اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے حاضرین محفل کا استقبال کرتے ہوئے اس ایوارڈ کی کل روداد بیان کی۔ اس موقع پر صاحب اعزاز جاوید دانش کو پچیس ہزار روپے کا چیک، یادگار نشان اور شال بھی پیش کی گئی۔ جاوید دانش نے اس ایوارڈ کے حصول پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے اسے قابل فخر قرار دیا۔ انھوں نے اپنے تئیں قمر رئیس کی محبتوں کا تذکرہ بہت جذباتی انداز میں کیا۔ اس تقریب میں دہلی اور بیرون دہلی کے معروف دانشوروں نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 فروری 2026

لوک ادب پر سمینار

نئی دہلی: زبانی روایات اور لوک ورثہ انسانی معاشرے میں باہمی خیرسگالی کو فروغ دینے اور تہذیب وتمدن کو زندہ رکھنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ مقامی محاورے، تاریخی

حکایات اور زبانی روایتیں دراصل ادبی شہ پارے ہیں جن کے ذریعے پیچیدہ معانی کو استعاراتی انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ اسی لیے لوک ورثہ عوام اور ادبی حلقوں کے درمیان ایک پل کا کام کرتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر آنند پرکاش نے شعبہ عربی، دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام 'زبانی روایات اور لوک ورثہ: ثقافتوں کا سنگم' کے موضوع پر منعقد دو روزہ قومی سمینار کے افتتاحی اجلاس میں کلیلہ ودمنہ (پنچ تنتر) اور دیگر روایتوں کی ادبی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ لوک ادب کا بیانیہ علاقائی ضرور ہوتا ہے لیکن اس کی اپیل عالمی ہوتی ہے۔ انھوں نے اس موضوع پر تحقیقی منصوبے شروع کرنے کی تجویز بھی پیش کی۔ اس سے قبل صدر شعبہ پروفیسر سید حسنین اختر نے موضوع کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ لوک ادب کتابوں سے زیادہ دلوں میں زندہ رہتا ہے، مگر نئی نسل اس ورثے سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ اسی لیے شعبہ عربی نے اس موضوع کو منتخب کیا اور اس کی افادیت کو وسعت دینے کے لیے اردو، ہندی، پنجابی، لسانیات، نفسیات اور بدھسٹ اسٹڈیز جیسے شعبوں کو سمینار میں شریک کیا گیا، جہاں مختلف علمی نشستوں میں مقالات پیش کیے جا رہے ہیں۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے دہلی یونیورسٹی کی ڈین برائے تعلیمی امور پروفیسر رتنابلی نے کہا کہ زبانی روایات اور لوک ادب معاشرے کا بنیادی عنصر ہیں۔ انھوں نے نئی قومی تعلیمی پالیسی کا حوالہ دیتے ہوئے علاقائی زبانوں کی اہمیت پر زور دیا اور کہا کہ مصنوعی ذہانت کے دور میں لوک ورثے کا تحفظ ناگزیر ہے تاکہ اسے جدید ذرائع کے ذریعے محفوظ و منتقل کیا جا سکے۔ مہمان اعزازی نامور ادیبہ کریتا پال نے کہا کہ زبانوں کے تحفظ کے لیے لوک ادب کا تحفظ ضروری ہے اور اسے باقاعدہ علمی دائرے میں شامل کیا جانا چاہیے۔ افتتاحی اجلاس کی نظامت ڈاکٹر مجیب اختر نے کی جبکہ شکریہ کی رسم ڈاکٹر محمد اکرم نے ادا کی۔ افتتاحی اجلاس کے علاوہ شعبہ عربی میں مختلف علمی نشستوں میں دس مقالات پیش کیے گئے جن کی صدارت پروفیسر سمیع اختر، پروفیسر نسیم اختر، پروفیسر ایوب تاج الدین اور پروفیسر ثناء اللہ نے کی جبکہ نظامت ڈاکٹر آصف اقبال اور ڈاکٹر ابوتراب نے کی۔ اس کے علاوہ شعبہ لسانیات میں منعقدہ اکیڈمک سیشن میں 6 مقالے پیش کیے گئے جس کی نظامت ساکشی بھاٹیہ نے کی۔ پروگرام میں اساتذہ اور طلبہ کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 17 فروری 2026

پروفیسر ہادی حسن یادگاری خطبہ

نئی دہلی: شعبہ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایرانولوجی ہال میں ''قوم پرستی، احیائے فکر اور ہمہ گیر اسلامی تصور: علامہ اقبال کی شاعری میں سیاسی وثقافتی تبدیلیاں'' کے

عنوان سے بائیسواں پروفیسر ہادی حسن یادگاری خطبہ کا انعقاد عمل میں آیا۔ جن کے مقرر خاص ڈاکٹر روی کانت مشرا، جوائنٹ ڈائرکٹر، وزیراعظم میوزیم و لائبریری نئی دہلی تھے، صدارت پروفیسر مظہر آصف شیخ الجامعہ اور مہمان اعزازی کی حیثیت سے پروفیسر اقتدار محمد خان ڈین فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ لینگویجز نے شرکت فرمائی۔ ڈاکٹر روی کانت مشرا نے علامہ اقبال کے کلام کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ ہم ان کے کلام کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک انگلینڈ جانے سے پہلے کا کلام ہے اور دوسرا اس کے بعد کا۔ ڈاکٹر مشرا نے اقبال کی نظم ہمالیہ، رام، نیا شوالہ، شکوہ اور جواب شکوہ، طلوع اسلام اور ان کے دیوان بانگ درا، اسرار خودی، جاوید نامہ وغیرہ کا تفصیلی جائزہ لیتے

ہوئے ان کی قوم پرستی، وطن پرستی اور ہمہ گیر اسلامی تصور کا تفصیلی جائزہ لیا۔ شیخ الجامعہ پروفیسر مظہر آصف نے کہا کہ علامہ اقبال ایک ہمہ گیری شخصیت کے مالک تھے اور ان کا کلام قوم پرستی اور حب الوطنی سے لبریز نظر آتا ہے۔ انھوں نے پروفیسر ہادی حسن کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اگرچہ ان کا موضوع فارسی نہیں تھا مگر انھوں نے فارسی زبان وادب کی خدمات انجام دیں اور نایاب تحریریں بھی یادگار چھوڑیں۔ پروفیسر اقتدار محمد خان نے اپنے خطاب میں کہا کہ آج کا یہ خطبہ بہت معلومات افزا ہے اور طلبا ضرور اس سے استفادہ کریں گے۔ ڈاکٹر محسن علی نے پروفیسر ہادی حسن اور آج کے مقرر ڈاکٹر روی کانت مشرا کا تعارف کرایا اور آخر میں پروفیسر سید کلیم اصغر نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر زہرا خاتون نے انجام دیے۔ پروگرام میں اساتذہ کے ساتھ جامعہ اور جے این یو کے طلبا وطالبات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 18 فروری 2026

شعبہ فارسی، دہلی یونیورسٹی

نئی دہلی: دہلی یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کے زیر اہتمام 16 اور 17 فروری کو دو روزہ قومی سمینار کا انعقاد عمل میں

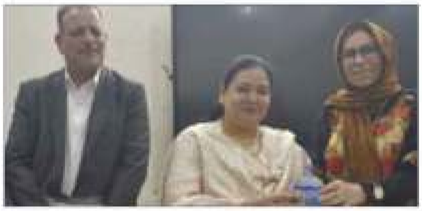

آیا جس میں ملک وبیرون ملک سے تعلق رکھنے والے ممتاز اہل علم ودانش نے شرکت کی۔ افتتاحی اجلاس میں مہمان اعزازی کے طور پر مرکز تحقیقات، ایران کلچر ہاؤس، نئی دہلی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر قہرمان سلیمانی اور معروف ایرانی اسکالر ڈاکٹر میترا بیات شریک ہوئیں، جبکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے دہلی یونیورسٹی کے سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹس پروفیسر علیم اشرف خان نے شرکت کی۔ افتتاحی نشست کے آغاز میں معزز مہمانوں کا استقبال کیا گیا اور شعبہ فارسی کے سالانہ "مجلّہ تحقیقات فارسی" کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ اپنے صدارتی خطبے میں سینئر پروفیسر علیم اشرف خان نے ہندوستان میں فارسی زبان وادب کی مختلف جہات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ فارسی نے صدیوں تک ہندوستان کی علمی وتہذیبی روایت کو جلا بخشی۔ انھوں نے امیر خسرو کی خدمات کا خصوصی ذکر کیا اور فرمایا کہ وہ اپنے عہد کے حالات سے پوری طرح باخبر اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ اس موقع پر کلیدی خطبہ ڈاکٹر مہتاب جہاں نے پیش کیا۔ انھوں نے ہندوستان میں فارسی زبان کے آغاز وارتقا پر مفصل گفتگو کی اور غزنوی، مملوک اور مغل ادوار میں فارسی کی علمی خدمات کو اجاگر کیا۔ انھوں نے لاہور کو غزنوی عہد میں فارسی کا اہم مرکز قرار دیتے ہوئے کشف المحجوب، تاج المآثر، آداب الحرب والشجاعہ، فتوح السلاطین اور تاریخ فیروز شاہی جیسی اہم تصانیف کا حوالہ دیا اور مغلیہ عہد کی علمی روایت پر بھی روشنی ڈالی۔ بعدازاں ڈاکٹر قہرمان سلیمانی نے ہندوستان اور ایران کے تاریخی وتہذیبی روابط پر اظہار خیال کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 18 فروری 2026

حکیم اجمل خاں

نئی دہلی: انٹیگریٹیڈ میڈیکل ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام حکیم اجمل خاں کے 158ویں یوم پیدائش کے موقع

پر تقریب کا انعقاد غالب انسٹی ٹیوٹ میں کیا گیا۔ اس موقع پر دہلی بھر کے نامور اطبا اور معالجین نے شرکت کی اور طب یونانی میں حکیم اجمل خاں کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اس موقع پر سید احمد خان نے کہا کہ حکیم اجمل خاں نے طب یونانی کو نئی بلندیوں تک پہنچایا اور جدید طبی تقاضوں کے مطابق علاج کے نئے طریقے متعارف کرائے۔ تقریب کے دوران دہلی کے مختلف طبی اداروں سے وابستہ ڈاکٹروں کو ان کی نمایاں خدمات کے اعتراف میں اعزازات واسناد سے نوازا گیا۔ اس موقع پر مقررین نے اس عزم کا اظہار کیا کہ طب یونانی کے فروغ اور عوام تک موثر ومحفوظ علاج کی فراہمی کے لیے مشترکہ کوششیں جاری رکھی جائیں گی۔ آخر میں منتظمین پروگرام یعنی انٹیگریٹیڈ میڈیکل ایسوسی ایشن کی جانب سے اعلان کیا گیا کہ حکیم اجمل خاں کے نظریات اور طبی ورثے کو عام کرنے کے لیے آئندہ بھی سائنس وادبی پروگراموں کا سلسلہ جاری رکھا جائے گا، تا کہ نئی نسل کو اس عظیم طبی رہنما کی خدمات سے روشناس کرایا جا سکے۔ اس موقع پر ڈاکٹر آر ایس چوہان نے کہا کہ طب یونانی دراصل ایک مکمل طرز حیات اور متوازن علاج کا نظام ہے، جسے مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے نئی روح بخشی۔ اس موقع پر معززین بھی موجود رہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 فروری 2026

کروشیا کے وزیر اعظم کا خصوصی لیکچر

نئی دہلی: دہلی یونیورسٹی میں ایک خصوصی لیکچر سے خطاب کرتے ہوئے جمہوریہ کروشیا کے وزیر اعظم آندریج پلینکووچ نے ہندستان کروشیا تعلقات پر بات کرتے

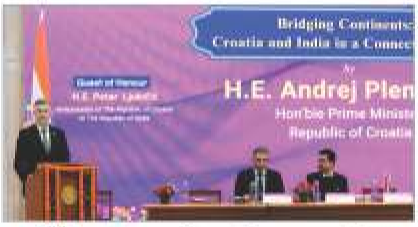

ہوئے کہا کہ 187 سے کروشیا کی یونیورسٹی میں سنسکرت پڑھائی جارہی ہے۔ اس موقع پر ہندستان میں جمہوریہ کروشیا کے سفیر پیٹر لیوبیچک مہمان خصوصی کے طور پر موجود تھے۔ پروگرام کی صدارت دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر یوگیش سنگھ نے کی۔ تقریب میں ڈی یو ساؤتھ کیمپس کی ڈائرکٹر پروفیسر رجنی ابی، رجسٹرار ڈاکٹر وکاس گپتا اور بین الاقوامی تعلقات کے چیئرمین پروفیسر گریگوریوچ موجود تھے۔ لیکچر کے دوران جمہوریہ کروشیا کے وزیر اعظم آندریج پلینکووچ نے ہندستان کروشیا تعلقات عالمی تعاون اور بدلتے ہوئے بین الاقوامی منظرنامے پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر یوگیش سنگھ نے کہا کہ وزیر اعظم آندریج پلینکووچ کا دورہ ہندستان دونوں ممالک کے درمیان تعلیم اور ثقافتی تعلقات کو ایک نئی سمت دے گا۔ وزیر اعظم آندریج پلینکووچ نے کہا کہ ہندستان اور کروشیا کے درمیان تعلیم، ثقافت، سیاحت اور اختراع کے شعبوں میں تعاون کے بے پناہ امکانات ہیں اور یونیورسٹیوں کے درمیان بات چیت اس شراکت داری کو مضبوط کرے گی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 فروری 2026

مولانا آزاد کی برسی پر خراج عقیدت

نئی دہلی: مولانا ابوالکلام آزاد کے 68ویں یوم وفات کے موقع پر آئی سی سی آر اور فرینڈز فار ایجوکیشن کی جانب سے ان کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ اس موقع

پر آئی سی سی آر کے ڈپٹی ڈائرکٹر گوپال کرشنن، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے سابق چانسلر فیروز بخت احمد، مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی، محمد یوسف نظامی وغیرہ نے شرکت کی۔ فیروز بخت احمد نے اس موقع پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ مزار آزاد کے اطراف ہزاروں پھیری والے، ٹھیلے والے اور دوسرے لوگوں نے قبضہ کر رکھا ہے۔ متعدد بار حکومت کے مختلف اداروں سے شکایت بھی کی گئی لیکن آج تک وہاں سے بازار نہیں ہٹایا گیا۔ 'انٹر فیتھ ہارمنی فاؤنڈیشن آف انڈیا' کے سربراہ ڈاکٹر خواجہ افتخار احمد نے کہا کہ بھارت رتن مولانا ابوالکلام آزاد کی قومی خدمات کے اعتراف میں مسلمانان ہند بھی عدل نہ کرنے کے مجرم ہیں۔ معروف قانون داں محمد اطیب صدیقی نے کہا کہ مولانا آزاد باہمی یگانگی اور ہندوستان کے قومی تحریک کے مقتدر و معتبر رہنما تھے۔ مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی نے کہا کہ رہنما مولانا آزاد سے ترغیب لیں اور عوام کو امن، چین، یگانگی اور آپسی بھائی چارے کا سبق دیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 فروری 2026

قومی سمپوزیم

نئی دہلی: سروجنی نائیڈو سینٹر فار ویمن اسٹڈیز (ایس این سی ڈبلیو ایس)، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے دی بک ریویو لٹریری ٹرسٹ کے تعاون سے 17 فروری 2026

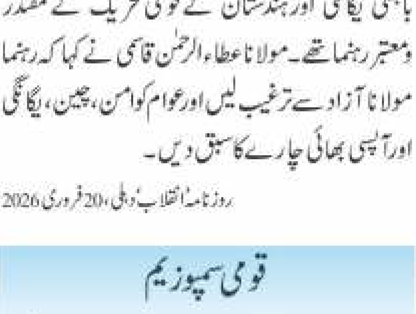

کو 'تحریر، جائزہ، ترجمہ: خواتین، الفاظ اور دنیا' کے موضوع پر ایک روزہ قومی سمپوزیم کا انعقاد کیا۔ سمپوزیم میں خواتین کی ادبی تخلیق، ترجمے کے چیلنجز اور امکانات پر غور و خوض کرنے کے لیے نامور مصنفین، تجزیہ نگار، مترجم، مدیران اور اسکالرز کو جمع کیا گیا۔ پروگرام کا آغاز سروجنی نائیڈو سینٹر فار ویمن اسٹڈیز کے ڈائرکٹر پروفیسر نشاط زیدی کے افتتاحی خطاب سے ہوا جنھوں نے سروجنی نائیڈو سینٹر فار ویمن اسٹڈیز کے 25 سال مکمل ہونے پر اس کے سفر اور کامیابیوں کا خاکہ پیش کیا۔ دی بک ریویو لٹریری ٹرسٹ کی بانی ایڈیٹر محترمہ چندرا چاری نے دی بک ریویو جریدے کی ابتدا اور مقاصد اور ہندوستان میں تنقیدی ادبی ثقافت کو فروغ دینے کے لیے اس کے مستقل عزم کے بارے میں اجتماع سے خطاب کیا۔ پہلا سیشن، جس کا عنوان تھا 'جائزہ لینا، لکھنا، پبلشنگ ویمن ۔ صنفی ادبی مناظر کی تنقیدی تلاش'، ڈاکٹر آرتی مندھوانی نے نظامت کی۔ پینل میں ڈاکٹر سیمین علی، محترمہ رچنا کالرا، ڈاکٹر مالویکا مہیشوری، ڈاکٹر سچریتا سینگپتا اور ڈاکٹر کنوپریا ڈھینگرا شامل تھے۔ دوسرے سیشن، 'شہر کی تحریر' جس کی نظامت ڈاکٹر فیض اللہ نے کی، مقررین انتیا واجپئی، ایکتا چوہان اور ایشوریہ جھا نے شہر کی یادداشت، تبدیلی اور اثر کے مقام کے طور پر عکاسی کی۔ تیسرا سیشن 'تحریر/ترجمہ خواتین' تھا جس کو ڈاکٹر آمنہ حسین، اسسٹنٹ پروفیسر، ایس این سی ڈبلیو ایس موڈریٹ کیا۔ اس پینل میں ہندی کی مشہور مصنفہ مردولا گرگ، معروف مترجم، پروفیسر ارجمند آرا، ڈاکٹر دیبا ظفر اور ڈاکٹر فردوس عظمت صدیقی شامل تھے۔ سمپوزیم کا اختتام ڈاکٹر آمنہ حسین کے شکریہ کے کلمات پر ہوا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 24 فروری 2026

توسیعی خطبہ

نئی دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ فارسی کے ایرانولوجی ہال میں فارسی داستان نویسی کے عنوان سے توسیعی خطبہ کا انعقاد عمل میں آیا جس کی صدارت پروفیسر سید کلیم اصغر نے کی جبکہ ڈاکٹر قہرمان سلیمانی ڈائرکٹر مجلس تحقیقات ایران کلچر ہاؤس نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ آج کے اس خطبہ کے مقررین ایران سے آئے مشہور ناول نگار مجید قیصری، سید احمد

بطحائی اور خانم میترا بیات تھے۔ مجید قیصری نے اپنے خطاب میں داستان نویسی اور اس کی افادیت پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے مشرق و مغرب کی داستان نویسی کے امتیازات پر بھی روشنی ڈالی۔ سید احمد بطحائی نے کہا کہ ہمارے معاشرہ کا ہر فرد ایک داستان رکھتا ہے مگر کچھ لوگ اس کو قلم بند کر کے زندہ جاوید بنا دیتے ہیں جس سے دوسرے لوگ استفادہ کرتے ہیں۔ پروفیسر کلیم اصغر نے اپنے صدارتی کلمات کے ساتھ مہمانوں کا شکریہ بھی ادا کیا اور کہا کہ یہ ہماری اور ہمارے طلبہ کی خوش نصیبی ہے کہ ایران کے مشہور داستان گو اور ڈرامہ نویس آج ہمارے درمیان موجود ہیں اور ہم براہ راست ان سے استفادہ کر رہے ہیں۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر زہرا خانم نے انجام دیے۔ اس پروگرام میں اساتذہ کے علاوہ بڑی تعداد میں طلبا و طالبات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 26 فروری 2026

تقسیم انعامات

نئی دہلی: اردو اکادمی، دہلی کے زیر اہتمام سال 2025 کے تعلیمی و ثقافتی مقابلوں میں کامیاب طلبہ کے اعزاز میں 24 فروری 2026 کو ایوان غالب، ماتا سندری لین، نئی

دہلی میں جلسہ تقسیم انعامات منعقد ہوا۔ تقریب میں دہلی کے مختلف اسکولوں کے طلبہ و طالبات، اساتذہ اور والدین نے شرکت کی۔ یہ تعلیمی مقابلے 20 اگست تا 8 ستمبر 2025 اردو اسکولوں کے طلبا و طالبات کے درمیان منعقد کیے گئے تھے، جن میں تحریری امتحانات مضمون نویسی، تقریری، کوئز، غزل سرائی، اردو ڈراما، بیت بازی، گروپ سانگ، بلند خوانی اور امنگ پینٹنگ

جیسے متنوع مقابلے شامل تھے، تقریباً 1663 طلبا و طالبات نے ان مقابلوں میں حصہ لیا تھا، جن میں سے 265 طلبہ مختلف زمروں میں کامیاب قرار پائے گئے تھے۔ اس موقع پر محکمہ فن، ثقافت والسنہ، حکومت دہلی کے ایڈیشنل سکریٹری اور اردو اکادمی کے سکریٹری جناب لیکھ راج نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اردو نہ صرف ایک دلنشیں زبان ہے بلکہ باوقار تہذیب کی نمائندہ بھی ہے۔ انھوں نے تعلیمی وثقافتی مقابلوں میں طلبہ کی بڑی تعداد میں شرکت کو نئی نسل میں اردو کے بڑھتے شوق کا ثبوت قرار دیا۔ انھوں نے یہ اعلان بھی کیا کہ آئندہ مقابلوں کے زمروں میں اضافہ کیا جائے گا تاکہ زیادہ سے زیادہ طلبہ کو اظہار کا موقع مل سکے۔ جلسہ تقسیم انعامات میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے طلبہ میں نقد انعامات، اسناد اور مومنٹو تقسیم کیے گئے۔ پروگرام کی نظامت ریشما فاروقی نے کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 16 فروری 2026

تحقیقی مقالوں کی نمائش

نئی دہلی: دہلی یونیورسٹی کے 102 ویں سالانہ جلسہ تقسیم اسناد کے تحت یونیورسٹی کی لائبریری کی جانب

سے ڈاکٹری تحقیقی مقالوں کی 26 ویں نمائش کا اہتمام کیا گیا، جو تین مارچ تک جاری رہے گی۔ افتتاحی تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے وائس چانسلر پروفیسر یوگیش سنگھ نے شرکت کی اور کہا کہ لائبریری کے بغیر کسی بھی یونیورسٹی کا وجود ممکن نہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ علمی تقریب یونیورسٹی میں تحقیقی امتیاز، جدت طرازی اور علم کی تخلیق کی روایت کو فروغ دینے کی ایک اہم کوشش ہے۔ افتتاح کے بعد وائس چانسلر نے نمائش میں پیش کیے گئے تحقیقی مقالوں کا معائنہ کیا اور ''یونیورسٹی آف دہلی: ڈاکٹری تحقیق'' پر مبنی کتاب کا اجرا کیا۔ تقریب میں بطور مہمان اعزازی انل کے اینجا نے کہا کہ جدید ٹیکنالوجی طلبہ کے لیے سیکھنے کا موثر ذریعہ ہے، تاہم اصل تحقیق کی پہچان جدت، علمی دیانت اور فکری نظم وضبط سے ہوتی ہے۔ یونیورسٹی کی لائبریری کے صدر ڈاکٹر راجیش کمار سنگھ نے استقبالیہ تقریر میں بتایا کہ اس نمائش میں مجموعی طور پر 613 تحقیقی مقالے شامل کیے گئے ہیں جو یونیورسٹی کی مضبوط تحقیقی روایت کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس موقع پر اساتذہ، محققین اور طلبہ موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 فروری 2026

بچپن گروپ

نئی دہلی: ادب اطفال کے ''بچپن گروپ'' کے چھ سالہ کامیاب سفر کی تقریب آن لائن یوم تاسیس کی صورت میں منعقد ہوئی۔ جس میں ہندستان، ایشا کے علاوہ دیگر ممالک، امریکہ، کناڈا، ماریشس، دبئی اور سعودی عرب کے مختلف شہروں میں بچوں کا ادب لکھنے والے قلمکاروں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ بچپن گروپ کے سرپرست وایڈمن سراج عظیم نے اس موقع پر بچوں کا ادب لکھنے والے قلمکاروں کی آن لائن پروگرام میں شمولیت پر خوشی کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر حبیب سیفی نے بچپن کے چھ سالہ سفر پر اظہار مسرت کیا، اس موقع پر ایڈمن کو مبارکباد دی، اور کہا قومی اردو کونسل سے جڑے کچھ نئے لکھنے والوں کو حوصلہ ملا ہے، اس کا اعتراف ضروری ہے۔ ڈاکٹر شمس اقبال ڈائرکٹر قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو بہر طور لائق مبارکباد ہیں، جنھوں نے اردو زبان میں بچوں کی دلچسپی پر مبنی عمدہ کتابیں شائع کرانے میں خصوصی توجہ دی اور یہ تاریخی نوعیت کا کام ہوا۔ اس موقع پر جن قلمکاروں کی کتابوں کا ذکر خاص طور سے ہوا ان میں حبیب سیفی کی ''موبائل کھلونا نہیں'' اور ''بلیک بورڈ''، شاہ تاج خان کی کہانی ''پاکی'' اور سراج عظیم کی ''میں ہوں انڈیا گیٹ'' شامل ہے۔ شاہ تاج خان، ڈاکٹر فہمیدہ جمیل، نجیب پاشا، نے بچپن گروپ کو ادب اطفال کی ضرورت قرار دیا۔ رحمت اللہ بشیر مقیم امریکہ نے تاثرات پیش کیے۔ اہم شرکا میں رحمت اللہ بشیر، رشید صاحب، عرفان علی، شائل عبد اللہ، ہادیہ، فرخندہ ضمیر، عبد الغفار دانش، نعیمہ امتیاز، مقصود سیتا پوری، دلشاد حسین اصلاحی، ذوالفقار بخاری، مجید عارف، ملک راجہ آفریدی، ڈاکٹر فہمیدہ جمیل، ڈاکٹر فرخندہ لودھی نے بچپن گروپ کی ستائش کی۔ شرکا نے مشترکہ طور پر کہا کہ بچپن گروپ کے ذریعے بچوں کے ادب کا فروغ ہوا ہے۔ چھ سال کا سفر کامیاب سفر ہے۔ سراج عظیم نے شریک ہونے والے قلمکاروں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 28 فروری 2026

جلسہ تقسیم اسناد

نئی دہلی: دہلی یونیورسٹی کے 102 ویں جلسہ تقسیم اسناد میں نہ صرف ڈگریاں تقسیم کی گئیں بلکہ اعلیٰ تعلیم اور خواتین کو بااختیار بنانے کے بدلتے چہرے کی ایک نئی

تصویر بھی پیش کی گئی۔ تقریب کے مہمان خصوصی نائب صدر جمہوریہ سی پی رادھا کرشنن نے طلبہ کو 'وکست بھارت' کے تخلیق کار بتاتے ہوئے کہا کہ یونیورسٹیوں کو ہندستانی حقائق پر مبنی تحقیق اور اختراع کے عالمی سطح پر مسابقتی ماڈل بننا ہوگا۔ جلسہ تقسیم اسناد میں ایک لاکھ 20 ہزار 408 طلبہ کو ڈگریاں دی گئیں، جن میں طالبات کی تعداد طلبا سے زیادہ تھی۔ نائب صدر جمہوریہ نے کہا کہ ڈگریاں محض سرٹیفکیٹ ہیں، لیکن حقیقی تعلیم انسانیت، کردار اور ذمہ داری کی عکاسی کرتی ہے۔ طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے نائب صدر جمہوریہ نے کہا کہ تعلیم زندگی کا آخری مرحلہ نہیں ہے بلکہ ایک جاری عمل ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ علم حاصل کرنا ایک مسلسل عمل ہے اور کوئی طاقت اعلیٰ تعلیم کی ترقی کو نہیں روک سکتی۔

تقریب کی صدارت وائس چانسلر یوگیش سنگھ نے کی۔ یونیورسٹی کی روایت پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ عالمی بحرانوں اور مشکل وقتوں کے باوجود ادارے نے ہر سال کانووکیشن کا انعقاد کر کے علمی تسلسل کی مثال قائم کی ہے۔ انھوں نے وضاحت کی کہ یونیورسٹی صرف تین کالجوں، دو فیکلٹیوں اور 750 طلبہ کے ساتھ شروع ہوئی تھی، جبکہ آج اس میں 16 فیکلٹی، 86 شعبہ

جات، 90 کالجز اور 6 لاکھ سے زائد طلبہ ہیں۔ 347 پی ایچ ڈی کی ڈگریاں بھی دی گئیں، جن میں سب سے زیادہ تحقیقی ڈگریاں فیکلٹی آف آرٹس سے آئیں۔

روزنامہ' انقلاب' دہلی، 1 مارچ 2026

گوپی چند نارنگ یادگاری خطبہ

نئی دہلی: پریم چند آرکائیوز اینڈ لٹریری سینٹر، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام 26 فروری 2026 کو پہلا گوپی چند نارنگ یادگاری خطبہ منعقد کیا گیا۔

پروفیسر کوثر مظہری، صدر شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے یادگاری خطبہ دیا اور پروگرام کی صدارت پروفیسر خالد محمود، سابق، صدر شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی نے فرمائی۔ اس موقعے پر پروفیسر شہزاد انجم، ڈائرکٹر آرکائیوز نے پروگرام کا افتتاح کرتے ہوئے پروفیسر مظہر آصف، شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور پروفیسر محمد مہتاب عالم رضوی، مسجل، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جانب سے آرکائیوز کی سرگرمیوں کی سرپرستی کے سلسلے میں حاصل مستقل تعاون اور ان کی مشفقانہ سرپرستی کے لیے ان کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے پروفیسر کوثر مظہری، صدر، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کا 'متن اور قرأت کا باہمی رشتہ' کے عنوان پر خطبہ پیش کرنے کی دعوت قبول کرنے کے لیے شکریہ ادا کیا۔ قابل ذکر ہے کہ اردو نظم اور ادبی تنقید کے باب میں پروفیسر مظہری کی خدمات انتہائی وقیع ہیں۔ انھوں نے دانشورانہ فکر، تنقیدی گہرائی وگیرائی اور سادگی و پرکار لہجے کے ساتھ موضوع پر دسترس سے سامعین کا دل جیت لیا۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر خالد محمود نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کے ساتھ اپنے گہرے تعلقات اور طویل تجربات بھی سامعین سے ساجھا کیے۔

روزنامہ' ہمارا سماج' دہلی، 3 مارچ 2026

عالمی یوم خواتین

نئی دہلی: اسلام میں عورتوں کے حقوق اور ان کے مقام و مرتبے کو صدیوں پہلے ہی واضح اور متعین کر دیا

گیا ہے۔ اس لیے مسلمانوں کی بنیادی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اسلام کی حقیقی تعلیمات کو سمجھیں اور انھیں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا عملی حصہ بنائیں۔ اگر مرد دیانت داری اور ذمے داری کے احساس کے ساتھ عورت کے جائز اور شرعی حقوق ادا کرے اور معاشرہ ان حقوق کے احترام اور تحفظ کو یقینی بنائے تو خواتین سے متعلق بہت سے مسائل خود بخود ختم ہو سکتے ہیں اور ایک ایسا معاشرہ تشکیل پا سکتا ہے جو عدل، توازن اور باہمی احترام کی مضبوط بنیاد پر قائم ہو۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر اقتدار محمد خان، صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز اور ڈین فیکلٹی آف ہیومینٹیز اینڈ لینگویجز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی نے شعبہ اسلامک اسٹڈیز کی ''وومن سیل'' اور ''صنفی آگہی کمیٹی'' کے زیر اہتمام عالمی یوم خواتین کی مناسبت سے منعقد ایک پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ خواتین کی بااختیاری کے جدید مباحث میں عموماً تعلیم، ملازمت اور معاشی خودمختاری جیسے پہلوؤں کو مرکزی حیثیت دی جاتی ہے۔ بلاشبہ یہ امور اپنی جگہ نہایت اہم ہیں، تاہم اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ عورت خاندان کی بنیاد اور گھریلو نظام کے توازن، استحکام اور تربیت نسل کی مرکزی قوت ہے، نیز گھر کی تنظیم و ترتیب، بچوں کی موثر تربیت اور خاندانی مسائل کے حل میں اس کی حکمت، صبر اور بصیرت کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔

روزنامہ' ہمارا سماج' دہلی، 7 مارچ 2026

لوک ادب میں نسوانی کردار

نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی کی جانب سے عالمی یوم خواتین کے موقعے پر ''لوک ادب میں نسوانی کردار نگاری'' کے موضوع پر ایک روزہ مذاکرہ منعقد کیا گیا۔ پروگرام میں

ملک کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے لوک ادب کے ماہرین اور محققین نے شرکت کی اور لوک روایتوں میں خواتین کے کردار پر گفتگو کی۔ پروگرام کے آغاز پر اکیڈمی کی پروگرام افسر مرگنینی گپتا نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ لوک ادب کسی بھی سماج کے جذبات اور تجربات کی عکاسی کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ لوک گیتوں، کہانیوں اور روایات میں عورت مختلف کرداروں میں نظر آتی ہے۔ اس موقعے پر لوک ادب کی ماہر ماولی کوشل آن لائن شریک ہوئیں۔ انھوں نے نسوانی قوت کے حوالے سے شیو اور پاروتی کے اساطیری بیانیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان روایات میں پاروتی کو طاقت کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے۔ پہلے پروگرام میں لوک ادیبہ پریتی آر یہ نے کماؤں کے لوک ادب پر گفتگو کی۔ ایسٹر سمویل نے انڈمان کی لوک روایات اور خواتین کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا ذکر کیا جبکہ سواتی آنند نے چھتیس گڑھ کے لوک ادب پر روشنی ڈالی۔ پروگرام کی صدارت سگندھا ناگر ترویدی نے کی۔ انھوں نے اپنی گفتگو میں گوجر سماج کے لوک گیتوں پر مبنی کتاب ''گجری لوک گیت'' کا ذکر کیا اور آشا دیوی گجری کا حوالہ دیا۔ پروگرام کے اختتام پر اما کاچی مراک نے گارو زبان میں لوک گیت پیش کیا۔ دوسرے پروگرام میں جورام آنیا تانا نے نشی قبیلے کے لوک ادب پر گفتگو کی اور اروناچل پردیش کی قبائلی روایات کا ذکر کیا۔ اس کے بعد ماہیشوری ویرسنگ گاویت نے آدیواسی لوک ادب میں خواتین کے مقام پر اظہار خیال کیا۔ پروگرام کی صدارت وندنا ٹیٹے نے کی، جنھوں نے کہا کہ لوک ادب نسل در نسل منتقل ہونے والی تہذیبی روایت کا حصہ ہے۔ تیسرے پروگرام کا آغاز ایسٹر سمویل کے پیش کردہ نکوباری لوک گیت سے ہوا۔ گارو ادب کی محققہ باربرا نے گارو خواتین کی روایات پر روشنی ڈالی جبکہ بینی سمی یاتھن نے ناگالینڈ کے قبائلی لوک ادب اور اس میں خواتین کے کردار کا ذکر کیا۔ پروگرام کی صدارت لوک ادیبہ گیتا نے کی، جنھوں نے بنجارہ خواتین کے لوک

ادب اور ثقافتی روایات پر گفتگو کی۔ پروگرام کے اختتام پر اکیڈمی کی معاون مدیر لکشمی کماری بھگت نے شکریہ ادا کیا جبکہ نظامت مرگنینی گپتا نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 مارچ 2026

اتر پردیش

لوک ادب پر قومی سمپوزیم

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ جدید بھارتی زبانیں کے مراٹھی سیکشن کی جانب سے ''بھارتی لوک

ادب کے سماجی و ثقافتی پہلو'' کے موضوع پر دو روزہ قومی سمپوزیم 11 اور 12 فروری کو عالمی یوم مادری زبان کی مناسبت سے منعقد کیا گیا۔ اختتامی اجلاس سے بطور مہمان خصوصی خطاب کرتے ہوئے پروفیسر محمد محسن خان نے بھارتی لوک ادب کو ملک کے مختلف خطوں کے عوام کی روح کی عکاسی کرنے والا زندہ ثقافتی ورثہ قرار دیا۔ انھوں نے تیز رفتار جدیدیت کے دور میں ثقافتی شناخت کے تحفظ کے لیے زبانی روایات کے منظم ذخیرے، حفاظت اور ڈیجیٹلائزیشن کی ضرورت پر زور دیا۔ مہمان خصوصی پروفیسر وبھا شرما نے کہا کہ لوک ادب زندہ ثقافت کا آئینہ ہے، جو اخلاقی اقدار، اجتماعی یاد داشت اور سماجی شعور کا امین ہے۔ انھوں نے برج اور ہاتھرس کی راس روایت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس کا نوٹنکی سے گہرا تعلق ہے، جو عوامی پیشکش پر مبنی ایک ترقی یافتہ تھیٹرائی اظہار ہے۔ سمپوزیم کے ڈائرکٹر ڈاکٹر طاہر ایچ پٹھان نے رپورٹ پیش کرتے ہوئے لوک ادب کی سادگی، ابلاغیت اور جذباتی گہرائی کو اس کی مستقل معنویت کی بنیاد قرار دیا۔ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین پروفیسر ٹی این ستی شن نے سماجی تاریخ، ثقافتی اقدار اور مقامی علمی روایات کے تحفظ میں لوک روایات کے کردار کو اجاگر کیا اور عالمگیریت سے پیدا ہونے والے چیلنجز سے خبردار کیا۔ مہاراشٹر، پنجاب، کیرالہ، تمل ناڈو، اڈیشہ، گوا، جموں و کشمیر، بہار، اتر پردیش، کرناٹک، تلنگانہ، ہریانہ، مغربی بنگال اور آندھرا پردیش سمیت مختلف ریاستوں کی جامعات سے آئے ماہرین نے سمپوزیم میں شرکت کی، جس میں 51 تحقیقی مقالات پیش کیے گئے۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر آمنہ خاتون نے کی، جبکہ پروفیسر کرانتی پال نے اظہار تشکر پیش کیا۔

روزنامہ 'تاثیر' دہلی، 14 فروری 2026

ضیاء الدین برنی بحیثیت مورخ

اعظم گڑھ: شبلی نیشنل کالج کے شعبہ تاریخ کے زیر اہتمام آج ایک توسیعی لیکچر بعنوان ''برنی بحیثیت مورخ: ایک تنقیدی جائزہ'' منعقد ہوا، جس میں قرون وسطیٰ کے ممتاز مورخ ضیاء الدین برنی کی تاریخ نویسی، فکری جہات اور تنقیدی پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو کی

گئی۔ اس موقع پر خصوصی مقرر سابق ڈین و صدر شعبہ تاریخ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین تھے، جبکہ صدارتی خطاب International Islamic University Malaysia کے پروفیسر ارشد اسلام نے پیش کیا۔ پروگرام کے کنوینر صدر شعبہ تاریخ پروفیسر علاؤ الدین خاں تھے۔ پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین نے ضیاء الدین برنی کی تصانیف، بالخصوص تاریخ فیروز شاہی اور فتاویٰ جہاں داری کا تجزیاتی جائزہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ برنی محض واقعاتی مورخ نہیں بلکہ ایک صاحب فکر اور نظریہ ساز دانشور تھے، جن کے یہاں سلطنتی نظم، طبقاتی ساخت اور حکمرانی کے اصول نمایاں نظر آتے ہیں۔ انھوں نے واضح کیا کہ برنی کی تحریروں میں درباری وابستگی اور اشرافی نقطہ نظر کا غلبہ ضرور ہے، لیکن اس کے باوجود ان کا کام عہد وسطیٰ کے سیاسی نظریات، ریاستی ڈھانچے اور سماجی نظام کو سمجھنے کے لیے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر ارشد اسلام نے کہا کہ اس نوعیت کے علمی پروگرام طلبہ میں تحقیقی ذوق اور تجزیاتی فکر کو فروغ دیتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ برنی جیسے مورخین پر اس طرح کے لیکچر وقت کی اہم ضرورت ہیں۔ پروگرام کے کنوینر پروفیسر علاؤ الدین خاں نے ابتدائی کلمات میں موضوع کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ برنی کی تاریخ نویسی کو محض روایتی بیانیہ تک محدود کرنا درست نہیں، بلکہ اسے فکری اور نظریاتی تاریخ کے طور پر سمجھا جانا چاہیے۔ آخر میں سوال و جواب کا دور ہوا جس میں طلبہ و طالبات نے کثیر تعداد میں شرکت کرتے ہوئے علمی سوالات پیش کیے۔ پروگرام میں شعبہ تاریخ اور دیگر شعبوں کے اساتذہ و ریسرچ اسکالرز کی بڑی تعداد موجود تھی۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر ابو رافع نے کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 15 فروری 2026

بھارتیہ بھاشا پریوار

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ لسانیات کے زیر اہتمام وزارت تعلیم، حکومت ہند کی بھارتیہ بھاشا سمیتی

کے اشتراک سے 'بھارتیہ بھاشا پریوار: لسانیات میں ایک نیا تناظر' کے عنوان پر دو روزہ قومی کانفرنس کا آغاز ہوا جس میں ملک کے ممتاز ماہرین لسانیات اور دانشوران نے شرکت کی۔ یونیورسٹی پولی ٹیکنیک کے آڈیٹوریم میں منعقدہ افتتاحی اجلاس میں ہندوستانی زبانوں کو ایک جامع اور اشتراکی فریم ورک میں از سر نو سمجھنے کی علمی اور قومی اہمیت کو اجاگر کیا گیا۔ افتتاحی خطاب میں وزارت تعلیم کے جوائنٹ سکریٹری ڈاکٹر پنکج کے پی شریا سکر نے لسانی تنوع کو ہندوستان کی تہذیبی طاقت کی علامت قرار دیا۔ انھوں نے کشادہ نظری اور شمولیت پر زور دیتے ہوئے مختلف ذرائع سے علم حاصل کرنے، تکنیکی جدت کو فروغ دینے اور ہمہ گیر تعلیم کو آگے بڑھانے کی ضرورت پر زور دیا۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے نصاب میں قدیم ہندوستانی علمی روایتوں اور ماحولیاتی شعور کی شمولیت، کثیر لسانی تعلیم کے راستوں کی تشکیل اور اسکولی سطح سے ہی مصنوعی ذہانت کی تعلیم متعارف کرانے پر روشنی ڈالی تا کہ نئی نسل کو مستقبل کے چیلنجوں کے لیے تیار کرایا جاسکے۔ اپنے

صدارتی کلمات میں اے ایم یو کے پرو وائس چانسلر پروفیسر محمد محسن خان نے بھارتیہ بھاشا پریوار کی قومی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستانی زبانوں اور کثیر لسانیت کا فروغ موجودہ تعلیمی ترجیحات کا اہم حصہ ہے۔ انھوں نے لسانیات کے شعبے پر زور دیا کہ وہ ڈیجیٹلائزیشن، ترجمہ اور زبانوں کی منظم دستاویز سازی جیسے اہم مسائل پر توجہ دے تاکہ ڈیجیٹل دور میں ہندوستانی زبانوں کی بقا اور ترقی یقینی بنائی جا سکے۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبہ لسانیات کی پروفیسر شوبھا ستیاناتھ نے کانفرنس کو عالمگیریت کے ایک نئے مرحلے میں بروقت علمی اقدام قرار دیا۔ انھوں نے ہندوستانی نقطہ نظر سے لسانیات پر از سر نو غور کرنے اور انسانی و سماجی علوم کو مقامی فکری روایتوں کے تناظر میں دیکھنے کی ضرورت پر زور دیا۔ اے ایم یو رجسٹرار پروفیسر عاصم ظفر نے شعبہ لسانیات کی جانب سے قومی اہمیت کی حامل کانفرنس کے انعقاد کو سراہتے ہوئے اے ایم یو کو اجتماعی یادداشت اور فکری تنوع کا مرکز قرار دیا۔ فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین پروفیسر ٹی این ستھیسن نے ہندوستان کے لسانی تنوع اور زبانوں کے درمیان گہرے ساختی و ثقافتی روابط پر روشنی ڈالی۔ اس سے قبل شعبہ لسانیات کے چیئرمین پروفیسر ایم جے وارثی نے خطبہ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے کانفرنس کے موضوع کا تعارف کرایا اور بھارتیہ بھاشا پریوار کو مشترکہ تہذیبی وراثت قرار دیتے ہوئے اس پر تحقیق کو فروغ دینے کی ضرورت پر زور دیا۔ افتتاحی اجلاس میں ''بک آف ایسٹریکٹس''، ''علی گڑھ جرنل آف لنگوسٹکس'' کے تازہ شمارے، دو مرتبہ کتب ''بھارتیہ بھاشا پریوار: اے نیو فریم ورک ان لنگوسٹکس'' اور ''بھارتیہ بھاشا پریوار: پرسپیکٹیوز اینڈ ہورائزنس'' کے ساتھ ساتھ ایم جے وارثی، پلوو شنو اور نعمان طاہر کی مرتب کردہ کتاب ''ٹرانسلیشن ایکروز کلچرز ان ملٹی لنگول انڈیا'' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 17 فروری 2026

دوروزہ ورکشاپ

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سینٹر آف ایڈوانسڈ اسٹڈی، شعبہ تاریخ (آثار قدیمہ سیکشن) کے زیر اہتمام ''ہڑپا کے آثار قدیمہ'' کے موضوع پر دوروزہ ورکشاپ منعقد کی گئی، جس میں ممتاز ماہرین آثار قدیمہ اور اسکالرز

نے شرکت کرتے ہوئے وادی سندھ کی تہذیب سے متعلق حالیہ دریافتوں پر تبادلہ خیال کیا۔ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا (اے ایس آئی) کے ایڈیشنل ڈائرکٹر جنرل ڈاکٹر سنجے کمار منجل مہمان خصوصی کے طور پر شریک ہوئے، جبکہ جوائنٹ ڈائرکٹر جنرل ڈاکٹر ارون منجل مہمان اعزازی تھے۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر سید علی ندیم رضاوی نے کی اور استقبالیہ کلمات پروفیسر حسن امام نے پیش کیے۔ آثار قدیمہ سیکشن کے کنوینر اور انچارج پروفیسر مانویندر کمار پنڈھیر نے ہندوستانی تاریخ میں ہڑپا مطالعات کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ورکشاپ کے مقصد، یعنی جدید تحقیقی نتائج کو طلبہ اور محققین تک پہنچانے پر زور دیا۔ اپنے کلیدی خطاب میں ڈاکٹر سنجے کمار منجل نے ہڑپا کے مقامات کی حالیہ کھدائیوں میں سائنسی طریقوں اور جدید ٹکنالوجی کے بڑھتے ہوئے کردار پر زور دیا۔ صدارتی کلمات میں پروفیسر رضاوی نے ہڑپا کی تہذیب کی اصطلاح اور اس کی تشریحات سے متعلق جاری علمی مباحث پر گفتگو کی۔ پانچ تکنیکی نشستوں کے دوران ماہرین نے حالیہ کھدائیوں اور نئی تعبیرات پر مبنی لیکچرز پیش کیے۔ ڈاکٹر ارون منجل نے ہڑپا کی اہم کھدائیوں اور ان کے نتائج کا جائزہ پیش کیا، جبکہ ڈاکٹر سنجے کمار منجل نے راکھی گڑھی میں ہونے والی حالیہ کھدائیوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ ورکشاپ کے دوران دو نمائشوں کا بھی اہتمام کیا گیا، جن میں ایک علی گڑھ خطے (ہاتھرس) کے مجسموں پر اور دوسری کیمرے کی نظر سے شاہجہان آباد کی السٹریٹیڈ تاریخ کے عنوان پر تھی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 20 فروری 2026

رفیع احمد قدوائی

بارہ بنکی: تعلیمی و سماجی شخصیت رفیع احمد میموریل ٹرسٹ کے صدر ڈاکٹر عمار رضوی نے 18 فروری 2026 کو عظیم مجاہد آزادی اور سابق مرکزی وزیر رفیع احمد قدوائی کے یوم پیدائش کے موقع پر منعقدہ تقریبات میں شرکت کرتے ہوئے انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔ یہ پروگرام رفیع احمد قدوائی میموریل ٹرسٹ، مسولی، بارہ بنکی کی جانب سے منعقد کیا گیا، جس میں علاقے کے معززین اور عوام کی بڑی تعداد شریک ہوئی۔ اس موقع

پر ڈاکٹر رضوی نے مسولی میں واقع مرحوم رفیع احمد قدوائی کے مزار پر حاضری دی، چادر پوشی کی۔ تقریب میں موجود عوام نے آزادی ہند کی جدوجہد میں رفیع احمد قدوائی کی بے مثال قربانیوں اور عوامی خدمات کو نہایت احترام کے ساتھ یاد کیا۔ اس موقع پر خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر عمار رضوی نے کہا کہ رفیع احمد قدوائی کی شخصیت سادگی، دیانت اور عوامی خدمت کی روشن مثال تھی۔ انھوں نے اس بات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ طویل عرصہ اقتدار میں رہنے کے باوجود ان کے خاندان کے پاس ذاتی مکان تک نہیں تھا۔ تقریب میں معزز شخصیات اور علاقے کے عوام کی بڑی تعداد موجود رہی۔ تقریب کا ماحول عقیدت، احترام اور قومی یکجہتی کے جذبات سے معمور رہا، جہاں رفیع احمد قدوائی کی جدوجہد اور عوامی خدمات کو یاد کرتے ہوئے ان کے نقش قدم پر چلنے کے عزم کا اظہار کیا گیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 20 فروری 2026

عالمی یوم مادری زبان

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے شعبہ لسانیات نے عالمی یوم مادری زبان کے موقع پر

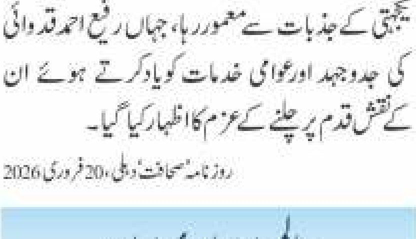

مسعود حسین خاں لسانیاتی سوسائٹی کے زیر اہتمام ایک خصوصی آن لائن لیکچر کا اہتمام کیا۔ سنٹر فار اپلائیڈ لنگوسٹکس اینڈ ٹرانسلیشن اسٹڈیز، یونیورسٹی آف حیدرآباد کے پروفیسر نریش اینم نے ''زبان، ادب اور ثقافت

کے تحفظ وفروغ میں ترجمہ کا اہم کردار' موضوع پر کلیدی خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے خصوصاً ہندستان جیسے کثیرلسانی ملک کے تناظر میں کثیرلسانیت کے فروغ، ثقافتی تبادلے کو مضبوط بنانے اورلسانی تنوع کے تحفظ میں ترجمے کے کردار پر روشنی ڈالی۔ قومی تعلیمی پالیسی (این ای پی 2020) کے اہداف ومقاصد پر زور دیتے ہوئے انھوں نے ہندستانی زبانوں میں ترجمے کی ضرورت اورڈیجیٹل دور میں آڈیو ویژول ترجمے کی بڑھتی ہوئی اہمیت پر بھی گفتگو کی۔ اس سے قبل شعبہ لسانیات کے چیئرمین پروفیسر ایم جے وارثی نے عالمی یوم مادری زبان کی اہمیت اورکثیرلسانی معاشروں میں مادری زبان کے سماجی ولسانی پہلوؤں پر اظہار خیال کیا۔ پروگرام کا اختتام لسانیاتی سوسائٹی کے سکریٹری مسعود علی بیگ کے اظہار تشکر کے ساتھ ہوا۔ اس موقع پر اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اورطلبہ کثیر تعداد میں موجود رہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 22 فروری 2026

فلسفہ اورتصوف

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے شعبہ فلسفہ کے ڈاکٹر عامر ریاض نے لکھنؤ یونیورسٹی کے زیراہتمام منعقدہ تین روزہ قومی سمینار بعنوان 'وٹگنسٹائن،

زبان کا فلسفہ اورتصوف' میں 'زبان کا فلسفہ، ہندستانی اورمغربی نقطہ ہائے نظر' کے موضوع پرخطاب کیا۔ انھوں نے لڈوگ وٹگنسٹائن کے نظریہ تصوف کا ایک جائزہ پیش کیا۔ انھوں نے وٹگنسٹائن کے افکاراوراسلامی فلاسفہ کی صوفیانہ تعبیرات کے درمیان خصوصاً ابن العربی کے پیش کردہ نظریہ وحدت الوجود کے حوالے سے مماثلتوں کو واضح کیا۔ اس کے ساتھ ہی شیخ احمد سرہندی اورشاہ ولی اللہ کے افکار میں موجود متعلقہ تصورات پر بھی روشنی ڈالی۔ ان فلسفیانہ موضوعات کی توضیح کے لیے انھوں نے مرزا غالب کے اشعار کا بھی حوالہ دیا، جو وحدت الوجود اورفنا کے تصورات کو شعری قالب میں بیان کرتے ہیں۔ سمینار کے دوسرے روز ڈاکٹر ریاض نے ایک اجلاس کی صدارت بھی کی، جس میں متعدد یونیورسٹیوں سے تعلق رکھنے والے محققین نے بیس سے زائد مقالات پیش کیے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 25 فروری 2026

ریسرچ ایسوسی ایشن

علی گڑھ: شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے رشید احمد صدیقی ہال میں ریسرچ ایسوسی ایشن کے تحت ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔ تحقیق کو فروغ دینے

اورطلبہ وطالبات میں ریسرچ سے لگاؤ پیدا کرنے میں شعبے کی ریسرچ ایسوسی ایشن کا اہم کردار ہے، جس کا قیام ہی اس لیے عمل میں آیا تھا تاکہ طلبہ وطالبات کو ایک پلیٹ فارم مل سکے۔ اس موقعے پر صدر شعبہ اردو پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی نے طلبہ وطالبات کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اس پلیٹ فارم سے فائدہ اٹھانا چاہیے، یہاں آپ کو اساتذہ کی رہنمائی حاصل ہے، آپ ایک پیپر لکھتے ہیں اورجب اسے اپنے اساتذہ کی موجودگی میں اپنے ساتھیوں کو سناتے ہیں تو اس سے اعتماد میں اضافہ ہوتا ہے۔ انھوں نے ریسرچ ایسوسی ایشن کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آپ کی تحقیقی صلاحیتوں کا فروغ ہی اس ایسوسی ایشن اوراس کے جلسوں کا بنیادی مقصد ہے۔ ایسوسی ایشن کے سکریٹری اورناظم جلسہ مسٹرعبدالوحید نے مہمانوں کا خیرمقدم کرتے ہوئے ایسوسی ایشن کے بارے میں گفتگو کی۔ اس پروگرام میں تین ریسرچ اسکالرز نے مقالے پیش کیے۔ مہمان خصوصی پروفیسر سید سراج الدین اجملی نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ریسرچ ایسوسی ایشن کے جلسے دراصل تربیتی ورکشاپ ہیں، یہاں اگر آپ اپنے تحقیقی مضامین پیش کرتے ہیں تو اس سے آپ کی تحقیق کو جلا ملے گی، اسی طرح اسٹیج پر مقالہ پڑھنے کی بھی ٹریننگ ہوگی۔ ڈاکٹر سعید الرحمٰن نے مقالہ پیش کرنے والے ریسرچ اسکالرز کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا کہ کتابوں میں جو باتیں درج ہیں ان کو نقل کردینا ہی مقالہ نہیں ہے بلکہ یہ ضروری ہے کہ آپ اپنا نقطہ نظر بھی بیان کریں اوربتائیں کہ متعدد ماخذ تک رسائی اورمطالعے کے بعد آپ کس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن نے نیشنل ایجوکیشن پالیسی 2020 پر روشنی ڈالی، انھوں نے کہا کہ نیشنل ایجوکیشن پالیسی حکومت کی ایک اہم پالیسی ہے جس میں مادری زبان کو اہمیت دی گئی ہے۔ پروفیسر محمد علی جوہر نے اظہار تشکر پیش کرتے ہوئے طلبہ وطالبات کو مطالعہ، مقالہ نویسی، اساتذہ سے استفادہ اور ایسوسی ایشن کے پروگراموں میں شرکت کو لازمی قرار دیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 27 فروری 2026

بہار

اردو محض زبان نہیں، تہذیبی شناخت ہے

مدھے پورہ: اردو ڈائرکٹوریٹ محکمہ کابینہ سکریٹری پٹنہ کے زیراہتمام مدھے پورہ کے تاریخی کلابھون میں اردو

زبان وادب کے فروغ اوراس کے تحفظ کے عنوان سے ایک عظیم الشان اردو سمینارومشاعرہ کا اہتمام کیا گیا، جس میں ضلع اوراطراف سے آئے ہوئے علما، دانشوران قوم، اساتذہ، شعرا، سماجی کارکنان اوراردو کے چاہنے والوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ پروگرام کا آغاز ارون کمار اے ڈی ایم مدھے پورہ، نوڈل آفیسر سرور عالم انصاری اوردیگر نے شمع روشن کرکے کیا۔ مقررین نے اردو زبان کی تاریخی اہمیت، اس کی شیرینی وشائستگی اورہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب میں اس کے کردار پر گفتگو کی۔ نوڈل آفیسر سرور عالم انصاری نے کہا کہ اردو محض ایک زبان نہیں بلکہ ہماری تہذیبی شناخت اورقومی یکجہتی کی علامت ہے۔ انھوں نے اس بات پرزور دیا کہ موجودہ دور میں اردو کے فروغ کے لیے عوامی سطح پر سنجیدہ اقدامات کی ضرورت ہے، خصوصاً تعلیمی اداروں میں اردو کی تدریس کو مضبوط بنانے اورنئی نسل کو اس

زبان سے جوڑنے کی اشد ضرورت ہے۔ مقررین نے اپنے خطبات میں اس امر پر بھی روشنی ڈالی کہ اردو ادب نے ملک کی آزادی کی تحریک میں اہم کردار ادا کیا اور آج بھی اردو صحافت اور ادب سماجی بیداری کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ پروگرام کے اختتام پر منتظمین نے تمام لوگوں کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا اور امید ظاہر کی کہ آئندہ بھی اسی طرح کے علمی و ادبی پروگرام منعقد کرکے اردو زبان کے فروغ کی جدوجہد کو جاری رکھا جائے گا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 16 فروری 2026

اسعد بدایونی

بھاگلپور: انجمن باغ و بہار، بھاگل پور کے زیر اہتمام نوشین جہاں کی رہائش گاہ پر شاعر جوش ایاغ کی صدارت

میں اسعد بدایونی کے یوم پیدائش پر ایک ادبی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقع پر انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر محمد پرویز نے اسعد بدایونی کے حیات و کارنامے پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اسعد بدایونی جدید اردو شاعری کا ایک اہم نام ہے۔ وہ بیک وقت غزل گو، نظم نگار، صحافی، مدیر، نثر نگار اور ایک شفیق استاد تھے۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ انھوں نے لگ بھگ 22 آزاد نظمیں کہیں۔ ان کو صحافت سے بھی کافی دلچسپی تھی۔ اصل نام اسعد احمد اور تخلص اسعد بدایونی۔ 25 فروری 1958 قصبہ سہسوان، بدایوں، یوپی میں پیدا ہوئے اور وفات 5 مارچ 2003 کو ہوئی۔ 1980 میں بی اے کیا، پھر ایم اے کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ 1993 میں وہ علی گڑھ یونیورسٹی میں لیکچرر ہوئے۔ انھوں نے بدایوں سے رعنائیاں نکالا، اس کے بعد خالد بدایونی کے ساتھ ماہنامہ روشن جاری کیا اور اس کے کچھ دن کے بعد منظور ہاشمی کے ساتھ سہ ماہی دائرہ نکالا۔ ان کی تصانیف میں دھوپ کی سرحد، خیمہ خواب، جنوں کنارا، نئی پرانی غزلیں (شعری مجموعہ) داغ کے اہم تلامذہ نئی غزل نئی آوازیں وغیرہ اہم ہیں۔ نشست میں شامل محمد شاداب عالم، جوش ایاغ، محبوب عالم نے بھی اسعد بدایونی کی شاعری کے حوالے سے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 27 فروری 2026

وفیات

خواجہ سید محمد نظامی کے انتقال پر تعزیتی جلسہ

نئی دہلی: خواجہ سید محمد نظامی کے حادثاتی انتقال سے حلقہ نظامیہ نیازمندان خواجہ حسن ثانی نظامی اور پیر

بھائیوں کو شدید صدمہ پہنچا ہے اور مرحوم کے اہل خانہ کو اس غم سے نکلنے میں کافی وقت لگے گا۔ سید محمد نظامی خواجہ حسن نظامی کے چشم وچراغ تھے۔ خواجہ حسن ثانی نظامی نے اپنے بھتیجے سید محمد نظامی کو اپنا جانشین مقرر کردیا تھا۔ سید محمد نظامی نے ماہنامہ منادی کو از سر نو جاری کیا۔ خواجہ حسن نظامی اور حسن ثانی نظامی کی تالیفات کو نہ صرف شائع کیا بلکہ اسے پیر بھائیوں اور اردو کی بستیوں تک پہنچایا۔ غالب اکیڈمی میں ان کے انتقال پر ایک تعزیتی جلسے کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر ان کے برادر نسبتی سید عبدالرب نے تعزیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ سید محمد نظامی نے بہت کم وقت میں پروگراموں کے انعقاد کا ہنر سیکھ لیا۔ ان کے جانے سے ہمارا خاندان صدمے میں ہے۔ مرحوم کے ماموں ڈاکٹر محمد علی نظامی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ خواجہ حسن ثانی کے انتقال کے بعد سید محمد نظامی نے بہت جلد انتظام و انصرام سیکھ لیا۔ خواجہ حسن نظامی میموریل سوسائٹی کے صدر پروفیسر اختر الواسع نے تعزیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ موت برحق ہے اس پر کسی کا زور نہیں ہے۔ وہ انسان دوست تھے۔ انھوں نے اپنے دادا اور تایا کی روایت کو آگے بڑھایا۔ پروفیسر معظم الدین نے اظہار تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ ان کا انتقال سانحہ عظیم ہے۔ عرس کے موقعے پر وہ کوئی نہ کوئی کتاب شائع کرکے اجرا کرتے تھے۔ کچھ روز پہلے فیضان فخریہ کا اجرا ہوا تھا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر سید فاروق نے تعزیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ خواجہ سید محمد نظامی کے گھرانے سے میرے دیرینہ مراسم ہیں۔ وہ خوش خلق اور نیک صفات کے حامل تھے۔ ڈاکٹر جی آر کنول نے تعزیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ جلسے میں مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے سید حسن مجتبیٰ، ان کے عزیز و اقارب اور درگاہ حضرت نظام الدین اولیا کے سجادگان بڑی تعداد میں موجود تھے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 15 فروری 2026

پروفیسر کمال الدین کا انتقال

دربھنگہ: منفرد لب ولہجہ کے شاعر اور للت نارائن متھلا یونیورسٹی شعبہ اردو کے فاؤنڈر، سابق صدر شعبہ

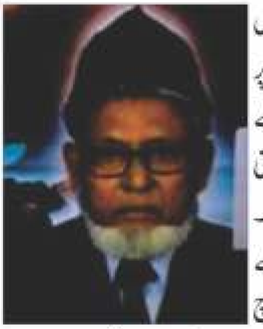

پروفیسر ایم کمال الدین کے انتقال پر متھلا یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں تعزیتی نشست منعقد ہوا۔ جس میں شعبہ کے اساتذہ کرام، ریسرچ اسکالر و طلبا شامل ہوئے۔ نشست کی صدارت صدر شعبہ اردو پروفیسر افتخار احمد نے کی۔ تعزیتی نشست سے خطاب کرتے ہوئے سابق صدر شعبہ پروفیسر آفتاب اشرف نے کہا کہ وہ میرے مخلص استاد تھے، زمانہ طالب علمی سے لے کر آخر دنوں تک ان کی محبتیں ملتی رہی، ان کا طریقہ درس نہایت دلچسپ اور بامعنی ہوتا تھا۔ اللہ نے انھیں کئی خوبیوں سے نوازا تھا۔ شعبہ کے استاذ ڈاکٹر محمد مطیع الرحمٰن نے کہا کہ پروفیسر ایم کمال الدین نہایت خلیق اور ملن سار تھے۔ طلبا کے ساتھ ہمیشہ مشفقانہ معاملہ فرماتے، ان کی اہم کتابوں میں ریزہ خیال (انشائیہ کا مجموعہ)، بیسویں صدی میں اردو قصیدہ نگاری، قصیدے کا فن اور اردو قصیدہ نگاری، تنقید کی زبان، چاندنی دھوپ کی (خودنوشت)، قصیدہ نگاران بہار اور شعور لاشعور (مجموعہ غزلیات و منظومات) وغیرہ شامل ہیں۔ شعبہ کی استاذ ڈاکٹر ناصرین ثریا نے تعزیتی بیان میں پروفیسر ایم کمال الدین کو اردو ادب کا درخشاں ستارہ بتاتے ہوئے کہا کہ ان کا انتقال اردو دنیا کے لیے بڑا حادثہ ہے۔ صدارتی خطاب میں صدر شعبہ پروفیسر افتخار احمد نے کہا کہ پروفیسر ایم کمال الدین اردو ادب

کے شہسوار تھے۔ متھلا یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے قیام کو لے کر ان کی کوششیں آب زر سے لکھی جائیں گی۔ نشست کا اختتام ڈاکٹر مطیع الرحمٰن کے دعائیہ کلمات پر ہوا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 24 فروری 2026

ماہر تعلیم احمد رشید شیروانی کا انتقال

نئی دہلی: معروف ماہر تعلیم اور بھارت سیوا ٹرسٹ کے مینجنگ ٹرسٹی احمد رشید شیروانی کا حیدرآباد میں انتقال

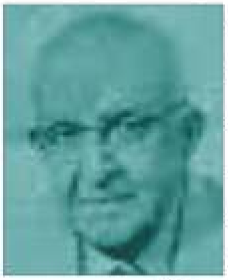

ہوگیا، ان کی عمر 93 سال تھی۔ یہ اطلاع بھارت سیوا ٹرسٹ کے سکریٹری انوار اللہ نے دی۔ 15 سال قبل مرحوم ڈی ایل ایف قطب انکلیو، گروگرام سے حیدرآباد شفٹ کر گئے تھے۔ مرحوم نے پسماندگان میں بیوہ نصرت شیروانی، ایک بیٹا تصدق شیروانی، بیٹیاں آمنہ اور آسیہ شیروانی چھوڑے ہیں۔ شیروانی صاحب جوانی کے دنوں سے ہی مسلم بچوں کی تعلیم کے حوالے سے آخر دم تک اسی کام میں لگے رہے۔ اس کے لیے اتر پردیش، بہار، مغربی بنگال وغیرہ سے مسلم اسکولوں اور کالجوں سے دسویں اور بارہویں کلاسوں کے رزلٹ منگواتے، ان کا سال بہ سال تجزیہ کرتے اور پرنسپلوں کو خط کے ذریعے بتاتے کہ رزلٹ میں کہاں کہاں بہتری ہوئی اور کہاں اس کی گنجائش ہے۔ ٹرسٹ کی جانب سے ہونہار طلبہ وطالبات کو انعام اور مخلص ٹیچرز کو ایوارڈ بھی بھیجے جاتے تھے۔ دہلی میں قیام کے دوران شیروانی صاحب مشاورت (سید شہاب الدین) کے ٹریزرار بھی رہے تھے۔ ان کے انتقال سے علم دوست حلقوں میں رنج وغم کا ماحول ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 فروری 2026

ماہر سماجیات پروفیسر ٹی کے امن کا انتقال

نئی دہلی: ملک کے ممتاز ماہر سماجیات ٹی کے امن کا جمعرات کے روز ہریانہ کے گروگرام میں اپنی رہائش گاہ

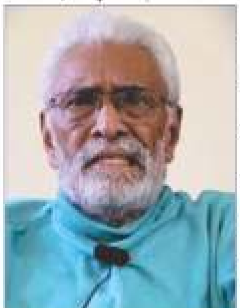

پر انتقال ہوگیا۔ کیرالہ کے الاپورا میں پیدا ہونے والے ٹی کے امن طویل عرصے تک جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں پروفیسر رہے۔ تعلیم اور دیگر شعبوں میں نمایاں خدمات کے اعتراف میں انھیں 2008 میں پدم بھوشن سے نوازا گیا تھا۔ وہ انٹرنیشنل سوشیالوجیکل ایسوسی ایشن اور انڈین سوشیالوجیکل سوسائٹی کے صدر بھی رہے۔ انھوں نے 1965 میں پونا یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی مکمل کی اور 1964 سے 1971 کے دوران دہلی یونیورسٹی کے دہلی اسکول آف سوشل ورک میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ جے این یو میں ان کی مدت ملازمت 1971 سے 2002 تک رہی بعد ازاں وہ وہاں پروفیسر ایمیریٹس بھی مقرر ہوئے۔ وہ ہندستان کی مسلم کمیونٹی کی سماجی اقتصادی اور تعلیمی حیثیت کا مطالعہ کرنے کے لیے وزیر اعظم کی اعلیٰ سطحی کمیٹی کے رکن تھے۔ انھوں نے غیر روایتی سیکورٹی، پر فورڈ فاؤنڈیشن کی چیئر سنبھالی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 27 فروری 2026

ممتاز فکشن نگار جیلانی بانو کا انتقال

نئی دہلی: اردو ادب کی ممتاز افسانہ نگار اور ناول نگار جیلانی بانو کے انتقال کی خبر نے ادبی حلقوں کو سوگوار

کر دیا ہے۔ اردو کے عالمی شہرت یافتہ ادارے غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے تعزیتی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا جیلانی بانو اردو فکشن کی ان نمایاں شخصیات میں شمار ہوتی تھیں جنھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے سماجی مسائل، عورت کے مقام، طبقاتی ناہمواری اور انسانی جذبات کو نہایت موثر انداز میں پیش کیا۔ جیلانی بانو کی ادبی خدمات کئی دہائیوں پر محیط ہیں۔ ان کے افسانے اور ناول اردو ادب میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان کا جانا پوری اردو دنیا کے لیے شدید صدمے کا باعث ہے۔ میں اپنی اور ادارے کی جانب سے ان کے تمام لواحقین کی خدمت میں تعزیت پیش کرتا ہوں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ جیلانی بانو اردو کی صاحب اسلوب ادیبہ تھیں ان کی معروف تصانیف میں ناول 'ایوان غزل' کو خاص شہرت حاصل ہوئی، جسے ادبی حلقوں میں بے حد سراہا گیا۔ انھیں مختلف اعزازت سے بھی نوازا گیا، جن میں حکومت ہند کی جانب سے دیا جانے والا باوقار اعزاز پدم شری بھی شامل ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 4 مارچ 2026

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

جن کتابوں نے متاثر کیا

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن ودل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت ومعنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبان علم وہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔
صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی ومعروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

ویر ساورکر اور تقسیم ہند کا المیہ

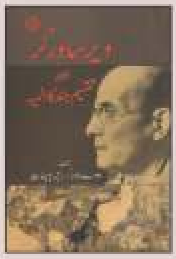

تالیف: اودے ماہورکر، چرایو پنڈت

مترجم: پروفیسر مظہر آصف، ڈاکٹر مسعود عالم

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 385+xxxviii

قیمت: 240 روپے

ہندوستانی مسلمان: اتحاد کی بنیاد حب الوطنی

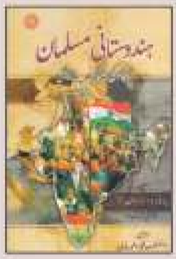

مرتبین: پروفیسر (ڈاکٹر) شاہد اختر

ڈاکٹر کیشو پٹیل

مترجمین: ڈاکٹر نصیب علی، محمد عارف

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 211+xl، قیمت: 150 روپے

کلیات سعادت حسن منٹو (جلد دوم)

تحقیق، تدوین و ترتیب: پروفیسر شمس الحق عثمانی

تیسرا ایڈیشن: 2025

صفحات 23+576

قیمت: 305 روپے

ٹیگور بتیسی (ٹیگور کے بتیس افسانوں کا انتخاب)

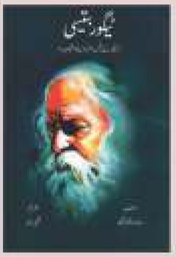

مصنف: رابندر ناتھ ٹیگور، مترجم: شبیر احمد

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 65+510

قیمت: 300 روپے

مرزا غالب: ایک سوانحی منظر نامہ

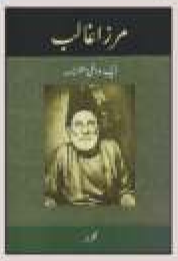

مصنف: گلزار

دوسرا ایڈیشن: 2025

صفحات: 23+247

قیمت: 160 روپے

نقوش کلام (سوانح حیات ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام)

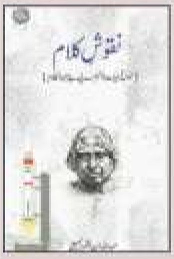

مصنف: عبداللہ ابن القمر الحسینی

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 20+460

قیمت: 255 روپے

درد: علامت اور علاج

مصنف: ابوسعدی خالد جاوید

تیسرا ایڈیشن: 2025

صفحات: 200

قیمت: 130 روپے

انسانی دماغ: کمپیوٹر اور تعلیم

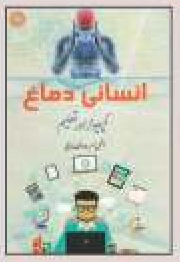

مولف: انس مسرور انصاری

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 100

قیمت: 35 روپے

شعبہ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, अप्रैल–2026, वर्ष:28, अंक:04
URDU DUNIYA Monthly, April-2026, Vol.28, Issue:04
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication: 24/03/2026
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages: 100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Md Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Salasar Imaging Systems, A-97, Sector-58 Noida-201301(UP)
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI, DELHI PSO, DELHI RMS, DELHI-6